اُردو

شیرازہ

گوشہ غلام محمد نور محمد تاجرانِ کتب

جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ کلچر اینڈ لینگویجز، سرینگر

ماہنامہ

شیرازہ

سری نگر، کشمیر

جلد ۵۷ | گوشۂ غلام محمد نور محمد تاجرانِ کتب | شمارہ: ۷-۹

جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز

ناشر: سیکریٹری، جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز

کمپیوٹر کمپوزنگ/ سرورق:......شفیق احمد

سال اشاعت:......جولائی تا ستمبر ۲۰۱۹ء

ISSN نمبر: 2277-9833

قیمت: 100 روپئے

''شیرازہ'' میں جو مضامین اور تخلیقات شائع ہوتی ہیں اُن میں ظاہر کی گئی آراء سے اکیڈیمی کا کلاً یا جزواً اتفاق ضروری نہیں۔

(ادارہ)

☆......خط وکتابت کا پتہ:

مدیر ''شیرازہ'' اُردو

جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز

e-mail: salimsalik2012@gmail.com

Mob No:- 9419711330 - 9419072288

فہرست

حرفِ آغاز

زبان وادب کی خدمت بیدار اذہان کا ہمیشہ سے شیوہ رہا ہے۔ کسی زبان کو جس قدر مفکر اور دانشور نصیب ہوتے ہیں اُسی قدر وہ آگے بڑھتی رہتی ہے اور اس کی مقبولیت میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ انیسویں صدی کے آخر میں طباعتی شعبے میں انقلاب برپا ہوگیا۔ مشینی کاغذ کی دستیابی اور چھپائی سے پورے عالم میں علم وادب کے نئے اُفق معرضِ وجود میں آگئے۔ شمالی ہندوستان میں اس سلسلے میں جس نے سب سے پہلے جرأتِ رندانہ کا مظاہرہ کیا وہ منشی نول کشور تھے جن کی کوششوں کی بدولت کتنے ہی علمی اور ادبی کارناموں کو دوام حاصل ہوا۔ کشمیر میں جب طباعت کے حوالے سے بات کی جائے تو سب سے پہلے جو نام برجستہ زبان پر آجاتا ہے وہ غلام محمد نور محمد تاجرانِ کتب کا ہے۔ انتہائی کٹھن، صبر آزما اور زمانے کے سرد وگرم کے باوجود طباعت واشاعت کی یہ ایک ایسی تحریک تھی جس نے آگے چل کر کافی وسعت اختیار کی۔ ہمارے کتنے ہی علمی اور ادبی خزینے طباعت کے اُس وقت کے جدید تقاضوں سے ہم آہنگ ہونے کی بنا پر عام لوگوں کو دستیاب ہوئے اور یوں وقت کی گرد کے نیچے ہمیشہ کے لئے گمنامی کی نذر ہوجانے سے بچ گئے۔ ہمارے سرکردہ سخن ور جیسے رسول میر، محمود گامی، عبدالاحد آزادؔ، مہجورؔ، عبدالاحد زرگر وغیرہ کے کلام کو زیورِ طباعت سے آراستہ کرنے کی شروعات اِسی ادارے نے کی جس کے روحِ رواں نور محمد تھے۔ انہوں نے نہ صرف کتابوں کو زیورِ طباعت سے آراستہ کرایا بلکہ اپنا ایک چھاپ خانہ بھی قائم کیا۔ پڑھنے والوں کو کتابیں مہیا کرائیں۔ اتنا ہی نہیں

بلکہ اپنی دکان واقع مہاراج گنج کی اوپری منزل کو مطالعاتی مرکز میں تبدیل کیا جہاں وقت کے سرکردہ عالم، فاضل، سخن ور علم وادب کی ترویج پر خیالات کا تبادلہ کرتے تھے۔ نور محمد ایسی دیدہ ور شخصیت کے مالک تھے جنہوں نے ہمارے علم وادب کے کتنے ہی خزینوں کو محفوظ کرلیا۔ اُن کارناموں کو اُجاگر کرنا وقت کی ایک اہم ضرورت ہے۔ حق تو یہ ہے کہ خواجہ نور محمد پر اس سے پہلے بھی بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ ان مضامین کو یکجا کرنے اور بعض نئے مضامین کی شیرازہ بندی کر کے نذر قارئین کرتے ہوئے ہمیں بے انتہا مسرّت ہورہی ہے اور اُمید ہے کہ اس سلسلے کو مزید آگے بڑھایا جائے گا۔

............OO............

نندلال کول طالبؔ صاحب فارسی اور اردو کے ایک مسلم الثبوت اُستاد تھے۔ آج کی نئی پود اُن کے کارناموں سے کچھ زیادہ واقف نہیں کیوں کہ اس سلسلے میں کچھ زیادہ مواد دستیاب نہیں ہے اس کمی کا ازالہ کرنے کے لئے ہم نے ''پیش رو'' کے نام سے ایک نیا سلسلہ شروع کیا ہے تاکہ ہمارے نوجوان سکالرز اس کوشش سے خاطر خواہ فائدہ اُٹھاسکیں۔ اس کی ایک جھلک ہمارے محترم قارئین کو ''سرودِ رفتہ'' اور ''میرا تخلیقی سفر'' میں بھی دیکھنے کو ملے گی جو کہ اس شمارے کی زینت ہیں۔

زیرِ نظر شمارے میں مکھن لال پنڈتا کا ''سفرنامہ کینیڈا'' بھی شامل کیا گیا ہے۔ گزشتہ کچھ عرصے سے نیٹ کلچر کے باعث سفرنامے لکھنے کی روایت کچھ کمزور سی پڑگئی ہے۔ اس اہم ادبی صنف کی طرف اگر خاطر خواہ توجہ نہیں دی گئی تو یہ بھولی بسری یاد بن کر رہ جائے گی اس بارے میں ہم سبھی کو غور وفکر کرنے کی ضرورت ہے۔

شمارے میں موقع محل کے اعتبار سے بعض دیگر مضامین، منظومات، افسانے، ڈرامہ اور تبصرہ کتب شامل کئے گئے ہیں۔ اُمید ہے کہ یہ سب قارئین کی پسندیدگی کا درجہ حاصل کرلیں گی۔ اس سلسلے میں ہمیں آپ کی آرا کا انتظار رہے گا۔

محمد اشرف ٹاک

مضامین

ظفر محمد اقبال ......لکھے

نور محمد......ایک تعارف

محمد دین فوق اپنی کتاب "تاریخِ اقوامِ کشمیر" میں رقمطراز ہیں کہ

"غلام محمد کا خاندان کا کہ پورہ پلوامہ میں تھا اور غلام محمد صاحب اصل میں وہیں کے باشندے تھے وہاں سے پھر ہجرت کر کے مستقل طور سرینگر میں قیام پذیر رہے۔"

غلام محمد بٹ پاندان نوہٹہ..............وفات ۱۹۵۸ء بانی کتب خانہ

فرزندان غلام محمد تاجر کتب:۔

نور محمد، غلام رسول، غلام حسن، غلام جیلانی، محمد حسین، بشیر احمد، عبدالمجید اور ایک دختر

نور محمد بن غلام محمد

- ......۱۹۰۵ء میں شہر خاص کے محلّہ صراف کدل میں پیدا ہوئے۔
- ......۱۹۱۷ء میں مڈل پاس کر کے اپنے والد کے ساتھ کتابوں کی تجارت شروع کی۔
- ......۱۹۲۲ء میں کشمیر کے نعت گو شعرا کی مکمل کتاب "گلشنِ نعت" صابر الیکٹرک پریس لاہور سے چھپوا کر شائع کر کے اپنی اشاعت کا آغاز کیا۔

▸▸ ......۱۹۲۷ء میں محلّہ صراف کدل سے پاندان نوہٹہ ترک سکونت اختیار کی۔

▸▸ ......۱۹۳۳ء میں ایک چھوٹی سی کتاب ''ترانۂ مسلم''، مرتب کی۔ یہ کتاب نظموں پر مشتمل تھی۔

▸▸ ......۱۹۳۰ء تا ۱۹۴۰ء تک ''غلام محمد نور محمد تاجرانِ کتب''، کشمیر کا بڑا اشاعتی و تجارتی ادارہ تصور کیا جاتا تھا۔ اس کی چار شاخیں لال چوک میں تھیں جو آج کل دوسرے ناموں سے جانی جاتی ہیں۔

▸▸ ......۱۹۴۷ء میں تقسیمِ ہند تک نور محمد زیادہ تر کتابیں لاہور و لکھنؤ سے چھاپ کرلایا کرتے تھے۔

▸▸ ......۱۹۴۰ء اور ۱۹۵۰ء کے درمیان اسلامی جمہوریہ ایران سے ایک ادبی ڈیلی گیشن واردِ کشمیر ہوا جس کی قیادت ایرانی سفیر کر رہے تھے۔ انہوں نے یہاں آکر بہت سی شخصیات کے علاوہ نور محمد سے بھی ملاقات کی۔ نور محمد نے ڈیلی گیشن کو یہاں کی ادبی، تمدنی، سیاسی، جغرافیائی تاریخ بہ زبانِ پہلوی سنائی جس سے وہ بہت ہی متاثر ہوئے۔

▸▸ ......۱۹۵۱ء میں اپنی مرتب کردہ تاریخِ کشمیر کی روزانہ ڈائری کا پہلا حصہ شائع کیا۔

▸▸ ......۱۹۵۴ء میں یہ اشاعتی و تجارتی ادارہ تقسیم ہوا۔

▸▸ ......۱۹۵۶ء میں اپنا چھاپ خانہ قائم کیا یہ کسی کشمیری مسلمان کا پہلا چھاپ خانہ تھا جو ''کوہِ نور پریس'' کوکر بازار اور ''نورِ محمدی پریس'' مولانا آزاد روڑ نام سے مشہور تھا۔

▸▸ ......۱۹۶۵ء میں ۵ر مارچ کو انتقال کر گئے۔ مرحوم کی نماز جنازہ تاریخی جامع مسجد میں ادا کرنے کے بعد آبائی مقبرہ پیر حاجی محمد صاحب صراف کدل میں سپرد خاک کیا گیا۔

اولاد:۔ تین بیٹے، غلام حمزہ، غلام مرتضیٰ، محمد اقبال

پانچ بیٹیاں جن میں اب تین بقید حیات ہیں۔

............OO............

کشمیری:......مرزا عارفؔ بیگ

ترجمہ:......اسداللہ اسدؔ

ذکرِ نور محمد

رات کے نو بجے دروازے پر دستک ہوئی۔

''جناب! کیا آپ گھر پر ہیں؟''

مجھے نور محمد صاحب کی آواز سنائی دی۔

''تشریف لائیں''

اتنے میں دو اشخاص، نور محمد اور عبدالاحد آزادؔ اندر آئے۔ میرا ہاتھ تھالی ہی میں اَٹک کے رہ گیا۔

''آزاد'' میں حیرت میں پڑ گیا۔ جاڑے کی رات، سردی، اندھیاری گلی! پہلی ملاقات میں اُٹھ کھڑا ہوا اور آزادؔ کے ساتھ اِس طرح بغل گیر ہُوا کہ گویا ہم پہلے ہی پکّے دوست ہوتے ہوئے بعدِ مدتِ مدید آپس میں مل رہے تھے!

نور محمد ہنستے ہوئے بول اُٹھا ''جوڑی کا ملاپ ہُوا تو درمیانہ دار پرایا بن گیا''۔ آزادؔ مثل سروآزاد گویا ہُوا کہ اس وقت بس اِتنا کافی، کل رات ملاقات ہوگی۔ شاید یہ ۱۹۴۵ء کے اختتامی ایاّم تھے اور میں مقام سنگین کے ایک چھوٹے مکان میں بحیثیت ایک کرایہ دار بُود و باش کرتا

تھا۔ آزادؔ (اُن دِنوں شعرائے کشمیر کے کارناموں) اور حالاتِ زندگی کی جمع آوری میں لگے تھے اور میں ہر اتوار کو یہیں مشاعرہ کا انعقاد کرتا تھا۔ آزادؔ نے اخباروں میں میرا نام پڑھا تھا اور میری نظروں سے بھی اُس کی دو آنے مقرر کردہ قیمت والی کتاب کی وساطت سے اُس کا کلام گزرا تھا اور مجھے اس کی تصویری مُلاقات بھی نصیب ہو چکی تھی۔

نور محمد کُتب فروش اِس دِن مجھے کسی اور ہی صورت میں جلوہ افروز دِکھائی دیئے۔ کہاں وہ دِن بھر قلم کاغذ بیچنے کا دھندا اور کہاں آج کل شعرا کو آپس میں مِلانے کا کام؟ میں نے اِس دِن نور محمد کے کردار کے اِس پہلو کو کچھ اہمیت نہ دی۔ میں اس کو محض ایک چھوٹا سا کُتب فروش گردانتا تھا جو شعرا کے کلام و پیام کے کاروبار میں جٹ گیا تھا اور جو محمود گامیؔ کی یوسف زلیخا اور رُسل میرؔ کی محبوبہ (کونگ) کو کاغذی پیکروں کی زینت دے کر بازار میں بیچا کرتا تھا۔

ادیبوں اور شاعروں کی تصنیفات مدِ نظر رکھتے ہوئے قلم کو جنبش دینا آسان ہے مگر نور محمد جیسی شخصیت پر کچھ قلم بند کرنا اس وجہ سے دشوار ہے کہ اس کی بیاض کے اوراق بکھرے پڑے ہوئے ہیں جن کی ورق گردانی کرنا اور ان کو ترتیب دینا اُن کی جمع آوری سے بھی مشکل تر ہے۔ نور محمد کی پیدائش سے پانچ چھ سال قبل ان کے والد صاحب نے زینہ کدل میں ایک چھوٹی دکان کھولی جس میں ایرانی اور نرسل کی قلمیں، کریما، نامِ حق، تیسّر القُرآن، پارہ عم، بچوں کے قاعدے، کاغذ وغیرہ کی عام استعمال کی چیزیں سجی رہتیں۔ یہ اَغلب اُنیسویں صدی کا سنہ تھا۔ گویا نور محمد کی پیدائش سے پہلے ہی دستِ قُدرت نے اُس کے لئے ایسے کاروبار کے وسیلے کا اہتمام کر دیا تھا جو اس کی شہرت اور مالداری کا ذریعہ ثابت ہوا۔

اس کے باپ کا نام غلام محمد تھا جو ایک سادگی پسند آدمی تھا۔ آمدنی کے اندر گزارہ کرتا، نمازیں ادا کرتا اور دن بھر دکان کی زینت بنا رہتا۔ سرکار کی جانب سے سرکاری اسکول چالو ہوئے تھے اور بسکو صاحب نے بھی ایک انگریزی سکول شروع کیا تھا۔ نور محمد کو اپنے والد

نے سٹیٹ سکول میں حصولِ تعلیم کے لئے داخل کر دیا۔ جہاں دسویں درجہ تک تعلیم دی جاتی تھی۔ بارہ، تیرہ سال کی عمر میں نور محمد اپنے والد کی دکان پر اُس کا ہاتھ بٹاتا رہا۔ نویں جماعت میں پہنچ کر اُس کو دکانداری کا پورا لین دین سمجھنا پڑا کیونکہ اس کے باپ کو بڑھاپے نے نڈھال کر دیا اور آخر کار اُس کا آب و دانہ بھی ختم ہو گیا۔ جس وجہ سے نور محمد کے نازک شانوں پر دکان اور گھر کا سارا بوجھ پڑ گیا۔

نور محمد کا سر بھاری اور جسم نازک تھا، ماتھا کشادہ، آنکھیں جنگلی شیر جیسی سُرخ اور قد ٹھنگنا جس پر کھوپڑی کچھ بھاری بھرکم دِکھائی دے رہی تھی۔ سر پر قراقلی پہنتے تھے، داڑھی تراشتے تھے مگر جوں جُوں کاروبار میں ترقی ہوتی رہی، داڑھی منڈوانے اور نفیس کپڑے پہننے کی طرف میلان کم ہوتا گیا۔ اس کی نَس نَس کتابوں کے لین دین کے ساتھ محو رہتی۔ اکثر یوں کہا کرتے کہ اِس دھندے کے جال میں اِس طرح جکڑ گیا ہوں کہ اب خلاصی مشکل دِکھائی دیتی ہے۔ راتیں دکان کا لین دین دیکھنے میں گزر جاتیں۔ یوں تو صوم وصلوٰۃ کا زیادہ پابند نہ تھا مگر دین سے پوری طرح واقف تھا۔ غضب کی یاداشت کا مالک تھا اور گھنٹوں کشمیری اور فارسی زبان کے شعراء کا کلام سنانے کی صلاحیت رکھتا تھا۔

قوتِ حافظہ خداداد دین ہے اور یہ عنایت نور محمد کو بھرپور حاصل ہوئی تھی۔ کتابوں، خاص کر کشمیری کتابوں سے جس قدر بھی اُس کی دلچسپی بڑھتی گئی اُسی قدر اُس کا سینہ عِلم کا دفینہ بنتا گیا۔ کشمیر میں اس وقت تک کتابیں چھاپنے کا شوق پروان نہیں چڑھا تھا اور جو کچھ بھی شعراء نے لِکھا تھا وہ لوگوں کو ازبر تھا۔ جو کچھ بھی ساز و آہنگ پر چڑھ سکتا تھا وہ گویّوں کی نوکِ زبان پر تھا۔ اُس وقت تک جو کچھ بھی چھپ چکا تھا، یا تو نول کشور یا گلاب سنگھ نے طبع کیا تھا۔

نور محمد کو خیال آیا کہ جو بھی ادبی سرمایہ کشمیری بزرگوں کا ہے، اگر طباعت کے مرحلے سے نہ گزرے تو اُس کے ضائع ہونے کا اندیشہ ہے۔ یہ خیال اُس کے دماغ میں جاگزیں ہُوا اور اُس نے محمود گامی، رُسل میر، حبہ خاتون اور دیگر شعراء کے گیتوں کو لکھوا کر دو دو آنے والے کتابچوں

میں شائع کر دیا۔ اس کاروبار سے اُس کو کتنا منافع ملتا تھا، اُس کا اندازہ اِس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ مہجور جیسے مقبول عام شاعر کو اُس سے صرف مبلغ ایک سو روپیہ کا صِلہ مِلا تھا۔ مہجور صاحب نے پنتالیس سال شاعری کر کے اتنے ہی سرمایہ اور معاوضہ ہونے کا مجھ سے ذکر کیا ہے۔

نور محمد کو اوّل اوّل کتابوں کے کاروبار سے بہ مشکل ساگ اور بھات حاصل ہوا کرتا۔ نور محمد قریہ قریہ جا کر شاعروں کا کلام اِکٹھا کرنے لگا تھا۔ گویّں، مُغنیوں اور حافظوں کے پاس یہ شخص جاتا اور جو بھی گیت (اُن سے) سُنتا، لکھ لیتا اور شائع کرتا۔

مُجھے خود رسالہ ٔ گلریز کے سلسلے میں مختلف جگہوں پر جا کر اِس بات کا تجربہ ہوا ہے۔ شاعروں کا کلام جمع کرنے کا کام کس قدر دشوار ہے اور کس طرح گاؤں کے لوگوں نے ان ادبی شہ پاروں کے شہ کاروں کو گھاس کی چھتوں کے اندر چھپا کر محفوظ کر دیا تھا۔ چاول کے مٹکوں کے اندر رکھا ہوا ہوتا تھا اور اتنی احتیاط برتنے کے باوجود ہمارا کتنا ادبی سرمایہ ضائع ہوا ہوگا۔

مہجور اور آزاد کے مابین یہ طے پایا تھا کہ قدیم فارسی اور کشمیری شاعروں کا کلام اور ان کے حالاتِ زندگی وغیرہ کو جمع کر لینا چاہیے۔ مہجور نے خود کشمیر کے فارسی شعراء کا کلام جمع کرنے کی ذمہ داری لی تھی اور آزاد کو کشمیری شعراء کے تحقیق کی ذمہ داری سونپی تھی۔ آزاد نے اپنے ذمہ لئے ہوئے کام کو پایہ تکمیل تک پہنچایا مگر مہجور کی یہ آرزو پوری نہ ہوسکی۔ حالانکہ اُس نے سینکڑوں شعرا کے حالاتِ زندگی دریافت کر لئے تھے اور بہت سارے اشعار اُسے ازبَر تھے۔

مہجور جہاں بھی بیٹھ جاتے وہ بڑے اطمینان کے ساتھ قدیم فارسی شعراء کا ذکر کرتے۔ ادب کے پروانے مہجور کے اِرد گرد گھومتے رہتے اور سُننے والے محوِ حیرت ہو جاتے کہ اس کا سینہ کس قدر یادداشتوں کا خزینہ بنا ہوا ہے۔ میں نے اس بات کا ذکر اُس وقت کے ڈائریکٹر ایجوکیشن اسداللہ کاظمی سے کیا تھا اور ہم دونوں وزیر اعظم شیخ محمد عبداللہ صاحب سے بھی مُلاقی ہوئے تھے مگر سیاسی مشغولیات نے ہماری تجاویز کو کامیاب نہ ہونے دیا۔ میں نے ذاتی طور بھی دیگر لیڈران سے مدد حاصل کی تھی اور یہ تجویز پیش کی تھی کہ مہجور کے ساتھ ایک

مُنشی کو منسلک کیا جائے کہ وہ مہجورؔ کی باتوں کو تحریر میں لائے تا کہ ایک ادبی تاریخ تیار ہو سکے جو ایک ''Anecdotal History'' بن سکے۔ شیخ صاحب نے میرے خیال کو پسند فرمایا تھا مگر اس وقت تک اِس کی تکمیل نہ ہو سکی جب تک مہجورؔ ہم میں موجود رہے۔

نور محمد کی زندگی کا یہی پہلو اہم ہے کہ جو ملاقات اندھیری رات میں اُس نے میری اور آزادؔ کی کروائی تھی، وہ اِس بات کی واضع دلیل ہے کہ اُس کا کاروبار صرف کتابوں کا لین دین نہ تھا بلکہ وہ جنون کی حد تک اِس جذبے کے شوق میں ڈُوبا ہوا تھا۔

کتنے ہی لوگوں کا واسطہ کتابوں کی تجارت سے رہا اور آج کل بھی اِس کاروبار سے جڑے ہوئے ہیں۔ عوام الناس نے صرف نور محمد ہی کو ''کتاب'' کا خطاب دیا اور وہ نور محمد کتاب کے نام سے ہی لوگوں میں مشہور ہوئے اور اُس کے خاندان کا نام بھی کتاب ہی رہ گیا۔ اس وقت اس کے بھائیوں کے پاس بڑی بڑی کوٹھیاں ہیں اور ہر کوٹھی کے ساتھ ''کتاب'' نام منسلک ہے۔

نور محمد کتاب حقیقت میں ایک مُجسّم کتاب تھا اور یہ کتاب اُس وقت تک نور پھیلاتی رہے گی، جب تک کشمیری زبان اور کشمیری قوم زندہ ہے۔

...........OO...........
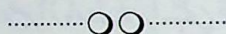
کشمیری:......رحمٰن راہیؔ

ترجمہ:......جان محمد آزادؔ

نور محمد......ہمہ جہت شخصیت کا مالک

زندگی میں کوئی غیر معمولی امتیاز حاصل کرنا اگر بڑا اپن ہوسکتا ہے تو یہ کہنے میں کوئی مبالغہ نہیں کہ مرحوم نور محمد ایک بڑے انسان تھے۔ نور محمد کی بڑائی کی روشنی میں کئی قوس وقزح لہرا رہے ہیں۔ لوگ عام طور پر مرحوم کی شخصیت کے صرف ایک پہلو کو ہی اپنی توجہ کا مرکز بناتے ہیں یعنی کشمیر میں کتابوں کی تجارت کے حوالے سے اور خاص طور پر کشمیری کتابوں کے فروغ اور پیش رفت میں اُن کی جرأت اور صبر آزما رول کو سراہنے پر ہی بس کیا جاتا ہے۔ یہ حقیقت ہر کشمیری پر واضح ہے کہ کشمیری زبان کو پروان چڑھانے اور کشمیری ادب کے فروغ میں نور محمد نے جو شاندار کارنامہ انجام دیا وہ اپنی مثال آپ ہے لیکن ان کے انتہائی اہم زاویوں کے نقوش دھندلا گئے اور انجام کار اُن کے ESSENTIAL BEING کا بنیادی اور محوری عنصر ہماری نظروں سے اوجھل ہوکر نذرِ طاقِ نسیاں ہوگیا۔ کتب فروش تو نور محمد سے پہلے بھی رہے تھے اور ان کے بعد بھی متعدد لوگوں نے یہ کاروبار اپنایا ہے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ کشمیری کتابیں شائع کرانے کی شروعات بھی نور محمد سے پہلے ہوگئیں تھیں اور ان کے بعد بھی یہ کام کسی نہ کسی طرح جاری رہا۔ مجھے اِس حقیقت کا اعتراف کرنے میں کوئی تامل نہیں کہ نور محمد نے کتابوں کی

اس تجارت میں خوب پیسہ کمایا۔ انہوں نے اتنی دولت کمائی کہ بعض لوگ آج بھی اس غلط فہمی کے شکار ہیں کہ کتب فروشی نور محمد کا مطمح نظر صرف حصولِ دولت تھا۔ مجھے اِس بات کا بھی علم ہے کہ ایک وقت ایسا بھی آیا جب نور محمد نے کشمیری مطبوعات کے بے شمار سستے ایڈیشن شائع کرائے۔ غالباً یہ سوچ کر کہ جہاں ایک طرف سستے مال سے گاہک کو ترغیب ملے گی وہاں کتاب کی پہلی جلد کا مطالعہ کرنے کے بعد منہ سے لگی ہوئی یہ کافر چھٹ نہیں پائے گی اور بے چارے قاری کے پاس دوسری جلد خریدنے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں ہوگا۔ اِس طرح قاری کی تشنہ لبی بھی برقرار رہے گی اور بیوپار کی ندیاں بھی ہولے ہولے بہتی رہیں گی۔ باثروت ہونے کے باوجود نور محمد انتہائی سادہ زندگی گزارتے تھے۔ دھان پان سے بدن پہ ایک خاص قسم کے بٹن والا کرتہ زیب تن کئے رہتے تھے۔ ایک عام روایتی کپڑے کا کالروالا یا پھر بند کالا کوٹ پہنے رہتے تھے، عام طور پر تنگ مہریوں والا پجامہ پہنتے تھے جو ٹخنوں سے اوپر رہتا تھا۔ عام معیار کی قراقلی ٹوپی پہنے اور پاؤں میں چھوٹا سا بغیر پالش کے چمڑے یا ربر یا پھر گرگابی جوتا اُن کی نمایاں شناخت تھی۔ تانگہ ملا تو ٹھیک، ریزگاری سے کھنکتی ہوئی جیب میں سے اُسے بھی دو ایک سکے تھما دیئے، نہیں ملا تو پیدل ہی منزل کی جانب لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے ''زینہ گیر بازار سرینگر'' چل دیئے۔

جن ایام کی میں بات کر رہا ہوں اُن دنوں دکان سے کتابیں کرایہ پر بھی ملا کرتی تھیں۔ ایک دن کے لئے کرایہ دو پیسے لیا جاتا تھا۔ میں نے جو پہلی کتاب اس دکان سے کرایہ پہ لی تھی وہ تیرتھ رام فیروز پوری کا کوئی جاسوسی ناول تھا۔ اس کتاب کا مطالعہ کرنے کے بعد جب میں اسے واپس دینے آیا تو دُکان میں خود نور محمد بیٹھے تھے۔ انہوں نے کتاب لیتے ہوئے میرے سرتاپا پر ایک بھرپور نگاہ ڈالی اور پوچھا ''کیوں میاں! پڑھ لی کتاب؟'' میں نے کہا ''جی ہاں پڑھ لی''۔ اس پر پوچھا ''کیا پایا اس میں؟'' میں نے اپنی دانست میں داستان کا خلاصہ پیش کرنا شروع کر دیا تو انہوں نے ٹوکتے ہوئے پوچھا۔ ''نہیں صاحب زادے! تم

مجھے صرف اتنا بتاؤ کہ اس کتاب کے مصنف کا مطمحِ نظر کیا ہے؟'' میں لاجواب ہو کے رہ گیا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے مجھے پہلی بار کسی کتاب میں ڈوب کر مطالعہ کرنے کا احساس دلایا گیا ہو۔ جیسے درسی کتابوں کے بغیر کچھ ایسی کتابیں ہوں جن کا انسان کی زندگی سے نہایت سنجیدہ وابستگی ممکن ہو۔ یہ لمحہ بڑا قیمتی تھا، بڑا جاودانی تھا۔ کیوں کہ اسی لمحے میرے وجود کی کایا پلٹ ہوگئی۔ یہ ایک ٹرننگ پوائنٹ تھا اور ٹھیک اسی لمحے، میں نے مرحوم نور محمد کو من ہی من میں اپنا راہبر تسلیم کرلیا۔ میں نئی نئی کتابیں کرایہ پہ لیتا رہا اور وہ مجھ سے نت نئے سوالات پوچھتے رہے اور اس طرح انہوں نے مجھے غیر شعوری طور کتابوں کا ایک زبردست عاشق بنا دیا۔ اب کتابیں ہی میری ہم کلام اور واحد دوست تھیں۔ اُن کے ساتھ مختلف موضوعات پر لذّت کلام کا سلسلہ چلتا رہا اور مجھ پر متعدد اسرار و رموز کی دنیا روشن ہوتی گئی۔ انہیں سفر سے زیادہ ٹھہراؤ میں قرار آتا تھا۔ شور شرابے سے زیادہ سرگوشیوں کے متمنی تھے۔ گھر سے زیادہ دُکان پر ہی آرام و تسکین محسوس کرتے۔ خواتین سے زیادہ مرد ہی موضوعِ سخن بنتے۔ مرغن غذاؤں سے زیادہ مقامی سادہ روٹی اور قہوے (جس میں شونٹھ اور زیادہ چینی ہوتی) کے شوقین۔ یوں دیکھیں تو ظاہری طور پر اُن کے خدوخال میں بھی کوئی غیر معمولی تیکھا پن نہیں تھا۔ بجز اس کے کہ اُن کا رنگ گورا اور آنکھیں نیلی تھیں۔ اُن کے گورے پن سے میں کبھی مرعوب یا مغلوب نہیں ہوسکا۔ ہاں اُن کی آنکھوں میں مجھے ادراک کی ہزاروں چنگاریاں نظر آتی تھیں۔ تب تو نور محمد بقیدِ حیات تھے، جب میں اس نتیجے پر پہنچ گیا تھا کہ غیر معمولی طور چمکتی ہوئی نیلی آنکھوں سے پھوٹتی ان چنگاریوں کی بہار کا نام ہی نور محمد ہے۔ یہ چنگاریاں ہی دراصل اُن کی بے قرار روح اور بے پناہ فہم و فراست کی ترجمان تھیں۔

میں نے پہلی بار نور محمد کو اس زمانے میں دیکھا تھا جب میں نویں جماعت میں زیرِ تعلیم تھا۔ یہ ۱۹۴۰ء کی بات ہے۔ جاڑے کے ایام تھے۔ نور محمد کی نیلی آنکھوں میں لہراتی ہوئی چنگاریوں کی بہار نے پہلی ہی ملاقات میں میرے ناآشنا ڈھانچے پہ سحر کر دیا، اس میں آگ لگادی اور میرے دل کے آئینہ خانے کو جیسے جگمگا دیا۔ نور محمد کی کتابوں کی دکان بڈشاہ ڈمٹ

(گنبد) کے اُس پار آج بھی اپنی جگہ موجود ہے۔ غالباً دکان پہ بورڈ بھی وہی ہے جس پر جلی حروف میں خوش خط لکھا ہوا ہے۔ ''غلام محمد نور محمد تاجرانِ کتب''۔

نور محمد کے ساتھ ادبی محفلوں میں مجھے ان کی بے پناہ فہم و فراست کا احساس ہونے لگا اور آج جب میں اپنے ماضی میں جھانک کر گزرے ہوئے ایام کا جائزہ لیتا ہوں تو میرا یہ یقین اور پختہ ہونے لگتا ہے کہ نور محمد کی شخصیت کا سب سے انمول اور دل آویز پہلو تھا اُن کی یہ عقل و دانش تھی اور میری دانست میں اُن کے وجود اور اُن کی کارکردگی کے دیگر سارے نمایاں خدوخال کا سرچشمہ بھی اِن کا یہی فہم و ادراک تھا۔

نور محمد جدید کشمیر میں نشاۃ الثانیہ کے ایک اہم ترجمان تھے۔ جس طرح یورپ میں اس تحریک کے تحت ہر چیز پہ ایک نئے انداز سے نِگاہ ڈالی جاتی تھی۔ ہر شے کو شک و شبہات سے دیکھا جاتا تھا۔ اسی طرح مرحوم نور محمد کا مزاج بھی فطری طور ہر چیز کی حقیقت جاننے پرکھنے کا مشتاق تھا اور اپنے مزاج کی اِسی افتاد کی وجہ سے انہیں کسی جگہ بھی قرار نہیں آتا تھا۔ ذہنی طور ان کی حالت کم و بیش ایسی ہی تھی جیسی کہ مرزا غالبؔ نے اس شعر میں بیان کی ہے۔

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک راہ رو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

نور محمد سے شرفِ تلمذ سے پہلے میں ایک عام کشمیری لڑکا تھا جس کے ذہن کی دنیا موجِ بلا کے تھپیڑوں سے قطعی نا آشنا تھی مگر اُن سے ملنے کے بعد میرے ہوش و خرد جس زبردست طغیانی میں مستغرق ہوگئے ان کی گرہیں کھولنے اور ان میں ڈوبنے اُبھرنے کا عمل آج تک جاری ہے۔

مجھے مرحوم نور محمد کے ساتھ کم از کم پندرہ برس کی رفاقت کی سعادت نصیب رہی۔ قربتیں اتنی بڑھیں کہ کبھی کبھار ہی ایسا کوئی دن آتا تھا جب مجھے لُطف صحبت حاصل نہ ہوتا۔ پہلے پہل تو میں ہی ان سے ملنے کے لئے بے قرار رہتا تھا لیکن بعد میں یہ آگ دونوں طرف

لگ گئی اور پھر انہیں بھی میرے بغیر چین نہیں آتا تھا۔ اگر کبھی اتفاق سے دو ایک دن تک نہیں مل پاتے تو وہ دکان کو چھوڑ چھاڑ کر میرے گھر تک آجاتے اور مجھے ڈھونڈنے کے بعد خود اپنے ہمراہ لے جاتے۔ مہاراج گنج کی دکان کے دو حصے تھے۔ ایک حصہ کُھلا رہتا جس کے کاونٹر کے ایک گوشے میں معمولی سے گدّی پر خود مرحوم نور محمد کتابیں، کاغذ، قلم وغیرہ بیچتے اور اُن کی غیر حاضری میں مرحوم کے برادر حسہ لالہ کاروبار سنبھالتے۔ جوں ہی میں پہنچ جاتا تھا تو نور محمد کا کاروباری ہمزاد عنقا ہو جاتا اور اُن کے اندرون سے دانشور نور محمد نکل کر بے ساختہ طور بڑے لطف، بڑی محنت اور بڑے پتے کی باتیں کرنے لگتا۔ بات کہیں سے شروع ہو جاتی۔ اظہارِ خیال کا سلسلہ چل نکلتا اور مختلف قسم کی آرا میں ٹکراو کی نوبت آجاتی تو نور محمد اپنی مخصوص جگہ حسہ لالہ کے لئے خالی چھوڑ کر دُکان کے اُس حصے میں چلے آتے جو باہر سے بند رہتا تھا اور پھر میرے ساتھ سیاسی، ادبی، سماجی حتیٰ کہ گھریلو اور نہایت نجی معاملات پر بھی اظہارِ خیال کرتے۔ اگر سچی بات تلخ محسوس نہ ہو تو مجھے اس امر کا بھی اعتراف ہے کہ نور محمد کا اس طرح دکان چھوڑ کر بحث و مباحثوں میں اُلجھنا حسہ لالہ کو پسند نہیں تھا اور میں کبھی کبھی اُن کے ماتھے پر شکن دیکھ کر ڈر جاتا تھا۔

ایک روز میں پلیڈیم سینما میں آخری شو دیکھنے گیا تھا۔ واپسی پر ٹانگہ نہ ملنے کی وجہ سے میں زینہ کدل بہت دیر سے پہنچا۔ اکثر دکاندار اپنی دکانیں بند کر چکے تھے۔ رات کے سناٹے میں جب نور محمد کی دکان کے سامنے پہنچا تو میرے دِل میں نامعلوم وسوسے پیدا ہونے لگے۔ غالباً کوئی چور نور محمد کی دکان لوٹنے کی ٹوہ میں ہے۔ نزدیک جانے پر معلوم ہوا کہ یہ خود نور محمد ہیں جو دکان کا آخری تختہ بند کرنے سے پہلے کچھ آیات پڑھ رہے ہیں اور ہر آیت کے بعد دکان کے اندر اور باہر کسی روایتی مولوی کی طرح دم کر رہے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ میں ششدر رہ گیا۔ دن کے اُجالے میں جو نور محمد مذہبی اعتقادات اور مختلف قسم کے فلسفیانہ نکتوں اور باریکیوں اور سیاسی نظریات کو تشکیک اور تنقید کی کسوٹی پر پرکھتے نہیں تھکتا تھا وہی رات کے

وقت اپنی دکان کو وظائف پڑھ کر دم کیا کرتا تھا۔ آخر ایک دن میں اُن سے پوچھ ہی بیٹھا کہ حضرت یہ دوہرے معیار کا کیا مطلب ؟۔ انہوں نے پہلے تو مجھے ٹالا پھر توقف کے بعد کہنے لگے کہ حسرت موہانی اشترا کی فلسفہ کے قائل تھے۔ مگر نماز پنجگانہ ادا کرتے تھے۔ جب اِن سے اِس بارے میں استفسار کیا گیا تو انہوں نے کہا کہ نماز پڑھنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ کیونکہ مرنے کے بعد اگر پھر سے زندہ ہونا ہو تو کوئی حساب نہیں لیا جائے گا اور نہ اس بات پر افسوس ہوگا کہ خواہ مخواہ نماز کیوں پڑھی تھی۔ لیکن اس کے برعکس روزِ حساب دفترِ عمل پیش ہوا تو یہ ایک قابلِ ذکر عمل نجات کا ایک بڑا ذریعہ ہوگا۔ مجھے اُن کے اس جواز میں ایک ناخوشگوار تضاد سا محسوس ہوا۔ لیکن آج تقریباً پینتیس برس گزرنے کے بعد جب میں اس صورت حال پر غور وفکر کرتا ہوں تو میرے دل میں مرحوم کے تئیں احترام بڑھتا ہے کیونکہ آج مجھے ان باتوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے، جن کی بازیافت اُس زمانے میں نہیں ہوسکی تھی۔ یعنی یہ دوہراپن کسی مکاری یا کسی نفاق کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ یہ اُس ذہنی اور جذباتی ایمان داری کا ترجمان ہے۔

نور محمد ایک نادرِ روزگار شخصیت کے مالک تھے جو بات ذرا جوش اور اعتماد سے کہی جاتی اُسے وہ اپنی منطق اور دلائل و براہین سے بکھیر کر بے اثر کر دیتے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ان کی اِس عادت سے آشنا ہوگیا۔ چنانچہ جب کبھی میرا دل کسی موضوع کے حق میں اُن کی زوردار بحث سننے کو کرتا تو میں اُس موضوع کے خلاف بولتا اور اس طرح اُن کی گرم گفتاری سے محظوظ ہوتا اور اُن کی دانشوری سے فیض اُٹھاتا۔

نور محمد سارے شہر میں بیدار مغز اور باخبر تسلیم کئے جاتے تھے اور اُن کی دکان ایک اہم تجارتی مرکز کے علاوہ فیض وعرفان کا ایک سرچشمہ تصور کیا جاتا جہاں تشنہ لب اطراف و اکناف سے آکر جمع ہوتے تھے۔ جہاں رند اور زاہد کی ایک دوسرے سے مڑبھیڑ ہو جایا کرتی تھی، جہاں سیاست دان، ادیب، شاعر اور سازندے تک ایک ہی صف میں کھڑے نظر آتے جہاں طالبِ علم اور عالم کو یک جا ہونے کا موقع ملتا۔

غلام احمد مہجورؔ، عبد الاحد آزادؔ، صمد میر، عبد الاحد زرگر، حفیظؔ جالندھری، عبد المجید سالکؔ، مولوی عبداللہ شوپیانی، پریم ناتھ بزاز، فیض پراچا، چودھری غلام عباس، اللہ رکھا ساغرؔ، عبداللہ دلال، محمد یوسف قریشی، غلام احمد کشفی، غلام رسول نازکی اور تنہاؔ انصاری جیسے بزرگوں اور حقیقت کا عرفان رکھنے والی شخصیات سے متعارف ہونے کا شرف مجھے اسی دکان سے حاصل ہوا ہے۔

نور محمد نے طرح طرح کے شوق پال رکھے تھے اور جیسے میں پہلے تحریر کر چکا ہوں ان سب کا سرچشمہ اُن کی پیاسی اور بے قرار روح تھی۔ وہ ادب کے بھی پرستار تھے اور سیاسیات کے مطالعہ کے رسیا بھی۔ جنگ چھڑ جاتی تو وہ تمام اٹلس انہماک سے دیکھتے اور کوئی بھی ریڈیو نیوز بلٹن سنے بغیر انہیں نیند نہیں آتی تھی۔ جو بھی اخبار انہیں معیاری لگتا اُس کا مسلسل مطالعہ کرتے، جس کسی کتاب کی تعریف کے چرچے سنتے اُسے پڑھے بغیر چین نہیں آتا تھا۔ قرآنِ مجید کا بیشتر حصہ جستہ جستہ انہیں یاد تھا۔ کلاسیکل فارسی سے پوری آگہی تھی۔ ان کے بارے میں یہاں تک کہا جا سکتا ہے کہ الفاظ شناسی کے فنِ ماہر تھے۔ دراصل یہ سب کچھ عرفان اور آگہی کی اُس بے پناہ پیاس کا نتیجہ تھا جس نے نور محمد کو کتابوں کے کاروبار سے وابستہ کر دیا تھا اور اُنہیں کشمیر کا نول کشور ہی نہیں بلکہ کشمیری زبان کا ایک اہم نگہبان اور کشمیری ادب کا ایک ممتاز ترجمان بنایا تھا۔ اس امر سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ اگر نور محمد کشمیری ادب کی طباعت کے ساتھ منسلک نہ ہوتے تو اُس صورت میں کشمیری زبان کا بیشتر ادبی سرمایہ ضائع ہو جاتا اور آج جو کچھ بھی ہمارے پاس موجود ہے، وہ اس طرح شہروں اور دیہات کے اطراف واکناف میں پہنچ کر مقبول نہیں ہوا ہوتا۔ اشاعت، ترغیب اور پھیلاؤ کے جو فرائض آج کل ریڈیو، اکیڈیمی، کشمیر یونیورسٹی، اخبار و رسائل وغیرہ مجموعی طور انجام دے رہے ہیں، نور محمد کا ایک اکیلا ادارہ اُن دنوں اس سے کہیں زیادہ سرگرم عمل تھا۔

نور محمد نے ضابطوں کے تحت کوئی خاص تعلیم حاصل نہیں کی تھی مگر خداداد صلاحیتوں

اور شعوری بالیدگی کے طفیل وہ عظیم نکتہ داں کا روپ دھارن کر چکے تھے۔ مولانا آزاد کے ''الہلال'' اور علامہ مشرقی کے تذکروں کا اسلوب اور ان کی تشریح دل آویز انداز میں بیان کرتے۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہ جدید کشمیر کے ان ابتدائی دانشوروں میں سے ایک ممتاز دانشور تھے جو نیاز فتح پوری کے قائل اور حافظ شیرازی کے معتقد بھی تھے اور علامہ اقبال پر بھی دیوانہ وار فدا تھے۔ عبدالاحد آزاد کی جدت پسندی کے راز داں بھی تھے اور مہجور کے اشعار کی نزاکتوں کو سراہنے کا انداز بھی معلوم تھا۔ ایک طرف ظفر علی خان اور جوش کے فکروفن میں امتیاز کیا کرتے تھے تو دوسری طرف مجھ جیسے نو آموز کو بھی اشعار کے اسرار ورموز سے مستفیض کرتے تھے۔ جنہیں مختلف مذاہب و عقائد سے کما حقہ واقفیت تھی اور جو اصحاب کہف اور باغ فدک کے فروعی مسائل اور ان کے پس منظر سے بہرہ ور تھے جو کشمیر کی جدید اور قدیم تاریخ کے ایک بیش بہا بحر ذخار تھے اور جنہیں ایک ماہر جغرافیات کی طرح متعدد ممالک کے پہاڑوں اور میدانی علاقوں کی پوری علمیت تھی۔

نور محمد کی آگہی کو میرے علاوہ بھی ان گنت لوگوں نے دیکھا اور پرکھا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے گلے میں جو سوز بھر دیا تھا، آواز کے اُس لپکتے ہوئے شعلے سے کم ہی لوگ واقف رہے ہوں گے۔ متعدد بار ایسا بھی ہوا کہ دکان چھوڑ کر نور محمد مجھے اپنے ہمراہ سیر سپاٹے پہ لے جاتے۔ ہماری کوئی متعین منزل نہیں ہوتی۔ کبھی ڈل کی مچلتی لہروں پر شکارے میں سیر ہوتی۔ کبھی ٹانگے پہ سکوت دامنِ کہسار میں واقع چشمہ شاہی کی تنہائیوں میں۔ کبھی کبھی تو چھتہ بل میں جہلم کے کنارے پر ہی لا کر بٹھا دیتے اور حافظ شیرازی کے اشعار گنگناتے رہتے۔ کبھی لال منڈی کے دور افتادہ باغ میں خواجہ حبیب اللہ نوشہری کا کلام گاتے۔ لال منڈی کے اسی باغ میں ایک دن نور محمد پر عجیب کیفیت طاری ہوئی اور وہ گردوپیش سے بے نیاز ہو کر ایران کی ایک مشہور شاعرہ طاہرہ کی ایک وجد آفرین اور والہانہ غزل نہایت ترنم اور اونچی آواز میں گانے لگے۔

بُشریٰ ہلہ ، بُشریٰ ہلہ ، بُشریٰ ہلہ ، بُشریٰ

غالباً باغ میں صرف ہم دو موجود تھے مجھے محسوس ہوا کہ نور محمد جیسے خود ایک عظیم شاعر

تھے جس کو غیب سے اُس وقت یہ مصرعہ الہام کی صورت میں عطا ہو رہا تھا۔ اپنے ماضی کو جاننا اور اپنی عظیم المرتبت شخصیات کی تعظیم کرنا زندہ قوموں کا دستور رہا ہے۔ نور محمد نے اپنی انتھک کاوشوں اور سمجھ بوجھ سے ایک بڑے کاروباری گھرانے کی بنیاد رکھی ہے۔ اس خاندان کے جو چشم و چراغ آج نور محمد کا نام لے کر فخر محسوس کرتے ہیں انہیں چاہئے کہ وہ خُدا سے توفیق کی التجا کریں اور مل جل کر کئی ایسی یادگاریں قائم کریں جن سے نور محمد کا نام بھی ہمیشہ زندہ وتابندہ رہے اور مجموعی طور کشمیری قوم بھی فخر کر سکے۔ چونکہ نور محمد بنیادی طور ایک دانشور تھے اور کشمیری زبان وادب کے ایک عالی مرتبہ مداح بھی رہے لہٰذا بہتر رہتا اگر شروعات کے طور پر کشمیر یونیورسٹی میں ''نور محمد گولڈ میڈل'' نام کا ایک یادگار میڈل قائم کیا جائے جو ہر سال کشمیری زبان وادب میں فسٹ ڈویژن اور فسٹ پوزیشن حاصل کر کے ایم۔اے پاس کرنے والے طالب علم کو یونیورسٹی کی طرف سے عطا کیا جائے۔ یہ ریاست کے ایک باوقار ادارہ میں مرحوم کی یاد زندہ وتابندہ رکھنے کا ایک باوقار ذریعہ ثابت ہوگا۔

............OO............

ــــــ......محمد یوسف ٹینگ

کشمیری ادب کا ایوانِ نور
(غلام محمد نور محمد تاجرانِ کتب)

ہندی زبان میں کتب چھاپنے کے لئے ایک بہت عمدہ اور مفہوم پرور ترکیب کا چلن ہے، پستک یا کتاب کو پرکاشت کرنا یعنی اس کو اندھیرے سے روشنی میں لانا۔ اگرچہ اردو میں اس دوات کو جس میں قلم ڈبو کر اُس کی عطر سے لکھا جاتا ہے، اُس کو بھی روشنائی کہا جاتا ہے لیکن پرکاشت کی روشنی کا جواب نہیں لیکن اردو میں بھی شاعر کی کلیات کو بیاض کہتے ہیں، جس کا مطلب اُجلا، سفید چمک دمک والا ہوتا ہے۔ خود اردو میں ایک صدی سے پہلے جو ترقی پسند تحریک شروع ہوئی، اس کے ایک بڑے بانی سید سجاد ظہیر کی ایک بڑی کتاب بھی ''روشنائی'' کے نام سے موجود ہے۔

واقعی کتاب افکار اور اذکار کو اندھیرے سے نکال کر اس طرح روشن کرتی ہے کہ پھر اس کی لَو کو بجھایا نہیں جاسکتا۔ کوئی چھپانے اور بجھانے کی کوشش بھی کرے، وہ کسی نہ کسی روزن سے اپنی تابانی دِکھاتی رہتی ہے۔ ظفر علی کے بقول ؎

پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا

کشمیری زبان کے بارے میں یہ اور بھی زیادہ درست ہے۔ یہ قدیم زبان جس کی آج سے کوئی اڑھائی ہزار سال پہلے لکھی ہوئی کتاب پاڈر کشتواڑ کے ناگ سین کی ''ملند پہنو''

کے یونانی، انگریزی، سنسکرت اور فرانسیسی ترجمے موجود ہیں لیکن کشمیریوں کی اغیار پرستی کی وجہ سے اس کا کشمیری اصل ناپید ہے۔ اس ظلمت میں پہلا چراغ ۱۸۶۰ء کے قریب ستھو بر برشاہ کے بھاسکر راز دان نے اُس وقت جلایا جب اُس نے ہماری تہذیبی اور لسانی مادر نشان شاردا لل دید کے ساٹھ واکھ شاردا لپی میں شائع کئے۔ اس کے بعد مغرب سے آئے (Matriach) ہوئے فرنگیوں کی لمبی قطار نے کشمیری ادب کے کئی شاہکاروں کو رومن رسم الخط میں شائع کرنے کا سلسلہ شروع کیا۔ تفصیل کی ضرورت نہیں، مگر ائرنسٹ نیو، سر رچرڈ ٹیمپل، سر آرل سٹائن، جارج گریرسن کے علاوہ ہمارے اپنے آنند کول بامزئی نے بھی ایسی کتابیں انیسویں صدی کے آواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں شائع کیں۔ انیسویں صدی میں عیسائی مشنری نے اپنے تبلیغی مقاصد کے لئے مقدس بائبل کا کشمیری ترجمہ بھی کرایا جو ٹیڑھا میڑھا ہی سہی، مگر کشمیریوں کے قریب تھا۔ اس کے علاوہ خود کشمیری ادیبوں اور ترجمہ کاروں نے بھی اس سلسلے کو آگے بڑھایا۔ مثلاً بڈگام کے کربلائی علی محمد عرف علی بخش نے ۱۳۳۲ھ (۱۹۱۲ء) میں ''معراج صلاح منہاج فلاح''، کشمیری زبان میں ترجمہ کر کے چھاپی، جسے مطبع مفیدِ عام لاہور نے شائع کیا اور جو چھپ کر ہمارے سامنے ہے۔ یہ سب کچھ ہیں غلام محمد نور محمد تاجرانِ کتب کے نمودار ہونے سے پہلے کی کچھ ہلکی پھلکی کرنیں ہیں۔

لیکن یہ کسی بچے کی اُس ابتدائی اُچھل کود کے مثل ہے جو وہ چار زانو چلتے ہوئے اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کی کوشش میں کرتا ہے اور وہ بھی ایک اوزار کو استعمال کرتے ہوئے جسے کشمیری میں ''وتنہ گُر'' اور اردو میں ''گڈ ننا'' کہتے ہیں۔ لیکن جب ۱۹۲۰ء کے آس پاس سری نگر کے مہاراج گنج بازار کے پاس اور شہمیری سلاطین کے مزارات اور مشہورِ عالم ڈومٹھ کے عقب میں غلام محمد نور محمد تاجرانِ کتب نے اپنی چھوٹی سی دکان کھولی تو گویا کشمیری ادب کی دنیا میں روشنی کا آفتاب برسرِ بام آ گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے چھ سات سو سال کے گھنائے ہوئے اور بڑی حد تک گمشدہ ادب کے زر پارے چمک دمک دِکھانے لگے۔ کشمیر کی سٹیڈیم نما وادی

کے اطراف واکناف سے بھولے بھالے مگر ادبی نشے میں مست متوالے اس دکان میں اپنے قلمی نسخے لے کر کودتے پھاندتے پہنچنے لگے۔ انہیں نہ کسی روپے کی طلب تھی نہ کسی اکرام کی۔ بس تخلیق کار کی وہ پیاس انہیں تڑپا رہی تھی جو اپنے کلام کو اپنی قاری تک پہنچانے کے لئے پھڑک دھڑک رہی تھی۔ ان کا کلام دھڑا دھڑ چھپنے لگا اور ہاتھوں ہاتھ بکنے چکنے لگا۔ تاجرانِ کتب کو اس سے کیا معاملہ تھا وہ الگ بات ہے، لیکن دکان کی دھوم مچ گئی۔ سارے کشمیر میں اس کا چرچا ہونے لگا، چالیس پچاس سال تک وہ بھی لاہور کے چھاپہ خانوں میں اپنی کتابیں چھپواتے رہے۔ مثلاً میرے سامنے جو کتاب ہے اُس کا نام ''اکبر نامہ'' ہے جو مُلاّ حمید اللہ شاہ آبادی کی فارسی میں لکھی ہوئی کتاب کا ترجمہ ہے جسے پیرزادہ محمد سعید ساکنہ سورس یار چاڈورہ نے کشمیری لباس پہنایا ہے اور کوہِ نور پریس دہلی سے چھاپا۔ افسوس کہ تاجران حضرات کی کتابوں پر نہ قیمت درج ہوتی تھی اور نہ سالِ اشاعت، تاجرانِ کتب کشمیری کے علاوہ فارسی، عربی، انگریزی بلکہ ہندی میں بھی کتابیں چھاپتے رہے اور اس میں موضوعات، لسانیات، کیفیات کی کوئی تمیز تفریق نہ ہوتی تھی۔ بڑے غلام محمد صاحب کشمیری دستار پہنتے اور ریش سے آراستہ تھے اور چھوٹے مگر اصل کماؤ نور محمد کلین شیوو۔ اس وقت کشمیر میں ادیبوں، عالموں، خوشنویسوں اور سخن دانوں کا کوئی باضابطہ سنگم نہیں تھا۔ معاملہ برِصغیر کی تقسیم سے پہلے کا ہے جب پنجاب اور خاص طور لاہور کے ادیب، شاعر اور دوسرے سخنور گرمی کے کچھ مہینے سری نگر میں گزارنے کے لئے آتے رہتے تھے۔ یہ دکان اُن کی کشش اور ملاقات کی آماجگاہ بننے لگی۔ فیضؔ پراچہ، علم الدین سالکؔ، حفیظؔ جالندھری، محمد الدین تاثیرؔ، محمد دین فوقؔ، غلام رسول مہرؔ، عبدالمجید سالکؔ، صوفی تبسّمؔ، تلوک چند محرومؔ اور ایسے ہی بہت سے دانشور اور سخنور یہاں ملتے رہے اور بحث ومباحث میں اُلجھتے رہے۔ پروفیسر رحمٰن راہیؔ اُن دِنوں اس دکان کے متصل وازہ پورہ میں بود و باش کرتے تھے۔ اُن کا راقم سے کہنا ہے کہ خود نور محمد صاحب ایک شائستہ ادبی ذوق کے مالک تھے اور انہیں فارسی، عربی، اردو اور کشمیری کی غزلیات اور مثنویات تک

از بر تھیں اور کبھی کبھی لے میں آ کر اونچی لحن میں ان اشعار کی تانیں بلند کرتے رہتے تھے۔
راہؔی صاحب کا کہنا ہے کہ اُن کو شعر و ادب کے پہلے پہلے پیالے نور محمد صاحب نے ہی نوش کرائے اور اُن کی صحبت میں ہی راہؔی صاحب کے وجود میں خیمہ زن ادیب اور شاعر جاگ اُٹھا اور گنگنانے لگا۔

نور محمد صاحب نے بعد میں مہاراجہ رنبیر گنج بازار سے امیرا کدل کے کوکر بازار کی طرف رُخ کیا اور اس کے قرب و جوار میں اپنی دکان کے ساتھ اپنا ''نور محمدی پریس'' بھی قائم کیا۔

راقم الحروف کی ملاقات اُن سے وہیں پر ہوئی تھی۔ وہ ایک بڑے زیرک تاجر تھے لیکن اُن کے مزاج کی سادگی اور انکساری توجہ طلب تھی۔ وہ فرصت کے اوقات میں (جو اُن کو بہت کم نصیب ہوتے تھے) ادبی معاملات پر باتیں کرتے تو اُن کی وسعتِ معلومات کے ساتھ اُن کے ذاتی تدبر کا بھی اندازہ ہوتا تھا۔

انہوں نے ہمارے ادب کے شاہسواروں احد زرگر، کرشن جو راز دان، غلام محمد حنفی، عبدالاحد آزادؔ، پریم ناتھ بزاز، پریم ناتھ پردیسی، غلام احمد مہجوؔر وغیرہ کے ساتھ شانہ بشانہ کام کیا تھا اور اُن کی انسانی شہہ زوریوں اور کمزوریوں دونوں سے واقف تھے اور کبھی کبھی مزے لے کر اُن کے قصّے کہانیاں سنایا کرتے تھے۔ البتہ وہ شاعروں اور ادیبوں کے بڑے قدردان تھے اور اُن کو کھِلانے پلانے میں بھی پیش پیش رہتے تھے۔ وہ ایک لمبی سی شیروانی پہنتے اور سر پر ایک کوتاہ قیمت قراقلی نما ٹوپی پہنتے اور عموماً دوپہر کا کھانا کھانے سے پرہیز کرتے تھے۔

نور محمد کو کشمیری ادب کا منشی نول کشور کہا جاتا ہے۔ نول کشور نے واقعی اُس وقت کے صوبہ جات اودھ و آگرہ میں اردو ادب کی بڑی خدمت کی اور سینکڑوں اردو کتابوں کو شائع کر کے اُس وقت ہندوستان کی سب سے بڑی اور چہیتی زبان اردو کو مالا مال کر دیا۔ لیکن یہ بات بھی فراموش نہیں کی جا سکتی کہ وہ زیادہ اردو کے دبستانِ لکھنو اور الٰہ آباد کے اصل نقیب و نمائندے تھے جو اس وقت یقینی طور اردو کا سب سے بڑا دبستان تھا، لیکن اُس وقت اِس سے

قدرے کوتاہ دبستان اِدھر اُدھر سارے ہندوستان میں پھیلے ہوئے تھے اور اردو کے خیابان کی الگ الگ کیاریوں کو سینچ کر اُن میں طرح طرح کے گل بوٹے اور چمن سنوار رہے تھے۔ مثلاً لاہور جہاں انیسویں صدی اور بیسویں صدی کے کچھ سب سے بڑے سخنور اپنی طاقتِ لسانی اور زورِ قلم سے بنے گلشن سجا رہے تھے۔ یہی حال حیدر آباد کا بھی تھا، جہاں اردو ادب کی تاریخ ان مکاتیب سے بھی قدیم تھی اور جسے آصف جاہی پادشاہوں کی سرپرستی سیراب کر کے واقعی ایک گلستانِ سخن کی صورت میں اُبھار رہی تھی۔ اسی طرح بمبئی اس بارے میں پیچھے نہیں تھا۔ میرے پاس اس وقت ''دیوانِ بیدل'' کا ایک چھاپی نسخہ ہے جو ۱۲۷ھ مطابق ۱۸۷۵ء چھپا ہے اور اسے ''مطبع حسینی بمبئی'' نے شائع کیا ہے۔

کشمیر میں صرف غلام محمد نور محمد تاجرانِ کتب یہ شاندار کارنامہ انجام دے رہے تھے۔ اگرچہ اُن کے بعد علی محمد اینڈ سنز، عثمان بک ڈیپو اور گلشن پبلشرز نے اس سلسلے میں بہت عمدہ کام کیا۔ لیکن وہ تو ذرا بعد کی بات ہے۔ نور محمد صاحب کی نگرانی میں کشمیری زبان و ادب کی اقلیم نے کتنے پر پُرزے نکالے، اُس کے لئے راقم کی عبارت آرائی سے زیادہ اُن کی اشاعتی پُرفشانیوں کا ایک مختصر سا خلاصہ پیش کرنے سے اُن کی خدمات کی گہرائی اور گیرائی کا بہتر نقشہ صورت پذیر ہوگا۔ ذرا ملاحظہ فرمانے کی زحمت فرمائیں۔

◄◄ ......سیرت و نعت

شمائلِ شریف نبویؐ: از عبد الاحد نادمؔ، گلشنِ نعت، گُلبنِ نعت، گلدستۂ نعت (تین جلدیں) گُلزارِ نعت (چار جلدیں) حدیقۂ نعت (پانچ جلدیں) اعجازِ غریبہ (مجموعہ معجزاتِ آنحضرتؐ)، گلزارِ مدینہ در عشقِ نبیؐ، معجزۂ یمن، معراج نامہ: از محمود گامی۔ معراج نامہ: از شمس فقیر، وہاب کھار، معراج نامہ کلاں: از بدرالدین، وفات نامۂ آں حضرتؐ کلاں، شمائلِ شریف: از حیدر بابا، قصص الانبیاء (کلاں) حجۃ الاسلام بطرزِ سوال و جواب۔ دعائے صبح، درود حضورؐ، جنگ نامہ آنحضرتؐ، مغاز النبیؐ کلاں: از نامی کشمیری

›› ......ذکرِ اولیاء ودیگر اسلامی کتب

گلدستۂ انوار مناقبِ اولیاء، گلدستۂ منقبت، مناقبِ اولیاء حصہ دوم، کراماتِ غوثیہ، کراماتِ شہنشاہِ بغدادؒ، کراماتِ محبوب العالمؒ، کأشر سلطانی (تین جلدیں)، اوحال الاخرتؒ، کأشر دین الحق عقاید، اسرار شریعت، کأشر ضروریات دین، کأشر مسئلہ کتاب۔

›› ......قصص اور کہانی

قصۂ اصحابِ کہف، قصۂ سلطان ابراہیم ادھم، یوسف زلیخا کلاں مسکین، یوسف زلیخا خورد محمود گامی، قصۂ حضرت ایوب صابرؑ، قصۂ تمیم انصاری، قصۂ کلیلہ ودمنہ، انوارِ سہیلی (کشمیری)، قصہ ہارون الرشید، قصۂ عورت ڈلہ ودشنان، قصۂ بہرام گور، ہشت بہشت کأشر، قصۂ زہرہ بہرام وحسن بانو، قصۂ گل اندام، سلطان محمود غزنوی، قصۂ شیخ صنعان، قصۂ شیخ منصور، پہلی کور، قصۂ گربہ وموش، قصۂ حاتم طائی (سات جلدیں)، فرخ فال گلزارِ حقیقت، قصۂ گل وصنوبر (کشمیری)، بدرِ منیر، گلدستہ بے نظیر، چندر بدن، چراغِ محفل، کأشر الف لیلیٰ مکمل، کأشر مہر وماہ یعنی زون آفتابہ، قصۂ زین العرب، باغ و بہار کامل، قصۂ ملکہ سبا، ممتاز بے نظیر (شش جلدیں) وغیرہ

›› ......طنز ومزاح

گریس نامہ ازمقبول شاہ کرالہ واری، پیر نامہ از مقبول شاہ کرالہ واری، مکرزن از الیاس بابا، ملہ نامہ از مقبول شاہ کرالہ واری۔ اسن تہ گندن، قصۂ الہ شہر، بیربل نامہ کشمیری، مقدم نامہ بہ جواب گریست نامہ

›› ......جنگ نامے

جنگِ بدر، جنگِ احد وخندق، جنگِ خیبر، سامنامہ، جنگِ خاور، جنگِ رُستم، شاہ نامہ (دس جلدیں)، جنگِ زیتون، جنگِ امیر حمزہ، (پندرہ جلدیں) سیف الملوک بزبانِ کشمیری، جنگ حضرت علیؓ کلاں، جنگ نامۂ کربلا، جنگ مختار (آٹھ جلدیں) وغیرہ۔

...... موسیقی

موسیقی کشمیری از حافظ احمد اللہ (اٹھائیس جلدیں) لولہ باغ، بہارِ گلشنِ کشمیر (دس جلدیں) سازوسنطور

...... تراجم

قرآنِ مجید مترجم کشمیری جلی قلم، گلستان بوستان (از سعدی شیرازیؒ) ترجمہ کشمیری، پنج گنج فارسی، بڈ مسئلہ کتاب کشمیری، معراج نامہ مصطفیٰ (کشمیری) لیلیٰ مجنون از محمود گامی، لیلیٰ مجنون از کبیر لون، لیلیٰ مجنون از محی الدین مسکین، طوطا کہانی (کشمیری)، پند نامۂ عطار ترجمہ کشمیری، کأشر اکبرنامہ، کأشر رامہ اوتار، رعناوزیبا مترجم، شمس الدین حیرت کشمیری، قمرالزمان از حنفی کشمیری وغیرہ۔

...... صوفی شعراء

بیاضِ شمس فقیر، بیاضِ رحمان ڈار، بیاضِ نعمہ صأب، بیاض احمد بٹہ واری، رموزِ عارف، غزلیاتِ محمود دوازہ وغیرہ

یہ مضمون بہت طوالانی بن گیا ہے، اِس لئے اِس کو قصۂ مختصر کرنا پڑے گا۔ اگرچہ اس طرح سے تاجرانِ کتب کی کارفرمائی کا اِس سے طویل تر حصّہ فی الحال بستۂ خاموشی میں ڈالنا پڑے گا۔ سچ تو یہ ہے کہ بعد کے علمی ادارے چاہے وہ محکمہ اطلاعات کا شعبۂ اشاعت ہو، کلچرل اکادمی ہو، یونیورسٹی کا کشمیری یا شعبہ نور رہو اِسی سے کسبِ فیض کر کے اس کو بہتر بنانے میں لگے رہے۔ آخر پر یہ بات کہ تاجرانِ کتب اِن کتابوں کو اُس وقت کے غیر معیاری رسم الخط میں چھاپتے رہے اور ''چون'' کو ''چانو'' اور ''میون'' کو ''میانو'' لکھتے رہے۔ لیکن اُن کے قاری کو عادت ہوگئی تھی اور وہ اسے صحیح تلفظ سے پڑھتے تھے اور ہاں نور محمد کا کہنا تھا کہ وہ اِن کتابوں کو معمولی، کم خرچ اور زرد کاغذ پر چھاپتے تھے کہ اِس کی قیمت اُس وقت کے غریب قاری کے جیب پہ زیادہ بوجھ نہ ڈالے اور یہ جلدی کٹ پھٹ بھی جائے تا کہ پبلشر کی کمائی کا سلسلہ بھی جاری رہے۔

...........OO...........

کشمیری:- غلام نبی فراقؔ
ترجمہ:- اسداللہ اسد

نور محمد اور کشمیری زبان

میں جب سکول سے گھر آیا، سارے افراد خانہ اِکھٹے عصر کے وقت چائے پی رہے تھے۔ میں کتابوں کا بستہ طاق پر رکھ کر چائے پینے بیٹھ گیا۔ چائے پی کر میری بڑی بہن نے مجھ سے کہا ''چائے پی کے مہاراج گنج جا کر'' غلام محمد نور محمد تاجران کتب'' کی دکان سے ''گلشنِ نعت'' خرید کر لے آؤ'' (میں نے) چائے پی لی، پیسے حاصل کئے اور ''گلشنِ نعت'' خریدنے مہاراج گنج کی طرف روانہ ہوا۔

بعد عصر کا وقت تھا، بازار مسجد کی پرانی برزے والی چھت پر بے شمار گلِ لالہ اُگے تھے جو موسمِ بہار کی کھلی ہوئی دھوپ میں نیلے آسمان کے تلے ماحول کو پُر امید بنا رہے تھے۔ یہ بُرزے سے ڈھکی چھتیں ابھی بھی کہیں کہیں چمکتے ہوئے بارش کے قطروں کے ٹپکاؤ کا دلکش منظر پیش کر رہی تھیں۔ بھوری کدل پار کر کے میں گڈھ بازار پہنچا جہاں سے میں مُڑ کر مہاراج گنج سڑک پر پہنچ گیا۔ اسی جگہ ایک تنگ سڑک پر ''گلشنِ نعت'' خریدنے کے لئے مطلوبہ دکان تھی۔ دکان کے تجاوزی حصے پر ایک دیدہ زیب رنگیلا نوجوان ایک ادھیڑ عمر کے داڑھی والے انسان سے باتیں کر رہا تھا جو دکان کے اندر بیٹھا تھا۔ میں نے اِس داڑھی والے دکاندار سے کہا۔

مجھے ''گلشنِ نعت'' دیجیے۔

یہ رنگیلا نوجوان اُٹھ کھڑا ہوا اور اپنا ہاتھ کونے میں رکھی ہوئی الماری کی جانب بڑھا کر اُدھر سے ''گلشنِ نعت'' کی ایک جلد اُٹھا کر بولا:

''لے لو، بیٹا''۔

مجھ سے لئے ہوئے پیسے اس بوڑھے کو دیئے اور مجھے ہنستے ہوئے بولا کہ ساری کتابیں اس دکان پر دستیاب ہیں۔ ادھر مہاراج گنج کی جانب سے ایک ٹانگہ آیا اور میں جلدی سے پیچھے کی طرف ہٹ گیا کیونکہ یہاں پر سڑک مشکل سے ایک ٹانگے کے سائز کے برابر تھی۔ مجھے اِس صفائی پسند منچلے کے حسن سلوک نے بے حد متاثر کر دیا جس کے بارے میں مجھے بعد میں پتہ چلا کہ یہی نور محمد ہے اور داڑھی والا آدمی اس کا باپ، غلام محمد ہے۔

نور محمد، بڑی بڑی مضطر نیلی آنکھیں، بڑی کھوپڑی پر سفید قراقلی ٹوپی، کلین شیو والا، خربوزے کی طرح ٹھوڑی کی جانب اُترتا ہوا گول گول چہرہ، میانہ قد، چھریرا بدن، گوری کھال، سنہرے بال، قمیض، کوٹ پتلون یا پتلون نُما پاجامہ زیبِ تن، پیروں میں خوبصورت ہلکا جوتا پہنے ہوئے۔ نور محمد، جس کے بدن پر بڑھاپے میں بھی رنگیلے پن کی شان ٹپکتی تھی۔ جس دکان سے میں نے ''گلشنِ نعت'' خرید لی تھی وہ دکان سڑک کو کشادگی دینے کی غرض سے جلد ہی ہٹائی گئی۔ مگر ''غلام محمد نور محمد تاجرانِ کتب'' کا سائن بورڈ اسی علاقے میں کچھ دکانیں چھوڑ کر دوسری دکان پر چسپاں ہوا۔

جس وقت میں نور محمد کی دکان پر پہنچ گیا، میں کوئی یہی پانچویں چھٹی جماعت کا طالب علم رہا ہوں گا۔ اِسکول جانے والے طالب علموں کا کتابوں کی دکانوں پر آنا جانا ہی رہتا ہے۔ خاص کر اس زمانے میں جب کہ کتابوں کی دکانیں بہت ہی کم ہوا کرتی تھیں۔ اگر سیاہی ہوتی تو نرسل کے قلم کی ضرورت رہتی۔ ہولڈر کے لئے نب کی ضرورت بھی ہوا کرتی تھی۔ کاغذ قلم بھی آئے دِن طلاب کی احتیاج رہا کرتی ہے۔ میں نے پہلے ہی اِس بات کی طرف اِشارہ کیا کہ مجھے اِن

چیزوں کے علاوہ بھی ''غلام محمد نور محمد تاجرانِ کتب'' سے وہ کتابیں خرید نے کے لئے آنا جانا پڑتا تھا جو وہ وقتاً فوقتاً چھاپ لیتا تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ میرا اُس کے پاس آنے جانے کا یہ عمل ایسی شناسائی میں تبدیل ہو گیا جس میں ایک بھروسہ قائم ہوا۔ اب ہمارے مابین ایسی باتیں بھی ہوا کرتیں جن کا تعلق ادب اور ادب شِناسی کے ساتھ بھی ہوا کرتا تھا اور جن کا واسطہ ہمارے ذاتی معاملات اور مسائل کے ساتھ بھی ہوتا تھا۔

نور محمد خود زیادہ تعلیم یافتہ نہ تھا۔ اُس نے نہ کسی کالج سے تعلیم حاصل کی تھی اور نہ کسی یونیورسٹی سے، مگر جس حصولِ مقصد کے لئے علم حاصل کیا ہے وہ اسے اپنی کمال کی ذہانت سے حاصل ہوا تھا۔ اِس بات کا قائل ہوتے ہوئے کہ تجارت نوکری کے مقابل زیادہ منافع بخش ہے، اُس نے اپنے خاندان کے نوجوانوں کو اعلےٰ تعلیم حاصل کرنے کی طرف مائل ہونے نہ دیا۔ اُن کو تجارت ہی کی طرف راغب کیا اور وہ سارے تاجر بنے۔ اُس کو اس بات کا احساس تھا کہ تعلیم ایک انسان کے لئے ضروری ہے۔ اُسے دانشوروں، داناؤں، ادیبوں اور شاعروں کی مجلس آرائی میں بے حد لطف آتا اور اسی لگن سے کاروباری معاملات میں بھی حصّہ لیتا تھا۔ اسے ہنگامے ناپسند تھے مگر اُس کے باوجود وہ ہنگاموں کا خواہشمند تھا۔ اُسے اوباش زندگی سے نفرت تھی مگر اوباش اور آوارہ گردوں کے ساتھ ہمدردی تھی۔ عصری سیاست کے رنگ میں نہ رنگ جانے کے باوجود بھی وہ اِس کے ہر انداز کو بھانپتا رہتا اور اس کے شَدّ ومَدّ کو بھی تاڑتا رہتا۔ وہ نہ تو دہریت پسند تھا اور نہ مذہب کے معاملات میں اُن کے ساتھ گُھل مل جاتا جو اِسے وقتی ضرورت سمجھتے تھے۔ دہریت پسند کے ساتھ جوش میں آکر جب وہ اپنی دکان بند کرنے لگتا تو آیات پڑھ پڑھ کر قفل اور دکان کی چوبیں تختوں پر بار بار پھونکیں مارتا۔ دکان کے اردگرد جو بھی کاغذ کے ٹکڑے ہوا کرتے اُن کو اٹھا کر نالی میں ڈبو دیتا۔ جب دکان بند کر کے وہ پاندان محلّہ کی طرف روانہ ہوتا جہاں وہ بود و باش کرتا تھا، میں مَلارٹہ چوک تک اُس کا ہمراہ بن جاتا جہاں ہم ایک دوسرے سے جُدا ہوتے۔ دکان پر جس جگہ نور محمد بیٹھا کرتا وہاں اوپر کی طرف یہ اشعار چسپاں کروائے تھے۔

عُرفیؔ نہ مندیش ز غوغائے رقیباں
آوازِ سگاں کم نہ کند رزقِ گدا را

ترجمہ:......

لاکھ چلائیں رقیب، عُرفیؔ نہ کر غم
عفعفِ سگ سے نہ ہوگا رِزق گدا کم

رستے میں چلتے چلتے وہ اکثر یہ مصرعہ گُنگنا کر کہتا تھا کہ بات خالی از معنیٰ نہیں۔

''کُچھ نہیں جو کچھ نہیں ہے، کچھ نہیں پر کچھ تو ہے''

دِن گزرے، ماہ وسال گزرے۔ زمانے میں بڑی بڑی تبدیلیاں رونما ہوئیں اور نور محمد بھی اِن تبدیلیوں کی جکڑ میں آ گیا۔ اس کو بڑی محنت کرنا پڑی، مشقت اُسے پسند تھی۔ اب اس میں وہ دم خم نہ رہا تھا مگر ہمت، اِستقلال اور دانشمندی اُسی انداز کی تھی۔ اِس احساس کے باوجود بھی کہ کاروبار میں حد سے زیادہ جُٹ کر انسان عدیم الفرصت بن جاتا ہے اُسے فرصت حاصل کر لینی چاہیئے، وہ کاروبار میں جکڑتا ہی گیا۔ حد سے زیادہ مصروفیات کی بنا پر اُسے اب یاد ماضی کی نزاکتوں کا احساس ہوا تھا جو مہاراج گنج کی دکان کو رونق بخشتی تھی۔ مائسمہ بازار کے پریس کے اندر ایسی محفل آرائیوں کا سوال ہی نہ تھا۔ جس کاروبار کو نور محمد نے زندگی دی، وہ خود زندگی کے آخری ایّام میں اس کا غلام بن گیا، لیکن میں جب بھی اُن سے ملتا وہ یہی کہتے کہ اب اِس سخت تگ ودو سے خود کو آزاد کر دیں گے۔ آخر کار تو وہ دِن آ ہی گیا جب نور محمد اُن تمام معاملات سے ہمیشہ کے لئے آزاد ہو گیا جن سے جیتے جی خلاصی اختیار کرنا دشوار ترین تھا۔

آج کا کشمیر پچاس سال پہلے کے کشمیر سے بالکل مختلف ہے۔ ریاست میں بالکل صرف دو کالج تھے جہاں میٹرک کے بعد ڈگری کلاسوں تک تعلیم کا انتظام تھا۔ اِن اداروں میں کشمیری طلباء کی تعداد بہت محدود ہوا کرتی تھی۔ نہ اخبار چھپتے تھے اور نہ ہی رسالہ جات۔

تھیٹر تھے اور نہ ہی اِتنے سنیما گھر۔سری نگر سے اسلام آباد (اننت ناگ) تک ایک یا دو گاڑیاں روزانہ چلتی تھیں جن میں انسانوں کے ساتھ ساتھ مویشی بھی بطورِ مسافر ہوا کرتے۔ ذرائع رسل ورسائل اور پیغام رسانی کے وسائل بے حد محدود تھے۔آمدنی اور ذرائع اخراجات بھی کم تھے۔کشمیر میں چھاپ خانوں کا یہ حال تھا کہ نور محمد اکثر لاہور سے کتابیں چھپوا کر لاتا۔ کتابوں کے مسودے حاصل کرنے کی غرض سے اُسے اکثر شہر سے گاؤں آنا جانا پڑتا۔اثر و رسوخ کا استعمال کرنا پڑتا اور گونا گوں تدبیروں سے جائز فائدہ اُٹھا کر کشمیری کلام دستیاب کرنا پڑتا۔کبھی کبھی اسے مصنفوں اور کبھی خود اپنی مجبوریوں کا سامنا کرنا پڑتا،مگر تہہ دار فکر و دانش کا مالک،نور محمد کسی بھی مرحلے پر اٹکا ہُوا دکھائی نہ دیا۔خریداروں کی قوتِ خرید کے پیشِ نظر ہی کتابیں چھپوائی گئیں۔ایسی کتابیں چھپی جن کی تاریخی اہمیت بھی ہے اور جن کی بدولت کشمیری زبان پڑھنے کا شوق بیدار ہوا اور فکر و دانش کے کام آیا۔اُس نے کشمیری پڑھنے والوں کا ایک حلقہ پیدا کیا۔ایک رسم الخط کو وجود بخش کر اس کی حفاظت کی۔

اگر کشمیری زبان کو نور محمد سا ہمدرد نہ ملا ہوتا شاید کشمیری کا وہ سارا شعری سرمایہ موجود نہ ہوتا جو (اب) ہمارے پاس محفوظ ہے۔زمانے کے ظالم ہاتھوں اس کا بہت سارا حصّہ تلف ہوا ہوتا۔جاڑے کے موسم میں جنگ ناموں کی گہما گہمی اور عشقیہ داستانوں سے محفلیں سجانے والوں کے لئے نور محمد گرمیوں کے دِنوں سے ہی کمر بستہ رہتے۔عام لوگ جن میں مزدور، کسان،ہنر مند،درزی اور دیگر پیشہ ور راتوں کو داستانیں بھی سنتے اور اپنا معاشی دباؤ سے راحت پاتے۔ایسے لوگوں کی محفلوں میں غنیؔ اور غالبؔ کے بالمقابل رسُل میرؔ اور مقبولؔ حُسنِ تصور کا رنگ بھر دیتے۔نور محمد کشمیر کے باقی تمام کتب فروشوں سے مختلف تھا۔وہ کتاب فروش جو آج تک میری یادداشت میں ہیں اور جن سے میرا پچھلے تیس سال سے واسطہ رہا ہے، وہ محض تاجر،خشک کاروباری ہیں۔ان کے پاس آنے والا ہر کوئی شخص گاہک ہونے کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔میں نے نور محمد کی دکان پر عبدالاحد آزادؔ کو بھی دیکھا ہے اور مرزا غلام حسن بیگ

عارفؔ کو بھی۔ کتنے ہی غیر کشمیری اہلِ قلم دانشوروں کو ہم فلسفیانہ گفتگو کرتے سنا ہے جو شاعری کے حسن وقبوح کو زیرِ بحث لاتے۔نور محمد ایسی محفلوں میں شادمانی کا مظہر دکھائی دیتے۔اشعار کو ترنم میں پیش کرتے، کشمیری اشعار اور دیگر زبانوں کے اردو اور فارسی ہم معنی اشعار چُن چُن کے ترنم میں سناتے۔

مجھے اِس قول کے ساتھ اتفاق نہیں۔نور محمد ایک تاجر ضرور تھا مگر اُس نے ایسی کتابیں کیوں طبع کروائیں جن کی حصولیابی سے لے کر چھپائی کے مرحلے تک اسے دشوار گزار مرحلوں سے گزرنا پڑا؟۔وہ تو سٹیشنری اور باقی زبانوں کی تیار کردہ کتابیں بیچ کر بھی منافع حاصل کرتا جو اکثر کتب فروشوں کا شعار رہا ہے۔میں ایک اور واقعہ پیش کرتا ہوں جو ''غلام محمد نور محمد تاجرانِ کتب'' کو دیگر کتب فروشوں سے ممتاز کرتا ہے۔کشمیری زبان کا مقبول شاعر غلام احمد مہجورؔ اپریل ۱۹۵۲ء میں فوت ہوا۔امین کاملؔ کا کہنا ہے کہ اِسی سرما میں ایک دن نور محمد امیرا کدل پر مہجورؔ سے مزاج پرسی کرر ہا تھا، عزیز ہارون، پران ناتھ جلالی اور میں قریب تھے۔مہجورؔ سے جدا ہونے کے بعد نور محمد ہماری طرف مخاطب ہوا:

> ''مہجورؔ اب مہمان دکھائی دے رہا ہے۔اِس کا کوئی حالیہ فوٹو گراف موجود نہ ہوگا۔فوراً اس کا فوٹو گراف کھچوالو، اِس کو مرنا ہے''۔

امین کاملؔ کا کہنا ہے کہ ہم نے مہجورؔ کا فوٹو کھچوایا اور نہایت ہی کم وقت گزرنے کے بعد ہی مہجورؔ فوت ہُوا۔

زندگی کے کچھ حسین لمحات کئی لوگوں کے سامنے سے یوں بھی گزر جاتے ہیں جن کو اگر پہچان لیا جائے تو زندگی سے متعلق ہمارے تجربے وسیع تر ہو سکتے ہیں، مگر ایسے لمحات کو پہچاننے والے بہت کم لوگ ہوتے ہیں۔اس کے باوجود کچھ ہی لوگ ایسے لمحات کی حس آگاہی سے بیدار ہو کر ان لمحوں سے بھرپور فائدہ اُٹھاتے ہیں۔نور محمد ایسے ہی کم لوگوں میں سے ایک تھے۔

..........OO..........

✍......غلام نبی آتش

نور محمد......کشمیری زبان وادب کا محسن

تعلیم کے پھیلاؤ، سائنس اورٹیکنالوجی کی کرشمہ سازی اور اقتصادی ترقی نے آرام، آسائش اور طرح طرح کی ان گنت سہولیات سے انسان کو مالا مال کر دیا ہے۔ انفارمیشن ٹیکنالوجی، انٹرنیٹ اور گلوبلائزیشن نے مسافتوں کو ختم کر کے انسانوں کو ایک دوسرے کے قریب لایا۔ دنیا کو گلوبل ویلیج (Global Village) کہا جانے لگا۔ آج سے سوڈیڑھ سو سال پہلے عام انسان کی حالت بالکل مختلف تھی، وہ ان انقلاب آفرینیوں کا جن کا تجربہ دنیا نے کیا اور جن کا سلسلہ جاری ہے، تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ علمی اور اقتصادی تبدیلیوں سے کشمیر کے حالات بھی بدل گئے۔ انیسویں صدی اور بیسویں صدی عیسوی کے آغاز میں کشمیریوں کی اکثریت ناخواندہ تھی۔ علمی، اقتصادی اور سماجی پسماندگی کے اُس دور میں رسل و رسائل کے ذرائع، تفنّن طبع کے وسائل اور ہر طرح کی سہولیات کا فقدان تھا، کشمیریوں کو شخصی راج سے ملنے والی صعوبتیں برداشت کرنا پڑتی تھیں۔

سخت جان اور محنت کش کشمیریوں نے غم غلط کرنے کے لئے مقامی طریقے وجود میں لائے تھے۔ اُس زمانے میں ریڈیو، ٹی، وی، سینما، انٹرنیٹ وغیرہ کا وجود نہیں تھا۔ یہاں کے

لوگ روایتی لوک موسیقی، لوک تھیٹر اور داستان سرائی سے تفنّن طبع کا کام لیا کرتے تھے۔ صوفیانہ موسیقی کا چلن تھا۔ شادی بیاہ کے موقعوں پر گانے بجانے کا رواج تھا۔ ریشیوں اور ساداتِ کرام کی زیارت گاہوں پر میلوں ٹھیلوں کے دوران گانے بجانے کی محفلیں سجتی تھیں۔ لوک فنکار بھانڈ پاتھر (لوک ڈرامہ) کا اہتمام کرتے تھے۔ صدیوں پرانی لوک کہانیاں سُننے سنانے کا خوب چلن تھا۔ لوگ ان سب چیزوں کو سینہ بہ سینہ ایک دوسرے تک اور نئی نسلوں تک پہنچاتے رہتے۔ گیت، لوک کہانیاں، بانڈ پاتھر، حافظوں کے نغمے اوراس طرح کی دیگر چیزوں کا دارومدار لوگوں کے حافظے پر تھا۔ داستان سراؤں اور کہانیاں سنانے والوں کو دعوت دی جاتی تھی۔ چھ مہینوں پر محیط جاڑے کے طویل موسم کی خنک راتوں کے دوران لوگ روایتی دستکاریوں کے کاموں میں مشغول ہوکر داستانیں اور کہانیاں سنتے رہتے تھے۔ لوگوں کی اکثریت ناخواندہ تھی، کتابوں کی طباعت واشاعت کا کوئی بندوبست نہیں تھا۔

رفتہ رفتہ جن لوگوں نے پڑھنا لکھنا سیکھا، وہ قلمی نسخے تحریر کرنے لگے۔ سرکاری سکولوں کی تعداد بہت کم تھی۔ چھوٹے چھوٹے مکتبوں میں مولوی صاحبان بچوں کوابتدائی دینی تعلیم دیا کرتے تھے۔ مجموعی طور پر لوگ پڑھنے لکھنے کی طرف راغب نہیں تھے، البتہ کشمیری پنڈت زمانۂ قدیم سے دیگر اقوام کے مقابلے میں لکھنے پڑھنے کی طرف زیادہ متوجہ رہے ہیں۔ بیسویں صدی عیسوی کے اوائل میں کشمیری شعراء کے کلام کولکھ کر محفوظ کردینے کا رواج پھلنے پھولنے لگا۔ خود شعراء اپنا کلام لکھوانے لگے۔ موسیقار اپنی یادداشت کے بل بوتے پر شعرا کے کلام کی بیاضیں تحریر کروانے لگے۔ کاتبوں کوعزت وتوقیر کی نگاہوں سے دیکھا جانے لگا۔ مثنوی نگاری اور مثنوی خوانی کا دور شروع ہوگیا۔ مثنوی خوانوں کودعوت دی جاتی اور گھروں میں مثنوی خوانی کی محفلیں سجائی جاتی تھیں۔ ایک مثنوی کئی راتوں کو پڑھی اور سنی جاتی تھی۔ مثنویاں سینکڑوں ہزاروں اشعار پر مشتمل ہوتی تھی۔ مثنوی نگار سے سن کر مثنویوں کوتحریر کرنا کافی مشکل اور وقت طلب کام تھا۔ شوقین لوگ کاتبوں سے مثنویوں، ریشی ناموں اور دیگر

قلمی نسخوں کی نقل کرواتے۔ یہ نقل کرنے میں بعض اوقات کئی مہینے بلکہ کبھی کبھی کئی سال لگ جاتے۔ لوگ دور دور سے مثنویوں اور بیاضوں کی نقلیں منگوا لیتے۔ کاتبوں کو نقد و جنس کافی معاوضہ دیا جاتا تھا۔ اُس وقت تک کتابیں چھاپنے کا یہاں کوئی رواج نہیں تھا، مگر برصغیر میں پریس آیا تھا اور کئی شہروں میں کتابت و طباعت نہ صرف شروع ہوئی تھی بلکہ زوروں پر تھی۔

کشمیری زبان کے شعر و ادب کی خوش بختی تھی کہ اُسی زمانے میں سری نگر کے مہاراجہ رنبیر گنج بازار میں غلام محمد نام کے ایک شخص نے کتب فروشی کے لئے ایک چھوٹی دکان کھولی۔ پہلے پہل اسٹیشنری وغیرہ فروخت کرتا تھا، بعد میں کتابیں بیچنا شروع کیا۔ کتابیں لاہور، دلی اور امرتسر وغیرہ شہروں سے چھپ کر آتی تھیں۔ اُسی زمانے میں نور محمد تولد ہوا تھا، وہ غلام محمد کا شوخ، چنچل اور ذہین بیٹا تھا۔ اپنے خاندان کے اس چشم و چراغ کو اللہ تعالیٰ نے ایک خاص کام کے لئے دنیا میں لایا۔ والد صاحب نے اسکول میں داخلہ دِلوایا مگر نہایت محنتی، قابل اور ذہین ہونے کے باوجود وہ والد صاحب کے انتقال کرنے کی وجہ سے تعلیم جاری نہ رکھ سکا۔ چھوٹی عمر میں ہی دکانداری میں معمر والد صاحب کی مدد کرتا تھا مگر والد صاحب کی وفات کے بعد دوکان کا سارا کام کاج سنبھالنا پڑا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ نور محمد کی دکان ''غلام محمد نور محمد تاجرانِ کتب، مہاراجہ رنبیر گنج بازار سری نگر'' مشہور و معروف فرم بن گئی۔ اب یہاں اسٹیشنری کے تمام ایٹم، طلباء و طالبات کی ضرورت کی چیزیں، نصابی اور غیر نصابی کتابیں دستیاب رہتی تھیں۔ نور محمد ایک حساس کشمیری تھا، تجارت تو اُس کے روزگار کا وسیلہ تھا مگر کتابوں کی تجارت سے وہ کشمیر اور کشمیریوں کی خدمت بھی کرنا چاہتا تھا۔ شعر و ادب کا دلدادہ تھا۔ کشمیریوں میں کتابیں پڑھنے اور سُننے کی عادت ڈالنے کا خواہاں بھی تھا۔ کشمیری شعر و ادب کے اس عاشق تحقیق کار نے گاؤں دیہات میں تلاشِ بسیار کے بعد کشمیری شاعری کا وسیع سرمایہ اکٹھا کیا۔ اکثر کلام معمولی قیمت والے کتابچوں کی صورت میں شائع کر کے اسے نہ صرف محفوظ کیا بلکہ چھوٹے چھوٹے کتب فروشوں اور ہاکروں کے ذریعے گھر گھر پہنچایا۔ گم نام شعراء کا کلام

بازیافت کر کے اُسے شائع کر دیا۔ اُس زمانے میں اور بھی کتب فروش تھے لیکن نور محمد کشمیری شعر و ادب کا واقعی عاشقِ صادق تھا۔ اُس نے تین طرح کی خدمت انجام دی۔ کشمیریوں میں پڑھنے لکھنے کا شوق پیدا کیا۔ کشمیری شعر و ادب کو گھر گھر پہنچا دیا اور شعری سرمایہ کو منظرِ عام پر لاکر محفوظ کر دیا۔ نور محمد صاحب ایک مدت تک باہر سے کتابیں چھپوا کر لاتا تھا مگر بعد میں ایک لیتھو پریس کا خود اہتمام کیا، جس کا نام ''نورِ محمدی پریس'' تھا۔ اب اُس نے چھوٹی بڑی کتابوں کی اشاعت میں سرعت لائی۔ اس طرح ''غلام محمد نور محمد تاجرانِ کتب'' نام کی یہ فرم نہ صرف کتابیں بیچنے کے کام میں مصروف تھی بلکہ کتاب گھر کے علاوہ اشاعت گھر کا کام بھی دیتی تھی۔ پڑھنے والوں کے شوق کو پورا کرنے کے لئے اور پڑھنے کی عادت نہ رکھنے والوں میں پڑھنے کا شوق پیدا کرنے کے لئے اس فرم سے کتابیں کرایہ پر بھی ملتی تھیں۔ گویا یہ کتاب گھر دارالمطالعہ کا کام بھی دیتا تھا۔

شعراء کے کلام اور دیگر علمی، ادبی اور دینی نوعیت کے مسودوں کو تلاش کر کے اکٹھا کروانے سے کشمیری ادب کے محققوں، تذکرہ نگاروں اور مورخوں کو مواد دستیاب ہوتا رہا۔ ''کشمیری زبان اور شاعری'' کے مولف مشہور محقق اور ادبی مورخ عبدالاحد آزاد کو ضرور اُن مطبوعات سے فائدہ ملا ہوا ہوگا، جو نور محمد نے پڑھنے والوں تک پہنچائی تھیں۔ عبدالاحد آزاد کا سال وفات ۱۹۴۸ء ہے۔ قدرتی بات ہے کہ اُس نے کشمیری زبان اور شاعری کا مسودہ فوت ہونے سے قبل مکمل کرلیا تھا۔ آزاد کی وفات کے وقت ''غلام محمد نور محمد تاجرانِ کتب'' کو اشاعت وطباعت کا کام کرتے ہوئے تقریباً سنتالیس سال گزر چکے تھے۔ مرزا غلام حسن بیگ عارف کے خیال میں غلام محمد نے یہ کام ۱۹۰۰ء میں شروع کیا تھا۔[1] پوری سرعت اور کثرت کے ساتھ نور محمد نے کتابیں چھاپنے اور چھپوانے کا کام کیا۔ نور محمد بقولِ غلام رسول کاؤسہ ۵/ مارچ ۱۹۶۵ء میں فوت ہوا۔[2] جب کہ پروفیسر غلام نبی فراق نے نور محمد کے برادرِ اصغر غلام حسن المعروف حسہ لالہ کے حوالے سے لکھا ہے کہ نور محمد ۵/ نومبر ۱۹۰۵ء میں تولد

ہوا تھا اور ۵ مارچ ۱۹۶۴ء کو وفات پائی تھی۔[3] اس کا مطلب یہ ہے کہ عبدالاحد آزاد کی وفات کے وقت نور محمد کی عمر ۴۳ سال تھی۔ یہی وہ زمانہ تھا جب نور محمد پوری شدّت، سرعت اور کثرت کے ساتھ چھوٹی بڑی کتابیں چھپوا کر کشمیر کے کونے کونے تک پہچانے کے کارِ نمایاں میں مصروف تھا۔

ویسے تو کشمیری زبان میں مثنوی نگاری اٹھارہویں صدی عیسوی میں شروع ہو چکی تھی۔ میر عبداللہ بیہقی (اٹھارہویں صدی) اور محمود گامی (اٹھارہویں اور انیسویں صدی کے) اہم مثنوی نگار ہیں۔ محمود گامی نے کئی ایک مثنویاں لکھی ہیں، جن کو زبردست عوامی مقبولیت حاصل رہی ہے۔ انیسویں صدی کے آخر میں مثنوی نگاری کا نیا دور شروع ہو گیا جو بیسویں صدی کے اواخر تک جاری رہا۔ بیسویں صدی کے تقریباً ستر سال کشمیر میں کشمیری مثنوی نگاری اور مثنوی خوانی عروج پر رہی ہے۔ مثنویاں پڑھنے پڑھوانے اور سُننے سنانے کا تقریباً گھر گھر میں رواج تھا۔ اس زمانے میں یہ تفننِ طبع کا بہترین وسیلہ رہا ہے۔ مثنوی نگاروں کا ایک کاروان منظرِ عام پر آ گیا۔ رزمیہ، بزمیہ اور مزاحیہ مثنویاں لکھی جانے لگیں۔ سماجی اور مذہبی موضوعات پر بھی مثنویاں لکھی گئیں۔ شعراء نے اکثر مثنویوں کا فارسی، پنجابی اور اردو وغیرہ زبانوں سے ترجمہ کر کے کشمیری زبان میں مثنوی کی صنف کو مالا مال کر دیا۔ مثنوی نگاری اور مثنوی خوانی اصل میں تمدنی ضرورت کو پورا کر رہی تھی۔ یہ تمام مثنویاں نور محمد نے چھپوا کر پڑھنے والوں تک پہنچائیں۔ اس طرح نقل نویسوں کی ضرورت نہیں رہی۔ مثنویوں کا اتنا بڑا سرمایہ چھپوا کر محفوظ کرنے سے نور محمد نے کشمیری زبان پر بڑا احسان کیا ہے۔ کشمیری شعر و ادب کا جتنا سرمایہ اُس نے اکٹھا کروا کے شائع کیا تھا، اُس کا اکثر حصہ اب نایاب ہے۔ تاہم کئی محققین اور مرتّبین نے نور محمد کے کام کو بنیاد بنا کر بہت سے شعراء کے مجموعہ ہائے کلام اور مثنویاں وغیرہ مرتب کر کے جدید مروجہ رسم الخط میں اُن کو شائع کیا ہے۔ اس طرح نور محمد نے کشمیری زبان کی خدمت انجام دی، جس کا اعتراف بڑے بڑے ادیبوں نے کیا ہے۔

کشمیری زبان وادب کی ضخیم تواریخ موسوم بہ ''کأشر زبان تہٕ ادبک تواریخ'' کے ۲۰۱۸ء کے ایڈیشن میں ناجی منور اور پروفیسر شفیع شوقؔ نے لکھا ہے:

> ''انیسویں صدی عیسوی کے آخری دور میں کشمیری کتابیں چھاپنے کا رواج ہوگیا، اس سے قبل تمام کتابیں قلمی نسخوں کی شکل میں اہلِ ذوق حضرات تک پہنچی تھیں۔ پہلے پہل یہ کتابیں لاہور کے چھاپ خانوں میں چھاپی جاتی تھیں۔ ان میں سے فیروز پرنٹنگ پریس بھی ایک تھا۔ کشمیر میں یہ تاریخی دور شروع کرنے میں ''غلام محمد نور محمد تاجرانِ کتب'' کو اوّلیت حاصل ہے۔ انہوں نے تقریباً ساری مثنویاں اور تمام کشمیری شعراء کا کلام شائع کیا۔ انہیں کاروبار سے شغف کے مقابلے میں ادبی ذوق زیادہ تھا جس سے کشمیر کا ادبی ورثہ محفوظ ہوگیا۔''[۴]

شاعروں کے کلام کے علاوہ نور محمد نے کئی خاص تواریخی اور دینی کتابوں کے تراجم بھی شائع کئے فارسی اور اردو زبان کی کتابیں بھی چھپوائیں۔

نور محمد نے جس نستعلیق رسم الخط میں کشمیری کتابیں لکھوا کر شائع کروائیں، اس نے موجودہ منظور شدہ رسم الخط کے لئے بنیاد فراہم کی ہے۔ اُن کی تقریباً تمام کتابوں کی کتابت قاضی نظام الدین اور محمد حسین وفائی نے کی ہے۔ ان کتابوں میں استعمال شدہ رسم الخط کی اہمیت کے حوالے سے سید رسول پونپر نے لکھا ہے:

> ''کشمیر کے نول کشور مرحوم نور محمد نے ماضی قریب تک کشمیری شعراء کا کلام اسی نستعلیق رسم الخط میں جو اندازہ لگا کر پڑھا جا سکتا تھا، میں لکھوا کر اور محفوظ کر کے کشمیری ادب اور تہذیب کی بڑی خدمت کی۔ اگر ایسا نہ کیا گیا ہوتا تو لاکھوں کشمیری منظوم عشقیہ داستانیں اور جنگ نامے پڑھ کر زندگی کے جوش وجنون کو کیونکر قائم رکھ پاتے۔ یہی رسم الخط موجودہ رسم الخط کا پہلا مرحلہ

تھا۔ نیا رسم الخط تیار کرنے کے لئے ۱۹۵۳ء میں اٹھارہ ارکان پر مشتمل ایک کمیٹی تشکیل دی گئی تھی، جن میں غلام احمد عشائی، مرزا غلام حسن بیگ عارف، پروفیسر محی الدین حاجنی، پروفیسر ایس۔ کے توشخانی، پروفیسر جیالال کول اور پروفیسر پی۔ این پشپ وغیرہ شامل تھے۔ ریاستی انتظامیہ کے سابق اعلیٰ عہدہ دار ، دانشور، ادب نواز اور تہذیب شناس قاضی محمد امین کا کہنا ہے کہ اُن کے والد بزرگوار قاضی نظام الدین بھی اس رسم الخط کمیٹی میں شامل تھے۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ اس زمانے میں مرتب کردہ کشمیری نصابی کتابوں کی کتابت بھی انہوں نے ہی کی ہوگی۔'' [۵]

☆☆

حوالہ جات:......

۱ شیرازہ (کشمیری) جلد: ۱۷۔ شمارہ: ۳ ص: ۷

۲ شیرازہ (کشمیری) جلد: ۱۷۔ شمارہ: ۳ ص: ۳۹

۳ شیرازہ (کشمیری) جلد: ۱۷۔ شمارہ: ۳ ص: ۲۴

۴ کأشر زبان تہٕ ادبک تواریخ ۲۰۱۸ء ص: ۲۰۳-۲۰۴

۵ کأشر املاتہٕ امیک ارتقا ۲۰۱۰ء ص: ۶۳، ۶۴، ۸۱

............○○............
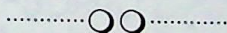
کشمیری:......ظریف احمد ظریفؔ
مترجم:......ولی محمد خوشباشؔ

نور محمد...... قلم وقرطاس کا محافظ

۱۹۵۰ء کے پانچویں عشرہ کا زمانہ یاد آتا ہے۔میں اپنے بھائی کے ساتھ راجوری کدل کے اسلامیہ ہائی اسکول میں زیرِ تعلیم تھا۔اُس زمانے میں اسلامیہ ہائی سکول پورے کشمیر میں ایک معتبر تعلیمی ادارہ گردانا جاتا تھا۔ یہاں یہ بات بتانی بھی لازمی بن جاتی ہے کہ اُن دنوں ہم قطب الدین پورہ عالی کدل میں سکونت پذیر تھے۔اس وجہ سے ہمارا ندی کے اُس پار واقع مہاراج گنج سے ہوتے ہوئے اسکول پہنچنا معمول بن چکا تھا۔مہاراج گنج کو پورے کشمیر میں ایک باوقار اور شاندار واحد تھوک بیوپار اور تجارت کے کاروباری مرکز کی حیثیت حاصل تھی اور یہاں تھوک بیوپار کرنے والوں کی کثیر دکانیں موجود تھیں۔اس تجارتی مرکز میں ان دنوں ''غلام محمد نور محمد تاجرانِ کتب'' مہاراج گنج کے نام سے کتابوں اور سٹیشنری کی ایک نامور دکان خاصی مشہور تھی۔اس دکان کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ یہاں پر طلباء کی ضرورت کی ساری تدریسی اور غیر تدریسی چیزیں و کتابیں جن میں قلم، کاغذ، کتابیں، لاجوردی سیاہی کی ٹکیاں، جیومیٹری باکس، فارسی قلم اور پنسل کے علاوہ قرآن شریف کے الگ الگ پارے اور تعلیم و تعلّم سے جڑی سبھی دیگر چیزیں ہر وقت دستیاب رہتی تھیں۔اِس کے علاوہ

یہاں سے کشمیر کے تمام معروف شعراء کے کلام پر مشتمل خوبصورت چھپائی سے مزیّن کتابچے بھی ملتے تھے۔ جس کی وجہ سے وادئ کشمیر میں کشمیری موسیقی کے حوالے سے تمام کتابیں بشمول رزمیہ اور بزمیہ داستانوں کی کتابیں عام لوگوں میں کافی مقبول ہوئی تھیں۔ اِس دُکان پر اکثر و بیشتر دو صاحب صبح وشام موجود نظر آتے تھے اور۔ یہ دونوں دکان کے مالک تھے جن کا لباس نہایت ہی دِلکش تھا۔ ایک صاحب اکثر بند گلا کوٹ پہنے ہوتے تھے جن کے سر پر قراقلی ٹوپی ہو اکرتی تھی۔ عجیب اتفاق تھا کہ وہ اسکول کے طلباء میں خاصے مقبول تھے۔ اُن دِنوں اسکولوں میں زیرِ تعلیم بچوں کو کاپیاں بنانے کے لئے کاغذ کے کئی دستے درکار ہوا کرتے تھے اور مذکورہ صاحب بچوں میں کاغذ کا ایک دستہ جس میں چودہ تہیں ہوتی تھیں آٹھ آنے میں بیچا کرتا تھا۔ وہ کاغذ کے دستوں کی تہیں اتنی پھُرتی اور تیزی سے کاٹا کرتے تھے کہ بات دیکھنے سے بنتی تھی ۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ کاغذ کے ایک دستے سے چھ کاپیاں بنتی تھیں اور ہاں یہ بات بتانا بھول ہی گیا کہ مذکورہ خوبرو شخص کو سبھی لوگ حسہ لالہ کے نام سے یاد کرتے۔ شاید یہ صاحب نور محمد صاحب کے برادرِ اصغر تھے۔ میں اکثر اس صاحب کے کاغذ کی تہیں گننے کے ہُنر کو نہایت ہی انہماک سے دیکھتا رہتا تھا۔ میری نظر میں شاید ہی انہیں کبھی کاغذ کے یہ شیٹ گِننے میں کوئی بھول چوک ہوئی ہوگی۔

میں اور میرے بھائی گاہے گاہے اِس دکان سے کشمیری موسیقی کی شائع شُدہ چھوٹی چھوٹی کتابیں ایک دو آنے میں خرید لیا کرتے تھے۔ نور محمد صاحب اکثر مجھے یہ کتابیں خریدتے وقت کتاب کے پہلے صفحہ پر درج گیت یا غزل پڑھنے کو کہا کرتے تھے اور میں فرفر کر کے یہ گیت یا غزل پڑھ لیا کرتے تھے۔ جس پر وہ خوش ہو کر مجھے اکثر فارسی قلم یا لاجوردی سیاہی کی ٹکیاں انعام کے طور پر دیا کرتا تھا۔ اس دکان پر اُس زمانے میں زبردست بھیڑ بھاڑ رہا کرتی تھی۔ کیونکہ اکثر لوگ اِس دکان سے تاج کمپنی لاہور کی طرف سے شائع کردہ قرآنِ شریف کے نسخے خریدتے تھے جنہیں بیٹیوں کو شادی کی تقریب پر رخصتی کے وقت ایک یادگار تحفے کے

طور پر دیا کرتے تھے۔

پورے شہر میں یہ واحد دکان تھی جہاں سے لوگ اکثر کشمیر کے صوفی شعراء کے کلام کی چھوٹی چھوٹی کتابیں، رزمیہ اور بزمیہ داستانوں کی کتابیں جن میں گُلریز، گُل بکاولی، شاہ نامہ، اکہ ننڈُن، چہل اسرار اور دیگر تمام نوعیت کی اردو اور فارسی کتابیں خریدنے کے لئے آیا کرتے تھے۔ دکان کا مالک نور محمد صاحب ایک نہایت ہی ذہین اور زود حس دانشور، علم دوست سخنور اور کشمیری زبان وادب کا دلدادہ اور بے مثال عاشقِ صادق تھا۔ سچ مانیں تو میری اُن سے ۱۹۵۷ء میں تب شناسائی ہوئی جب میں کشمیری زبان وادب کے ادبی حلقوں میں ایک قلمکار کی حیثیت سے متعارف ہوا۔ اُس کے بعد ہی مجھے اِس محترم و محتشم شخصیت کی عظمت کا احساس ہونے لگا جس نے شخصی راج کے دور میں بھی کشمیری زبان وادب کے شہ پاروں کو ایک ایک کر کے اس طرح محفوظ کیا کہ زمانہ رہتی دُنیا تک اُن کی اِن کاوشوں کو یاد کرتا رہے گا۔ یقینی طور پر ہمیں ایسی باوقار شخصیت پر فخر ہونا چاہیے کیونکہ کشمیری زبان وادب کے اِس عظیم المرتبت علم شناس شخصیت نے اپنی لگن اور دانشوری کی ایک ایسی گراں قدر Legacy چھوڑی ہے جس کے فہم وفراست کے نشانات اتنے فروزاں ہوگئے کہ کشمیر کا ہر اہلِ علم اُن کا شیدائی بنتا گیا اور انہیں صدیوں تک یاد کیا جاتا رہے گا۔ اُن کی ہر دلعزیزی اگرچہ دورِ حاضر میں کم ہونے لگی ہے لیکن کشمیری زبان وادب کے دائرہ اہلِ دانش وعلم میں ان کی پہچان ہمیشہ بنی رہے گی۔

راقم کو پروفیسر فراقؔ صاحب نے بتایا ہے کہ میں اور راہیؔ صاحب اکثر نور محمد کی دُکان پر مہاراج گنج جایا کرتے تھے اور وہاں اُن کے ساتھ علمی، ادبی، سیاسی اور ثقافتی معاملات پر بحث وتمحیص کیا کرتے تھے۔ فراقؔ صاحب اکثر کہا کرتے تھے کہ نور محمد صاحب نہایت ہی صاحبِ بصیرت شخص تھے۔ اُن کے پاس اکثر گاؤں دیہات سے شعراء حضرات اپنا شاعرانہ کلام چھپوانے کے لئے آیا کرتے تھے اور نور محمد صاحب اُن سے مشفقانہ انداز میں ہم کلام

ہوتے تھے اور اُن سے کتابیں چھپوانے کے لئے محض برائے نام معاوضہ وصول کرتے تھے۔ اکثر شعراء سے کتاب کے سرورق پر شاعر نامی گرامی جیسے القاب لکھنے کی صلاح دے کر انہیں نہایت ہی حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ نور محمد صاحب کی دکان پر جو اہلِ علم کوئی بھی علمی، ادبی، تاریخی یا مذہبی کتابیں خریدنے کے لئے آیا کرتے تھے تو وہ انھیں کتابیں فروخت کرتے وقت کتاب کے پیپر بیک ہونے کی وجہ سے چرمی جلد یعنی (Leather binding) کروانے کی یہ کہہ کر صلاح دیتے تھے کہ اس سے کتاب کئی صدیوں تک محفوظ رہ سکتی ہے اور انھیں چمڑے کے ماہرِ جلد ساز کاریگر، جس کی دکان گڈھ بازار زینہ کدل میں واقع تھی، پر جانے کا مشورہ دیتے تھے۔

نور محمد صاحب کے بارے میں راقم کو ایک اور واقعہ مرحوم حکیم منظور کے دوست مرحوم محمد مقبول شاہ خاکسار، جو محکمہ پولیس میں بحیثیت ڈی، ایس، پی تھا اور ساتھ ہی پنجاب خاکسار تحریک کے بانی علامہ عنایت اللہ المشرقی صاحب کی سرخ پوش خاکسار تحریک کے بھی ایک رضا کارانہ پرچارک تھے۔ نے بتایا کہ کشمیر کے نامور صوفی شاعر احد زرگر نے جب ۱۹۲۵ء میں پہلی بار اپنا کلام شائع کرنے کی غرض سے تاجران کتب کی دکان کا رخ کیا تو مرحوم نور محمد صاحب نے زرگر صاحب کی شاعری کی بے حد پذیرائی کی۔ یہ کہہ کر رخصت کیا کہ آپ کی شاعری خود ہی شائع کروں گا اور کتاب کے چھپ جانے تک اس کلام کا ہدیہ فی الحال پانچ روپے قبول فرمائیں۔ زرگر صاحب پانچ روپے کا ہدیہ پا کر بے حد سرشار ہوئے کیونکہ اُس زمانے میں رفوگر کام کرنے والے ماہر کاریگر کی روزانہ اُجرت محض چار یا چھ آنہ ہوا کرتی تھی۔ احد زرگر صاحب اپنے شاعرانہ کلام کا ہدیہ پا کر مرحوم نور محمد صاحب کو اپنا کلام دینے سے انکار نہ نہیں کر سکے۔ اس موقعے پر مرحوم نور محمد صاحب نے زرگر صاحب کو آئندہ کے لئے یہ اطلاع دی کی کہ جب بھی آپ مزید شاعری ضبطِ تحریر میں لائیں گے تو بنا کسی جھجک کے اُسے بھی میرے پاس لائیں اور میں اُس کے چھپوانے کا کام خود ہی انجام دوں گا۔ عجب اتفاق ہو

اکہ اس کے بعد مرحوم زرگر صاحب ایک مدت تک خاموش ہوئے اور مزید کچھ لکھنے یا کہنے سے قاصر رہے۔ بعد ازاں زرگر صاحب توبہ واستغفار میں اس قدر محو ہو گئے کہ ایک لمبی مدّت کے بعد اُن کے سینے سے از خود پھر سے شاعری کا چشمہ پھوٹ پڑا اور یوں ذہن ودِل پھر سرشار ہوا اور اپنے خیالات کو لفظوں کا پیکر عطا کر کے صفحۂ قرطاس پر بکھیر نے لگے۔

وقت کی تیز رفتار دھارا کے ساتھ غلام محمد نور محمد کی کاوشوں کی بدولت کشمیری زبان وادب کا دامن اِس قدر وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا کہ آج بھی جب کشمیری زبان وادب کی تاریخ کی ورق گردانی کی جاتی ہے تو مرحومین کے بارے میں اُن کا یہ خیال بار بار ذہن کے دریچے پر یہ دستک دیتے ہوئے سُنائی دیتا ہے

چلو اچھا ہوا کام آگئی دیوانگی اپنی
وگرنہ ہم زمانے بھر کو سمجھانے کہاں جاتے
(قتیل شفائی)

............OO............

✍......عمر مجید

کشمیر کا اوّلین اشاعت خانہ

اورادِ فتحیہ کشمیریوں کے پاس ایک ایسا بیش بہا تحفہ ہے جس کی قیمت مقرر ہے نہ ہدیہ۔ حضرت شاہ ہمدانؒ کا یہ دل نشین تحفہ ہر کشمیری گھرانے کی زینت ہے اور اس کا ورد نہایت عقیدت و احترام کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ سو برس قبل قرآن مجید اور حدیث شریف کی طرح اورادِ فتحیہ کو زبانی ازبر کرنے کا دستور تھا۔ لیکن نور محمد صاحب نے اورادِ فتحیہ کو شایانِ شان طریقے پر شائع کرنے کا بڑے پیمانے پر اہتمام کیا۔ اس بیش بہا سرمائے کا واجبی ہدیہ مقرر تھا۔ اسی طرح بے شمار دینی مسائل کو قرآن مجید اور احادیثِ نبوی ﷺ کی روشنی میں شائع کرنے کا اہتمام کیا۔ نور محمد صاحب نے اپنے لئے صدقۂ جاریہ کی سبیل بنا کر کشمیری مسلمانوں میں علم حاصل کرنے کا ذوق و شوق پیدا کیا۔ میں نے زندگی کے اکثر ماہ و سال وادیٔ کشمیر کے اطراف میں برف پوش کوہساروں، دل نشیں چراگاہوں، جلترنگ بجاتے ہوئے آبشاروں، گیت گاتی ہوئی ندیوں کے کناروں پر گزارے ہیں۔ میری مصروفیات میں کوہ پیمائی اور کشتی رانی خاص طور سے شامل رہی، جس کے لئے مجھے مختنانہ ملتا، بھوکا مرتا کیا نہ کرتا۔ یہی وجہ ہے کہ مجھے نور محمد کے ساتھ زیادہ وقت گزارنے کا موقع نہ ملتا تھا۔ میں نے ۱۹۶۴ء میں ادبی دنیا میں قدم رکھا۔ ۱۹۶۵ء میں جب نور محمد نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا میرا پہلا افسانہ ”ایک بوڑھا ولر کے کنارے“،

روز نامہ آفتاب میں شائع ہوا۔ مجھے نور محمد کے رحلت فرمانے کا زبردست قلق ہوا۔ وہ ادب نواز بھی تھے اور صاحب ادب بھی۔ انہوں نے بے شمار شاعروں اور ادیبوں کو گمنامی کے اندھیرے غار سے نکال کر روزِ روشن کی خوشگوار فضاؤں میں لایا۔ انہوں نے کتنے ہی ذروں کو آفتاب بنایا۔ وہ قلمے، سخنے، درمے ان کی مدد کرتے تھے کچھ اس طرح کہ دائیں ہاتھ سے دیتے بائیں ہاتھ کو پتہ نہ چلتا۔ میں ہی ''ازلی شکس لد'' تھا کہ مجھے اپنے ناولوں ''یہ بستی یہ لوگ'' اور ''درد کا دریا'' کے لئے پبلشرز تلاش کرنے کے لئے در بدر بھٹکنا پڑا اور جب ملے تو انہوں نے خود اپنی سفید پوشی کا رونا رویا اور مجھے حق تصنیف کے بطور ایک جلد بھی عنایب نہ فرمائی بلکہ اپنے ہی پبلشروں سے ناول خریدنا پڑے۔ اشاعت کے حقوق انہوں نے اپنے نام محفوظ رکھے ہیں۔ میں دوسرے ایڈیشن بھی شائع نہیں کر سکتا۔ ''یہ بستی یہ لوگ'' کا مسودہ ۱۹۶۴ء کے موسم سرما میں تیار کیا تھا اور نور محمد کے پاس لگ بھگ تین ماہ کے لئے رہا۔ وہ اپنی نگرانی میں دہلی کے ایک معتبر اشاعت گھر میں شائع کرنا چاہتے تھے، ان کی وفات کے بعد غلام حمزہ نے مسودہ واپس کر دیا۔

حمد، نعت، منقبت، سلام کے بے شمار گلدستے نور محمد صاحب نے اشاعت کی دنیا میں سجائے۔ نہ جانے وہ کہاں کہاں سے شاعروں کو ڈھونڈ لاتے تھے۔ وہ طرح طرح کے تجربات کرتے تھے، ایک مرتبہ کسی نے مجھے بتایا کہ وہ قرآن کی تفاسیر پر کام کر رہے ہیں۔

پچاس سال کے صبر آزما وقت میں اشاعت، ترغیب اور پھیلاؤ کے جو فرائض آج کل کے زمانے میں ریڈیو کشمیر، کلچرل اکیڈیمی، کشمیر یونیورسٹی، اخبارات و رسائل، ویب سائٹ اور دیگر اشاعتی ادارے انجام دے رہے ہیں، نور محمد کا واحد ادارہ ان دنوں اس سے کہیں زیادہ سرگرم عمل تھا۔ انہوں نے ایک اہم فریضہ انجام دیا، وہ صرف کشمیری شعرا کے دیوان اور کلیات اہتمام کے ساتھ شائع کرتے تھے۔ کشمیری زبان کی شاعری کو انہوں نے اولاد کی طرح سینے کے ساتھ لگا کے رکھا پھر اس کی اشاعت، ترغیب اور پھیلاؤ میں ایسا کام کیا جو کشمیر کی تاریخ میں سنہرے الفاظ میں لکھا جانا چاہئے۔ اس امر سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اگر نور محمد کشمیری زبان و ادب کی طباعت کے ساتھ منسلک نہ ہوئے ہوتے تو اس صورت

میں کشمیری کا بیشتر ادبی سرمایہ ضائع ہو گیا ہوتا اور آج جو ہمارے پاس موجود ہے وہ اس طرح شہر و دیہات کے اطراف میں پہنچ کر مقبول نہیں ہوا ہوتا۔ ساٹھ برس سے زیادہ عرصہ تک ان کا اشاعتی ادارہ ادبی افق پر چھایا رہا۔ وہ نہایت صدق دلی سے شعر و ادب کی خدمت بجالاتے رہے، لیکن ان کی بے لوث خدمات کو یکسر نظرانداز کر کے ان کو بالکل فراموش کر دیا گیا اور آج ان کا کوئی نام تک نہیں لیتا۔

میں کچھ نہیں جانتا اور نہ جاننے کی کوشش کی۔ نور محمد نے تعلیم کب، کہاں اور کن ضوابط کے تحت حاصل کی مگر وہ کسی بھی موضوع پر بے تھکان گھنٹوں بول سکتے تھے۔ وضع دار تو تھے ہی لیکن الفاظ کی ادائیگی اور رکھ رکھاؤ میں خاص انتظام کرتے تھے جو ان کی عادت بن گئی تھی۔ میں کبھی شام کو گھر کی طرف جا رہا ہوتا تو سرکاری پریس (اشاعت خانہ) کے گیٹ کے عین سامنے ہوٹل روڑ موجودہ مولانا آزاد روڑ پر واقع نور محمدی پریس کے اندر نور محمد کو اخبار کی پروف ریڈنگ میں مصروف دیکھتا۔ وہ باریک اور صبر آزما کام خود ہی کرتے تھے۔ ''غلام محمد نور محمد تاجرانِ کتب'' کے اشاعت خانے سے شائع شدہ مطبوعات کا اڑتیس سال تک نور محمد کتابیں شائع کرتے رہے اور علم و ادب میں اضافہ کرتے رہے۔

............OO............

✍......شوکت حسین کینگ

سیرتِ نبوی ﷺ کا اوّلین کشمیری پبلشر

(غلام محمد نور محمد تاجرانِ کتب)

میرا یہ مقالہ دو فصلوں پر مشتمل ہے۔

فصل اوّل میں کتاب کا مکمل تعارف اور مصنف ناظم کے مختصر حالات درج کیے گئے ہیں

فصل دوم میں ''غلام محمد نور محمد تاجرانِ کتب'' کے عظیم الشان اشاعتی ادارہ کے متعلق اسی کتاب کی روشنی میں اہم باتیں گوش گزار ہوں گی۔

فصل اوّل:......

کتاب کا نام مغازی النبی ﷺ ہے اور موضوعِ کتاب، سیرت حضرت سید الانام ﷺ ہے۔ ناظم کتاب کشمیر کے فخر الشعراء محمد اسماعیل نامیؒ ہیں۔

کتاب کلاں صفحات کے پونے دو سو صفحات پر مشتمل ہے۔

تعدادِ اشعار۔ زائد از پانچ ہزار اشعار بزبان کشمیری اِحیاناً بعض بزبان فارسی ہیں۔ تعداد عنوانات (بزبان فارسی) تقریباً ایک سو نو، جن میں نعوت بزبان کشمیری اور ایک نعت فارسی در توصیف مدینہ منورہ خیر ادارا شرفاً و تعظیماً عنوانات ہیں۔ اندازِ بیاں فارسی و عربی آمیز بطرحِ جناب حضرت سید سیف الدین منطقی تارہ بلی ثم لدھیانوی و حضرت سید پیر عزیز اللہ حقانی

علیہم الرحمہ ہے۔

سالِ تصنیف۔صفر المظفر ۱۳۲۴ھ مرقوم ہے اور سال اشاعت۔۲۳ رسال کے بعد ۱۳۴۷ھ محرم الحرام (یعنی آج سے اکانوے سال قبل) درج ہے۔

کتابت ۔محمد سیف الدین پنڈت (والد ماجد مرحوم محمد امین پنڈت نشاط) نے کی ہے اور قیمت صرف ۱۲ آنے۔

اس مقام پر اس تاریخی حقیقت کی وضاحت ضروری ہے کہ مغازی النبی ﷺ کے موضوع بالا پر کشمیر میں سب سے پہلے حضرت جامع الکمالات جناب ایشان شیخ یعقوب صرفی رحمۃ اللہ علیہ نے بزبان فارسی منظوم سیرت نبوی ﷺ ۱۰۰۰ھ میں تصنیف کی ہے۔آپ حضرت حافظ ابن حجر مکی الشافعیؒ کے شاگرد رشید اور حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی شیخ احمد فاروقی سرہندی علیہ الرحمہ کے استاذ حدیث گزرے ہیں ۔حضرت ایشان کی تصنیف کردہ یہ منظوم سیرت نبوی ﷺ دو دفعہ لاہور میں اشاعت پذیر ہوئی اور اس کے متعدد نسخہ جات، قلمی ومطبوعہ مختلف سرکاری ونجی کتب خانوں میں محفوظ ہیں۔

راقم الحروف کی مختصر لائبریری میں بھی قلمی ومطبوعہ دونوں نسخہ جات بحمد للہ تا حال محفوظ ہیں۔ یہ حضرت ایشان کی آخری تصنیف ہے کیونکہ تین سال بعد ۱۰۰۳ھ میں حضرت نے وصال فرمایا۔ جناب نامی مرحوم نے مغازی النبی ﷺ کا تذکرہ یوں کیا ہے ۔

ہنا بوز اے صاحبِ درد و سوز کنو بوز اخبارِ خاطر فروز
چنین شیخ یعقوب صرفی بگفت بوقتی کہ درّ ھای معنیٰ بسفت

کتاب کے مقدمہ میں حضرت ایشان علیہ الرحمہ نے اپنے حالات اجمالاً بیان کئے ہیں اور اپنا سفرنامہ بھی ضبطِ تحریر فرمایا ہے۔ بعد میں اسی سفرنامہ کو بنیاد بنا کر آپ کے خلیفۂ خاص حضرت خواجہ حبیب اللہ نوشہریؒ نے سیاحت نامہ حضرت ایشان موسوم بہ مقامات منظوم بزبانِ فارسی اِنشاء فرمایا ہے اور کشمیر کے نامور شاعر گرامی قدر محمد اسماعیل شیخ المعروف تاجِر لداخ

نے مغازی النبی کے نام سے یہ عظیم منظوم کارنامہ انجام دیا۔ آپ کاوُڈارہ سرینگر کے ایک متوسط گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ کاوُڈارہ میں حضرت سیادت پناہ سید محمد حبیب اللہ سرخابی تبریزی علیہ الرحمہ کے جوارِ اقدس میں رہتے تھے۔ اُس مقدس دربار کے ساتھ آپ کو بے پناہ عقیدت تھی جس کا اظہار یوں کیا۔

از سیہ بختی دِلاتا کے دہی سر خواب را — چندرانی بر رخ زرد از مژہ سرخ آب را

چشم پوش از روئے مردم تو نیائے دیدہ ساز — خاکِ درگاہِ جناب سید سرخابؒ را

آپ خود سلسلۂ عالیہ سہروردیہ محبوبیہ کے ساتھ منسلک تھے۔ چنانچہ کتاب میں منقبت شریف حضرت سلطان العارفین شیخ حمزہ مخدوم اور اپنے پیرانِ طریقت خاص کر عبدالولی صاحب سہروردی ساکن نائدکدل سرینگر کے مناقب تحریر کئے ہیں اور خاتمۃ الکتاب میں سفرنامۂ تبت بالکل اختصار کے ساتھ اور تبت میں مغازی النبی ﷺ کی تصنیف کی روداد بیان کی ہے۔ یہ المیہ ہے کہ آپ کے مدفن کا کوئی تذکرہ نہیں ملتا ہے۔ خاکسار کو گھریلو کاغذات میں آپ کا صحیح سال وصال (۲۱ ماہ رمضان المبارک ۱۳۵۷ھ) دستیاب ہوا۔ آپ صاحبِ دیوان شاعر تھے۔ آپ کا فارسی دیوان اِس وقت بھی کتب خانہ ساداتِ منطقی عالی کدل میں محفوظ ہے کیونکہ آپ کے شاگرد استاذِ زماں و مدرس پنج گنج نظامی غلام محمد لون (برادرزادہ فقیر عبدالکبیر لون مرشدِ احد زرگر صاحب) میرے استاذ مکرم حضرت مولانا میر سید غلام احمد قادری المنطقی سجادہ نشین درگاہِ غوثیہ عالی کدل مرحوم و مغفور کے استاذِ فارسی تھے۔ منطقی صاحب نے یہ دیوان لون صاحب موصوف سے حاصل کیا تھا۔ آج سے تقریباً تیس سال قبل میں نے اس کی زیارت کی ہے۔ نیز حضرت مولانا سید مبارک شاہ صاحب فطرتؔ گیلانی نے آپ کے حالات پر بسیط مقالہ لکھا ہے جو بدقسمتی سے تاہنوز شائع نہ ہوسکا۔ اسی شاعرانہ عظمت کے پیش نظر غلام محمد نور محمد تاجرانِ کتب نے اِس عظیم الشان سیرت کی اشاعت کا بیڑا اٹھایا تھا۔ اب میں فصل دوم میں اس پر روشنی ڈالنے کی سعی کرتا ہوں۔

فصل دوم:.......

''غلام محمد نور محمد تاجران کتب'' نے یہ کتاب رفاہِ عامہ پریس لاہور سے شائع کر کے اس کی اشاعت کا کارنامہ انجام دیا۔ کتاب سے پتہ چلتا ہے کہ یہ اشاعتی ادارہ ۱۹۰۰ء میں قائم کیا گیا تھا اور بیس سال کی قلیل مدت میں مغازی النبیؐ ہذا تک تقریباً ڈیڑھ سو کتابیں کشمیری زبان میں شائع کر کے کشمیری زبان کی اہم خدمات انجام دیں۔

عام طور پر اس اشاعتی ادارہ کا نام ''غلام محمد نور محمد تاجرانِ کتب'' مہاراج گنج سرینگر کتب ورسائل پر درج ہوتا تھا۔ مگر مغازی النبی ﷺ نامی کشمیری یعنی زیر تبصرہ کتاب پر یوں درج ہے۔

مالکانِ دارالکتب اسلامیہ

احقر الانام ''غلام محمد نور محمد تاجرانِ کتب'' مالکان مسلم ایجنسی بک کشمیر اسلامیہ، کتاب گھر مہاراج گنج سرینگر کشمیر

اس سے مترشح ہوتا ہے کہ کتاب کا تصور آج سے اکانوے سال قبل اسی ادارہ اشاعت کا عطیہ ہے۔ کلچرل اکیڈیمی کے زیر اہتمام کتاب گھر (جو شیخ صاحب مرحوم کے دور حکومت میں وجود میں آیا اور جس کی رُودادِ قیام سابق سیکرٹری جناب محمد یوسف ٹینگ نے شیرازہ کے شیر کشمیر نمبر میں قلمبند کی ہے) ہمارا دوسرا کتاب گھر ہے اور بک ایجنسی کا تصور بھی اسی فرم کی دین ہے۔ البتہ نور محمدی پریس سے قبل متعدد چھاپ خانوں کا سراغ ملتا ہے۔

ٹائٹل نمبر ۲ یعنی اندرونی ٹائٹل پر غلام محمد نور حنفی القادری تاجران کتب مرقوم ہے جسے پتہ چلتا ہے کہ نور محمد اور آپ کے والد محترم مسلکاً حنفی اور مشرباً قادری تھے حالانکہ بر بنائے قرابت ہمارا خاندان کتاب خاندان کو سلسلہ عالیہ سہروردیہ کے ساتھ منسلک کرتے تھے۔

اس ضخیم کتاب پر جملہ حقوق بحق پبلشر کاپی رائٹ نمبر ۱۹۱۴ء محفوظ ہیں، بھی رقم ہے۔ یہ مطبوعات میں سے تاجران موصوف کی واحد کتاب ہے جس کے آخری صفحہ پر

اجازت نامہ چھپائی ازقلم مصنف بزبان اُردو یوں درج ہے۔

''کتاب ہذا مغازی النبی کشمیری کے کل حقوق جومطابق قانون کاپی
رائٹ ایکٹ نمبر۳ فروری ۱۹۱۴ء میرے ساتھ وابستہ تھے، وہ میں غلام محمد نور
محمد تاجران کتب شائع کنندہ گان کتاب ہذا کے نام دوامی طرز منتقل کرتا ہوں۔
(تا کہ صرف اُن ہی کواس کتاب کے چھپوانے کا حق حاصل رہے۔)

مورخہ اوّل پوہ ۱۹۸۵ء بکرمی
راقم محمد اسماعیل بقلم خود

حضرت ناؔمی نے باریک فارسی قلم سے یہ اُردو دیدہ زیب عبارت لکھی ہے اور ہجری یا عیسوی سنہ یا ماہ تحریر نہیں کیا ہے۔ یہ فرم اتنی شہرت یافتہ تھی کہ بعض لوگ ازخود اس کی مطبوعات کی ڈپلکیٹ شائع کرتے تھے چنانچہ احتیاط کے نام سے یہ نوٹ ٹائٹل نمبر۲ پر درج ہے۔

''کتاب خریدنے کے وقت نقلی وجعلی کتابوں سے بچنے کے لئے
سرورق پر چھاپ ''غلام محمد نور محمد'' دیکھ لیا کریں۔''

ٹائٹل نمبر۱ کے صفحہ نمبر دوم پر یہ اعلان واضح ہے۔

''چونکہ کشمیر سرینگر میں ہمارا سب سے بڑا مشہور ومعروف اسلامی
کتب خانہ ۱۹۰۰ء سے جاری ہے، جس میں تمام علوم وفنون کی کتابوں کا
کافی ذخیرہ موجود رہتا ہے۔ آگے قرآن شریف، فضائل پنج سورہ وغیرہ کے
تذکرہ کے بعد درج ہے۔ مطابع ہند (یہاں برصغیر ہندو پاک مراد ہے)
کی مطبوعات کا کافی سٹاک موجود ہے۔ علوم جدیدہ مروجہ تعلیم، انگریزی،
اُردو، فارسی، عربی، ریاضی وغیرہ وغیرہ بھی ہر وقت مل سکتے ہیں۔''

جیسا کہ اوپر مذکور ہوا کہ ابھی ادارہ کو کل بیس سال گزرے تھے مگر نور محمد مرحوم فخراً لکھتے ہیں:۔

"یہ کتب خانہ بفضل ایزدی اپنی دیانت کے باعث روز افزوں
ترقی پر ہے۔ اطراف وجوانب میں اس کی کتب کی صداقت وایمانداری کا
ڈنکا بج رہا ہے۔ اسی شہرت کے باعث تمام علماء، فضلاء، مولویان، مفتیان،
پیرزادگان اس اسلامی کتب خانہ پر نظر شفقت رکھتے ہیں۔ الخ"

الغرض حضرت سید المرسلین امام الاوّلین والآخرین ﷺ کی یہ منظوم سیرت خواجہ نور محمد نے انتہائی اہتمام کے ساتھ لاہور سے بذریعہ نور الحق لاہوری شائع کر کے عظیم کارنامہ انجام دیا۔ بعد میں ضخیم فارسی کتابوں خاص کر دستور السالکین شرح قصیدہ وردالمریدین فارسی تصنیف حضرت علامہ شیخ بابا داوٗد خاکیؒ تاریخ اعظمیٰ، مصنفہ خواجہ محمد اعظم دیدمری (فارسی) وغیرہ کتابوں کی اشاعت کا معرکہ سر کیا۔

عالمی شہرت کے صحیفۂ درود شریف یعنی دلائل الخیرات تصنیف حضرت امام ابوعبداللہ محمد بن سلیمان جزولی الشاذلی (مراکش) عربی اور بترجمۂ کشمیری از قلم حضرت پیر طریقت مولانا میر سید محمد عبداللہ شاہ صاحب قادری المنطقی سابق سجادہ نشین درگاہ غوثیہ عالی کدل و متولی مسجد جامع کشمیر شائع کرنے کی سعادت بھی حاصل کی اور نور صاحب کی وفاتِ حسرت آیات تک یہ سلسلہ جاری وساری رہا۔ یہ سب سیرت نبوی موسوم بہ مغازی النبی ﷺ کے ساتھ اظہار عقیدت کا ثمرہ تھا۔

مغازی النبی ﷺ کے آخر میں تین قطعاتِ تاریخ تکمیل درج ہیں۔ شعرائے قطعات کے اسماء یوں ہیں۔

۱۔ حضرت پیر عبدالقادر درویش قادریؒ خواجہ بازار سرینگر
۲۔ غلام حسین صاحب خادم درگاہ حضرتبل (جن کی استدعا پر حضرت ناؔمی نے یہ کتاب تصنیف کی ہے۔)
۳۔ محمد سیف الدین مرحوم ومغفور

اس کے علاوہ کتاب کے آخری صفحہ پر قطعہ نعتیہ و تاریخ انطباع مغازی النبی ﷺ نتیجہ طبع پیر عبدالقادر صاحب آثم (ملارٹی) پڑھنے اور سننے کے لائق ہے۔

جان زندہ از خیالِ جمالِ محمد است — دل تشنۂ زُلالِ مقالِ محمد است
صیتِ کمالِ او ہمہ گیتی گرفتہ است — از فرش تا بہ عرش جلالِ محمد است
بی سایہ سایہ گسترِ ذرّاتِ کائنات — ظلِ خدائی خلقِ نہالِ محمد است
درشرق وغرب ذکرِ جمیلش ھمے روَد — یعنی کہ ہر دلے بخیالِ محمد است
نامی کہ ذاتِ او بس گرامی است — فخرش ہمیں کہ شارحِ حالِ محمد است
خوش نظم دلپذیر مغازی النبی نمود — کائینۂ ظہور و وصالِ محمد است
طبعش نمود نورِ محمد بحسنِ سعی — کہ نورِ رحیم و پورِ بلال محمد است
ز اخلاص کرد اشاعت ایں نسخہ قبول — انعامش از محمد آلِ محمد است

آثم رقم نمود ہے سالِ انطباع
مرأت حال پاک کمالِ محمد است

ساتھ ہی عذرِ مصنف از قلم ناظم محمد اسماعیل نامیؒ ۱۹ اشعار بزبان فارسی پر مشتمل ہے۔

حمدِ ذاتی کہ مالکِ جان است — مستعان و رحیم و رحمان است
گشت مطبوع ایں کتاب متین — کہ بنعتِ نبیش عنوان است
نعت گفتن بلی زِ من نمے آید — کان وراثت ازانِ حسانؓ است
نعت شاہی کہ ناید از ملکوت — بشری راچہ جای امکان است
لیکن این چند رشتہ ام در دست — بتمنایِ ماہِ کنعان است
قاصرم کز تحائفِ آداب — ناید از من چنانکہ شایان است
گرچہ از زیورِ معانی نغز — پیشِ ارباب نقلِ عریان است
عذر تقصیر طبع موزونم — از سیاقِ سخن نمایان است

این سخن راست است و ز اہلِ سخن
داند آنکس کہ او سخندان است

کہ رہِ نظم بود بر دمِ تیغ
بردمِ تیغ رہ نہ آسان است

در ادا کردن بیانِ حدیث
اوہم خامہ تنگ میدان است

نامہ ام نامزد بنامِ نبیؐ است
زان بہ تعظیمِ نام خواہان است

صفحہ در صفحہ رشکِ گلزار است
سطر بر سطر سنبلستان است

در دل و دیدۂ اولوالابصار
روضۂ از ریاضِ رضوان است

داستان ہای تُرہ ہات مخوان
کان متاع از دکانِ شیخان است

رزمِ سراب و سام و رستم و زال
کذب ولغو و دروغ و بہتان است

نیست گلزیز و مہرو ماہ ایں نظم
ایں کتاب حدیث و قرآن است

درس ایں داستان بمذہبِ عشق
فرضِ ہر مومن و مسلمان است

روزِ دیوانِ حشر نامیؔ را
زین وسیلہ امیدِ غفران است

........OO........

✍……جوہر قدوسی
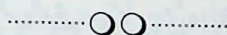
کشمیر کا بابائے اشاعت وطباعت

(خواجہ نور محمد)

کشمیر میں انیسویں صدی کے آخری عشرہ سے لے کر بیسویں صدی کے نصف اول تک کتاب کلچر کو فروغ دینے میں جس اشاعتی ادارے نے سب سے زیادہ خدمات انجام دی ہیں، وہ وہی ادارہ ہے جس کو دنیا ''غلام محمد نور محمد تاجرانِ کتب'' کے نام سے جانتی ہے۔ کشمیر میں چند ہی اداروں کا نام لیا جا سکتا ہے، جو اس زمانے میں مذہبی اور ادبی کتابوں کی طباعت اور اشاعت کا کام بحسن وخوبی انجام دے رہے تھے۔ ان میں جو اشاعتی ادارہ سرِ فہرست نظر آتا ہے، وہ ''غلام محمد نور محمد تاجرانِ کتب'' ہے۔ اس پبلشنگ ہاؤس کا اہم مقصد دینی، ادبی، تعلیمی اور تدریسی کتابوں کو کم دام میں قارئین کو دستیاب کرانا تھا۔ اس ادارے کی اہم مطبوعات میں کتابوں کی درجہ بندی کچھ یوں کی جا سکتی ہے:

(۱) دینی کتب، قرآنِ مجید مع ترجمہ، احادیث اور ادِفتحیہ مع ترجمہ، فقہ، بالخصوص کشمیری زبان میں شرع محمدی ﷺ وغیرہ۔ (۲) ادبی کتب، سوانح، کلیات، مجموعہ ہائے کلام، تاریخ، تاریخِ ادب وغیرہ۔ (۳) تدریسی کتب، لغات وغیرہ۔

''غلام محمد نور محمد تاجرانِ کتب'' نامی کتب خانے کی بنیاد نور محمد کے والد غلام محمد نے ۱۸۹۰ء میں ڈالی۔ ابتداء میں اگر چہ اس کی سرگرمیاں محدود تھیں، لیکن جب نور محمد نے ادارے

کی ذمہ داریاں سنبھالیں تو کتب فروشی کے ساتھ ساتھ کتابوں کی اشاعت وطباعت کا کام بھی بڑے پیمانے پر شروع کیا۔ چنانچہ قلیل عرصے ہی میں ''غلام محمد نور محمد تاجرانِ کتب'' کی شہرت دور دور تک پھیل گئی اور بیسویں صدی کی ابتدائی دہائیوں میں اس کا شمار نہ صرف ریاست بلکہ غیر منقسم ہندوستان کے بڑے پبلشنگ اداروں میں ہونے لگا۔ بعد میں کچھ لوگ جو یہ کہنے لگے کہ ''غلام محمد نور محمد تاجرانِ کتب'' کی حیثیت کشمیر میں وہی ہے، جو لکھنو میں منشی نول کشور کی ہے۔ اس ادارے نے دن رات محنت کر کے کشمیر میں پبلشنگ انڈسٹری کو ایک نئی جہت بخشی۔

نور محمد اور ان کے والد کا کتب فروشی کا کاروبار اس زمانے میں شروع ہوا جب کشمیر میں ظلمت وجہالت اور مطلق العنانیت کا منحوس دور جاری تھا۔ ایک طرف جابرانہ ہتھکنڈوں نے عام انسانوں کی زندگی اجیرن بنادی تھی اور دوسری طرف غربت وافلاس کے سبب عام آدمی کی رسائی تعلیم وتعلم اور مدرسہ ومکتب تک نہ ہونے کے برابر تھی۔ پڑھے لکھے لوگوں کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر تھی اور کتابیں خرید کر پڑھنے کی سکت ان میں بھی بہت کم تھی۔ ایسے نامساعد اور غیر موافق حالات میں کتابوں کی فروخت، اشاعت اور طباعت کا کام شروع کرنا مثالی جرأت وہمت کا متقاضی تھا۔ غلام محمد مرحوم کے وژن اور وجدانی بصیرت کی داد دیجیے کہ انہوں نے اس حوصلہ شکن ماحول میں ہمت ومردانگی کا مظاہرہ کیا اور تمام تر رکاوٹوں کے باوجود شہر سرینگر کے وسط میں اپنا کاروبار شروع کیا اور اس کے لیے کتابوں کی تجارت کا انتخاب کیا۔ یہ وہ دور تھا جب کشمیر میں اخبارات وکتب ورسائل کی اشاعت وطباعت کا دور دور تک کوئی نشان نہ تھا اور جو بھی اخبارات اور کتابیں دستیاب ہوتی تھیں، وہ لاہور، امرتسر، لکھنؤ اور دیگر شہروں سے آتی تھیں۔ رسل ورسائل اور مواصلاتی سہولیات بھی سست رفتاری سے دوچار تھیں اور کشمیر میں طباعتی مراکز یکسر نایاب تھے۔ ان مشکلات میں علم وادب کی شمع روشن کرنا کسی بھی فرد کے لیے کارے دارد والا معاملہ تھا۔ غلام محمد مرحوم اور ان کے صاحبزادے نور محمد مرحوم نے بڑی حد تک ان مسائل ومشکلات کا اندازہ کرلیا ہوگا جن کا سامنا وہ کتابوں کی تجارت کے ضمن میں کرنے والے

تھے۔ چنانچہ اپنی فرم کا دائرہ کار انیسویں صدی کی آخری دہائی میں بڑھاتے گئے بلکہ ایک مختصر سی مدت میں اس کو کشمیر کا سب سے بڑا کتب خانہ بنانے میں کامیاب ہوئے۔ نور محمد کے فرزند محمد اقبال ظفر نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ ان کے والد کا بنیادی مقصد کتابوں کی تجارت سے صرف دولت کمانا نہیں بلکہ علم وادب اور دین و مذہب کی خدمت کرنا تھا۔ وہ لکھتے ہیں۔:

> ''نور محمد کا مقصد صرف روپیہ کمانا نہ تھا بلکہ وہ علم وادب کی خدمت اور اسے فروغ دینا عین عبادت سمجھتے تھے۔ نور محمد نے اس وقت تاریخ ساز رول ادا کیا جب یہاں پرنٹ میڈیا نہ الیکٹرانک میڈیا، نہ کلچرل اکادمی، نہ یونیورسٹی آف کشمیر کا کہیں وجود تھا۔ نور محمد نے ۱۹۲۲ء میں سب سے پہلے یہاں کے سر کردہ نعت گو شاعروں کا مجموعہ ''گلشنِ نعت کشمیری'' لاہور سے شائع کیا۔ اس کی اشاعت آج تک جاری ہے۔ ۱۹۲۴ء سے ۱۹۲۹ء تک مرحوم نے بے شمار مثنویاں اور جنگ نامے شائع کیے۔ مصنفوں، علمائے دین، فقیروں، علم دوستوں اور ادب نوازوں سے دوستانہ مراسم قائم کر کے ان سے یہاں کے اولیائے کرام، بزرگانِ دین کے کلام، ریشی نامے اور اوراد و وظائف، درود و سلام اور سوانح عمریاں جیسی تصنیفات کے علاوہ حضرت شیخ العالم، ثناء اللہ کریری، مقبول شاہ کرالہ واری، وہاب پرے، ولی اللہ متو، محمود گامی اور بہت سارے مثنوی نگاروں کی مثنویات و رباعیات، قصائد اور کشمیری ونہ ون وغیرہ شائع کیے۔ مرثیہ کے قلمی نسخے جو کشمیری کاغذ (برزہ کاغذ یا بھوج پتر) پر لکھے ہوئے تھے، تو اپنی انتھک کوششوں سے جمع کر کے از خود کتابی صورت میں منظر عام پر لایا۔
>
> (روزنامہ کشمیر عظمیٰ ۹ جون ۲۰۱۴ء ص ۶)

غلام محمد نور محمد تاجرانِ کتب کا ایک اور کارنامہ یہ ہے کہ اس ادارے نے ۱۹۵۵ء میں اپنا پرنٹنگ پریس قائم کیا، جو کسی کشمیری مسلمان کا پہلا ایسا قدم تھا۔ اس مطبع کی مدد سے مذکورہ

پبلشنگ ادارے نے کشمیر کے کم وبیش تمام معروف ومقبول شعرا کا کلام کتابی صورت میں شائع کر کے عام لوگوں کے لیے دستیاب رکھا۔ اُن میں مہجور و آزاد کے علاوہ پیر عزیز اللہ حقانی، میر غلام رسول نازکی، دینا ناتھ نادم، غلام نبی فراق، رحمٰن راہی، فارق بڈ گامی، فطرت گیلانی، تنہا انصاری، مرزا عارف، پتامبر ناتھ درفانی اور دیگر شعرا شامل ہیں۔

ادبی وشعری فن پاروں کے علاوہ نور محمد مرحوم نے دینی کتب کی اشاعت کو بھی بڑی اہمیت دی اور نہایت اہتمام سے کئی کتابیں پہلی بار شائع کر کے منظر عام پر لائیں۔ مثلاً ۱۹۴۸ء میں امیر کبیر میر سید علی ہمدانیؒ کے شہرآفاق ''اورادِ فتحیہ'' کا ترجمہ مع تفسیر پہلی بار منظر عام پر لایا۔ اسی سال انہوں نے ''کبریتِ احمر'' کا اصل متن اور ترجمہ شائع کیا۔ ۱۹۶۰ء میں اس ادارے نے پہلی بار قرآن مجید مع ترجمہ شائع کیا۔ اس کے علاوہ دیگر مذہبی شاہکار مثلاً دستور السالکین، چہل اسرار، شرع محمد ﷺ وغیرہ بھی اسی ادارے نے نہایت اہتمام سے شائع کر کے عوام الناس کے لئے دستیاب رکھیں۔ کشمیر کی تاریخ وثقافت سے متعلق بعض شاہکار مثلاً واقعاتِ کشمیر، تاریخِ حسن وغیرہ بھی اسی ادارے کے اہتمام سے پہلی بار منظرِ عام پر آئیں۔

الغرض مذہب ہو یا ادب، تاریخ ہو یا ثقافت، شاعری ہو یا نثر، داستانیں ہوں یا مثنویاں، درسیات ہوں یا دینیات ''غلام محمد نور محمد تاجرانِ کتب'' ادارے نے ایک عہد ساز کارنامہ انجام دے کر کتابوں کی تصنیف وتالیف، اشاعت وطباعت اور تقسیم کاری کو ایک بھر پور عوامی تحریک کی شکل دے کر کشمیر میں علم و دانش، شعر وادب اور فکر ونظر کے لاتعداد چراغ روشن کیے، جن کی روشنی میں کشمیریوں کی کئی نسلوں نے اپنی راہیں روشن کی۔ نور محمد کی ۵/مارچ ۱۹۶۵ء کو رحلت سے کشمیر میں کتاب کلچر کے فروغ کو بڑا دھچکا لگا اور ان کے ادارے کے تانے بانے بعد میں بکھر کے رہ گئے، جس کا ایک ثبوت یہ ہے کہ خالصتاً کتابوں کی اشاعت وطباعت سے وابستہ یہ ادارہ اسٹیشنری کی خرید وفروخت تک محدود رہ گیا۔

...........○○...........

✍......مرزا بشیر احمد شاکر

علم وادب کا شیدائی......نور محمد

کتابوں کی یہ دنیا بھی ایک نرالی دُنیا ہے۔ ابتدائے آفرینش سے ہی بنی نوع انسان کو علم کی اہمیت وافادیت سے آگاہ کیا گیا ہے اور اس کے حصول کے لئے ترغیب دی گئی ہے۔ بہت سارے انبیاء کرام پر کتابیں نازل کی گئی ہیں۔ اگر چہ ان میں سے چند ہی کتابوں کے نام منصۂ شہود پر آئے ہیں۔ مثلاً انجیل، زبور، تورات اور آخری نبی اور پیغمبر یعنی جناب محمد مُصطفٰے ﷺ پر آخری آسمانی صحیفہ یعنی قرآن مجید نازل ہوا۔ کتابوں کے بارے میں عالمی شہرت یافتہ اہل قلم اور دانشور حضرات کے مقولات اور فرمودات زیبِ قرطاس بنے ہوئے ہیں۔ جن میں سے چند ایک یوں درج کئے جاتے ہیں۔ ایک یہودی کہاوت ہے کہ:

''تمہارے بچے تمہیں یاد رکھیں تو ایک جھونپڑی بناؤ۔ اگر تم چاہتے ہو کہ تمہارے پوتے، پوتیاں تمہیں یاد کریں تو پتھروں کا ایک مکان تعمیر کرو۔ اگر تم چاہتے ہو کہ تمہارے پڑ پوتے پڑ پوتیاں تمہیں یاد کریں تو فصیلوں والا ایک شہر آباد کرو۔ اگر تم چاہتے ہو کہ آنے والی ساری نسلیں تمہیں یاد کریں تو ایک کتاب لکھو۔''

''جس دن سے مجھے کتابوں سے جُدا کر دیا جائے وہ میرا آخری دن ہوگا۔'' (شیکسپیئر)

''میری تمنا ہے کہ مرنے کے بعد میرا بس چلے تو اپنی قبر میں کتابیں ہی کتابیں رکھوں تا کہ میں انہیں پڑھا کروں۔'' (مولانا مودودیؒ)

''یہ دُنیا کتنی پُر اسرار دُنیا ہے اس میں وسعت بھی ہے اور حیرت انگیز گہرائیاں بھی۔ یہاں بلا لحاظ مذہب وملت، رنگ ونسل، ملک وقوم، زمان ومکاں پاک روحوں سے ملاقات ہوتی ہے۔ ان روحوں کا تخلیقی کام کبھی رُکتا نہیں۔'' (آغا اشرف علی)

الغرض کتابوں کے یہ روشن مینار ہر وقت اندھیرے میں اپنی تابنا کی سے روشنی بکھیر کر اندھی راہوں کو روشن کرتے ہیں۔ ان حقائق کے پیش نظر یہ لکھنے میں کوئی ہچکچاہٹ نہیں ہے کہ جس خوش نصیب انسان کو فیاضِ ازل نے کتابیں پڑھنے، لکھنے اور ان کے چھپوانے کے شوق سے سرفراز کیا ہو وہ کس قدر قابلِ رشک اور باعثِ عزت ہے۔ ان ہی نیک بختوں اور بلند اقبال علم دوست حضرات میں سے ایک شخص پیدا ہوا ہے جس کا اسمِ گرامی نور محمد ہے۔ اگر چہ دہائیاں قبل نور محمد مرحوم ہو چکے ہیں مگر آج بھی ان کا نام علمی اور ادبی دنیا کی تاریخ میں ایک روشن ستارے کی مانند نظر آتا ہے۔ وادی کشمیر اور اس سے باہر آپ کی دکان ''غلام محمد نور محمد تاجرانِ کتب'' مہاراج گنج سرینگر نام سے آج بھی مشہور و معروف ہے۔

دراصل یہ مرحوم نور محمد کا خلوص دلِ اور علم دوستی کا جذبہ تھا کہ آپ نے اپنے زمانے میں درج بالا نام سے ایک دکان سجائی اور ایک ایسے زمانے میں یہاں کے لوگوں کو علم وادب کی چاشنی سے بہرہ وَر کیا۔ یہ زمانہ مفلسی کا زمانہ تھا آج کی طرح سائنس اور ٹیکنالوجی کا زمانہ نہیں تھا اور نہ ہی کمپیوٹر والی چھپائی کا زمانہ تھا۔ اکثر اخبارات اور کتابیں لتھو پریس پر چھپ جاتی تھیں۔ لوگوں کی قوتِ خرید بھی کم تھی۔ مگر اِس مذہب اور علم وادب کے شیدائی یعنی نور محمد نے اپنے جذبہ صادق اور ہمتِ مردانہ سے کام لے کر علم کی روشنی کو یہاں ہر سو پھیلایا۔ آپ غیر منقسم ہندوستان کے راولپنڈی اور لاہور جیسے علم وادب کے گہواروں سے کتابیں چھاپ کر لاتے تھے۔ یہ کتابیں اکثر و بیشتر کشمیری صوفی شعرا کے کلام پر مشتمل ہوا کرتی تھیں۔ مثلاً کلام شمس فقیر، کلام نعمہ صاحب، کلام احمد بٹواری، کلام سوچھ کرال، کلام رسول میر، شاہ قلندر شاہ غفور وغیرہ۔ اس کے علاوہ جنگ ناموں اور داستان حسن وعشق وغیرہ پر مشتمل کتابیں چھاپتے تھے۔

جیسے داستان امیر حمزہؓ، ہی مال ناگرائے، قصۂ یوسف زُلیخا، شیرین فرہاد وغیرہ۔

لوگ ان کتابوں کے عاشق تھے اور یہ کتابیں پڑھ کر دوسروں کو بھی سُنا کر ایک پُر لطف زندگی گزارتے تھے۔ مرحوم نور محمد بہت سارے لوگوں کو یہ کتابیں معمولی کرایہ پر بھی فراہم کرتے تھے اور اس طرح یہ نور رفتہ رفتہ کشمیر کے شہرو دیہات میں پھیلتا گیا۔ کسی نے بجا فرمایا ہے کہ۔

ہرگز نمیرد آں کہ دِلش زندہ شُد بہ عشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

آہستہ آہستہ غلام محمد نور محمد کی دکان اہلِ علم واہلِ دل حضرات کے لئے ایک نشست گاہ بن گئی۔ یہاں بہت سارے حضرات جمع ہو جاتے تھے اور علم وادب کی پُر بہار محفلیں منعقد ہوتی تھیں۔ تاریخی شواہد کے مطابق یہاں کشمیر کے انقلابی شاعر عبد الاحد آزاد آتے تھے۔ شاعرِ کشمیر مہجور بھی رونق افروز ہوتے تھے۔ صوفی شاعر مرحوم عبدالاحد زرگر بھی اس دکان پر آتے تھے۔ اسی طرح بعد میں آنے والوں میں معتبر شعرا رحمٰن راہی، غلام نبی فراق، دلسوز، غلام رسول کاوسہ اور فاضل کشمیری بھی شاملِ احباب ہوتے گئے اور کتابوں کی اس دکان نے بھی ایک تاریخی اہمیت پائی۔ اسی طرح بعد میں نشست لال چوک میں پرانے سنیما گھر پلیڈیم گلی کے نزدیک بھی مرحوم غلام قادر صاحب المعروف لورِکھار کی دکان پر سجتی تھی اور وہاں شعرا اور ادیب حضرات بیٹھ کر علمی مباحث چھیڑا کرتے تھے جن میں قابل ذکر پروفیسر غلام محی الدین حاجنی، میر غلام رسول نازکی، غلام حسن بیگ عارف، پروفیسر شیخ محمد اقبال صاحب وغیرہ ہوتے تھے مگر زمانے کی کج رفتاری کا کیا کیجئے اب اس قسم کی محفلیں عنقا ہوئی ہیں اور کتابوں ہی میں ان کا تذکرہ ملتا ہے۔ ان یارانِ محفل میں سے بہت سارے زیرِ زمین آسودہ ہیں اور اُن کی پُر لطف یادیں دِلوں کو تڑپاتی ہیں بقولِ غالب:

سب کہاں کچھ لالہ وگل میں نمایاں ہوگئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہوگئیں

..........○○..........

✍......اسد اللہ اسدؔ

منظوم خراجِ عقیدت

ہائے کیا کہنا تجارتِ کے اندر اوصاف کا
فکر مند تھا اے اسد وہ ورثہ اسلاف کا
کتب کا تاجر مگر تھا درد میں ڈوبا ہوا
نور محمد مُرغِ عنقا تھا ادب کے قاف کا

☆

نول کشور زمانے کا ہمارا نور محمد تھا
جسم سے جو چھریرا تھا مگر کیا قامت و قد تھا
کتابت کی طباعت کا اُسے تھا مشغلہ پیارا
اَسدؔ، تاجر تو تھا لیکن ادب سے رشتہ بے حد تھا

............OO............

✍……رشید کانپوری

غلام محمد نور محمد تاجران کتب کا اشاعتی سلسلہ

مہاراج گنج سری نگر شہر کا قدیم ترین بازار ہے۔اس بازار میں ایک تاریخی کتاب گھر ۱۸۹۰ء میں قائم ہوا۔مہاراجہ کی حکمرانی کے دوران ریاست جموں وکشمیر کے ایک تیس سالہ نوجوان غلام محمد بٹ نے کشمیریوں کوتعلیم دینے کا خواب دیکھا اور ایک کتب خانہ ''غلام محمد نور محمد تاجرانِ کتب'' کے نام سے قائم کیا۔غلام محمد پاندان نوہٹہ سرینگر کے رہنے والے تھے۔یہاں پر یہ بات قابل ذکر ہے کہ ان دنوں کشمیری مسلمانوں کوتعلیم حاصل کرنے کے حقوق حاصل نہیں تھے۔ابتدا میں اس دکان سے سنسکرت، فارسی، کشمیری اور عربی کتابیں بیچی جاتی تھیں۔یہ کتابیں غلام محمد بٹ لاہور سے خرید کرلاتے تھے۔

غلام محمد بٹ نے اپنے بیٹوں کو بھی تجارت کے ساتھ منسلک کیا۔نور محمد چونکہ سب سے بڑے فرزند تھے اسلئے ان کو اسی پبلشنگ ہاوس سے وابستہ کیا۔نور محمد کشمیری شعروادب کے زبردست دلدادہ تھے اسی وجہ سے انہوں زیادہ تر کتابیں کشمیری زبان میں شایع کیں۔

نور محمد خود بھی اہلِ قلم تھے اور آزاد تخلص کرتے تھے۔انہوں نے کشمیری زبان میں بقولِ ظفر محمد اقبال فرزندِ نور محمد درجنوں کتابیں لکھی ہیں۔جن میں ۱۹۵۲ء میں ان کی لکھی ہوئی

''تاریخِ کشمیر'' کی روزانہ ڈائری، ترانہ مسلم وغیرہ شامل ہیں۔ایک صدی سے زیادہ مدت سے کتابوں سے وابستہ رہنے کی وجہ سے ان کا ''بٹ'' نام بھی ''کتاب'' لفظ میں بدل گیا اور اب انہیں بٹ کے بجائے کتاب ذات سے لوگ جانتے ہیں۔

۱۹۲۲ء میں نور محمد نے کشمیری زبان کے بڑے بڑے نعت گو شعرا کا کلام جمع کر کے ''گلشن نعت'' نام کی کتاب صابر الیکٹرک پریس لاہور سے چھپوا کر اشاعت کا آغاز کیا۔اسی پریس میں ۱۹۲۳ء میں کلام لل دید اور کلام شیخ العالم کا شرح چھپوا کر شائع کیا۔

پچھلی صدی کے معروف وقد آور بزرگ وصوفی شاعر عبدالاحد زرگر کا ابتدائی کلام اور ان کی شہرہ آفاق مثنوی ''اکہ ننذن'' اور ''مولوی نامہ'' بھی نور محمد نے لاہور سے شائع کیا۔کہتے ہیں کہ نور محمد کی فرمائش پر زرگر صاحب نے گل صنوبر مثنوی لکھی جب کہ حقانی صاحب کی مثنوی ممتاز نظر اور پیر محی الدین نقشبندی لاروی کی تصنیف ''گربہ وموش'' رفیق پریس لاہور سے چھپوا کر شائع کئے۔

راقم الحروف کو متذکرہ بالا پبلشنگ ہاؤس سے شائع شدہ چھوٹی بڑی کتابوں کی جو فہرست فراہم ہوئی وہ بذیل ہے۔

فہرستِ کتب ہا شائع کردہ ''غلام محمد نور محمد تاجرانِ کتب'' مہاراج گنج سری نگر

- بیاضِ رحیم صاحب سوپوری
- بیاض محمود گامی
- ترانۂ احمد بٹ
- معہ تال وقت وسرود
- لولہ باغ
- بہارِ مدنی
- ساز وسنطور
- ترانۂ گلستانِ کشمیر
- بیاضِ نعمہ صاحب
- کلامِ احد زرگر (۱۱ حصے)
- بیاضِ احمد بٹواری
- اکہ ننذن (احد زرگر) کلاں
- بیاضِ رحمٰن پنجابی
- پیامِ آزاد (احد زرگر) (۲ حصے)

- کلام للہ عارفہ مع شرح
- کلامِ شیخ العالمؒ
- غزلیاتِ مجید میر
- بیاضِ شمس فقیر حصہ اول ودوم
- غزلیاتِ حقانی
- بہارِ گلشن کشمیر ۱۰ر حصے
- کشمیری موسیقی ۵ر حصے
- میلا دالنبیؐ
- بیاضِ رحمٰن ڈار
- غزلیاتِ شاہ غفور
- ترانۂ منصور
- غزلیاتِ وازہ محمود
- موسیقی کشمیری وفارسی (۲۸ حصے)
- ڈرامہ مصطفیٰ کمال پاشا
- لیلیٰ ومجنون
- ڈرامہ شیرین وفرہاد
- خیالِ دلسوز
- کلامِ دلسوز
- علی وانیین طوطہ
- مجموعہ معراج نامہ محمود گامی
- شاہِ عرب ۲حصے
- سروآزاد (احد زرگر) ۲ر حصے
- عشقہ پہچان (احد زرگر) ۳ر حصے
- نغمۂ یندراز (احد زرگر)
- جامِ جم (عمہ خواجہ)
- سرور عشق (عمہ خواجہ)
- رسالۂ دل (عمہ خواجہ)
- عشقہ باغ (عمہ خواجہ)
- ظہور گلشن (عمہ خواجہ)
- کلامِ الفت (عمہ خواجہ)
- پیامِ الفت (عمہ خواجہ)
- کرامات محبوب العالم
- اکہ نندن۔صمد میر ۲حصے
- کلامِ صمد میر ۶ حصے
- آبشار (صمد میر) ۳ حصے
- وہاب کھارن طوطہ
- بیاضِ رسول میر شاہ آبادی ۳حصے
- سودام چرتر (متفرقات)
- ہریش چندر
- ترانۂ عاشق
- گلبن مدینہ
- وفات نامہ (کلاں)

- قصہ ٔ شاہ بہرام
- کیشو بھگوتی
- ریشی نامہ
- کلامِ مخمور بجوابِ مہجور ۲ حصّے
- شاہ پری
- پہلی کور
- کرالہ کور
- آب وآتش
- کلام وہاب کھار
- کاشر مفتی
- پہل نامہ
- رموز عارف
- ترانۂ رنجور
- کلامِ منظور
- خاندر نامہ
- گلشنِ نعت ۵ حصّے (نعت ومناقب)
- شمائلِ نبوی کا ترجمہ یعنی شمائل شریف (کلاں)
- قصہ ٔ گل وصنوبر
- معجزاتِ حضرت محمدؐ
- کاشر سلام بحضورِ خیر الانامؐ
- دعائے صبح
- معجزۂ یمن
- گلزار مدینہ در عشق نبی صلی اللہ علیہ وسلم
- کلام شمس فقیر
- اعجازِ غریبہ
- نور نامہ
- قصص الانبیاء
- مجموعہ جنگ نامہ آنحضرتؐ مغازی النبی کلاں
- کاشر نامہ حق
- بدائع منظوم
- معراج نامہ کلاں
- کاشر ونہ ون ۶ حصّے
- کلامِ شیخ العالم ۳ حصّے
- کراماتِ غوثیہ
- گلدستۂ انوار
- گلدستۂ مناقب
- شفاعتِ حسنین
- شہادت فرزندانِ امام مسلمؑ
- مجموعہ مرثیہ وفات وشہادت حسنین کشمیری وفارسی
- محرم نامہ ۳ حصّے
- ظفر نامہ در انتقامِ یزید
- کاشر سلطانی از وہاب پوری

- قصہ حضرت خلیل الرحمٰن
- قصہ خنجرِ عشق
- روضتہ الشہداء
- کاشر مسئلہ کتاب
- کاشر پارہ عم
- کاشر ضروریاتِ دین
- کاشر عقاید
- قصہ اصحابِ کہف
- زلیخا مسکین
- زلیخا قادری
- زلیخا محمود گامی
- قصہ حضرت ایوب صابر
- قصہ تمیم انصاری
- قصہ حضرت سلطان ابراہیم ادہم
- قصہ حضرت شمعون
- قصہ زہرہ و بہرام
- قصہ بہرام گور ہشت بہشت
- قصہ کلیلہ و دمنہ
- قصہ ہارون رشید
- قصہ چندر بدن
- گلریز کلاں

- احوالِ آخرت
- قصہ شیخ منصور و شیخ صنعان
- قصہ گربہ و موش
- قصہ سوہنی ماہیوال
- مقدم نامہ
- قصہ زین العابدین
- چہار درویش
- مہر و ماہ
- کاشر الف لیلیٰ
- توبتہ النصوح
- قصہ سبا
- گریسی نامہ
- سکندر نامہ
- خدیجہ نامہ
- شیرین خسرو محمود گامی
- گلدستۂ بے نظیر
- قصہ حاتم طائی ۲ حصے
- قصہ بدر منیر
- شیرین خسرو نامہ
- گلبدن عروس چمن
- شکرریز

- گلنور وگلریز
- گل بکاؤلی
- قصۂ بہرام گل اندام
- قصۂ سلطان محمود غزنوی
- حجۃ الاسلام

نور محمد کا تذکرہ کئی مؤرخوں نے اپنی کتابوں میں درج کیا ہے جن میں محمد دین فوقؔ ''تاریخِ اقوامِ کشمیر''، عبدالحمید یزدانی ''واقعاتِ کشمیر''، جی، ایم، ڈی صوفی ''کشیر'' اور عبدالاحد آزادؔ ''کشمیری زبان اور شاعری'' میں کیا ہے۔

..........○○..........

غزلیات

رفیق راز

○
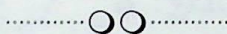
بے خواب آنکھیں اور یہ راتیں ہماریاں
ہم اور وہ روایتی اختر شماریاں

یہ پیاس اور یہ آب کی امواجِ بے صدا
یہ دھوپ اور یہ دشت کی آئینہ داریاں

بازار کی طرف وہ دریچے کھلے ہوئے
روشن دیئے وہ آنکھوں کے، وہ چاند ماریاں

اخبار تو یہ ہو نہیں سکتے کسی طرح
یہ چہرے ہیں، خدا کی علامت نگاریاں

یہ غار، یہ پہاڑ اور یہ ہولناک رات
خاموشیاں، چٹانوں کی یہ آہ و زاریاں

زانو پہ سر، وہ کان پہ خامہ، وہ خامشی
سادہ ورق پہ فکر کی وہ تاب کاریاں

اتری ہوئیں زمین کے سینے میں جا بجا
وہ آسماں کے جور و جفا کی کٹاریاں

○○

○

باندھ کر زین سے آہو کو ختن سے لے آئے
ہم بچا کر اسے کن زاغ و زغن سے لے آئے

اس خرابے میں قدم تک نہیں رکھتی ہے صبا
تازہ موسم کی خبر کون چمن سے لے آئے

گنجِ خاموشی میں یہ لعل پڑے تھے میرے
ہم کہاں ان کو بدخشان و یمن سے لے آئے

مژدۂ فتح بھی آئے گا جہاں سے تم کو
ہم تو لاشیں یہ اٹھا کر اسی رن سے لے آئے

یہ جو پہلی ہی کرن کمرے میں در آئی ہے
دھوپ بھی تھوڑی کوئی اس کے وطن سے لے آئے

ہم جس آتش میں ہیں اس وقت تمہاری ہے وہ
تجھ کو چھو کر اسے ہم تیرے بدن سے لے آئے

○○

○

کرن سی کچھ ہے مگر کس ادا سے آئی ہے
کھلا کہ دیدۂ حیرت سرا سے آئی ہے

نکالے میں نے پر و بال واقعی ہیں کیا
مجھے اڑان کی دعوت خلا سے آئی ہے

طلوعِ مہر ہوا اختتام پر شب کے
کہ ابتدا کی خبر انتہا سے آئی ہے

تمہاری یاد کی زہریلی بادِ صرصر آج
سمک سے آئی ہے یا پھر سما سے آئی ہے

وہ ذاتِ پاک تو موجود تھی یہ میرے لئے
وجود میں یہ فقط راہِ لا سے آئی ہے

کہاں سے آئی ہے یہ میرے حجرے میں دنیا
یہ پیر زال یہاں کس جگہ سے آئی ہے

یہ اس کی ذات کی خوشبو رفیق رازؔ، بتا
حدودِ فکر میں کیا باغِ لا سے آئی ہے

○○

○

موج بھی میں اور دریا بھی
شور مچاتا جھرنا بھی

آنکھ نہیں تو کچھ بھی نہیں
آنکھ ہی سے ہے تماشا بھی

شہر کے ہیں پر رکھتے ہیں
دشت سے ربط بھی، رشتہ بھی

چاند پریشاں کرتا ہے
آدھا بھی اور پورا بھی

پہرہ دشتِ سماعت پر
منہ پہ لگا ہے تالا بھی

وہ ہے مقیم، مسافر میں
میں بھی تنہا، لالہ بھی

زخم مرا رستا ہی نہیں
رازؔ سے ہے یہ گہرا بھی

○○

کلھ......ہمدم کاشمیری

○

ہم یہاں رہتے ہیں اپنی ہی نگہبانی میں
جب سے مشکل نظر آنے لگی آسانی میں
میرے ہاتھوں میں یہ کشکول تھمایا کس نے
کیسا سامان ملا بے سروسامانی میں
ہائے کیا لوگ تھے جو جوش وجنوں رکھتے تھے
اب کوئی لطف نہیں چاک گریبانی میں
کبھی اس شہر میں کچھ دیر ٹھہر کر دیکھو
زندگانی کو رواں موت کی تابانی میں
ہم نے اک عمر بسر کی ہے یہاں بھی لیکن
کچھ اضافہ نہ ہوا دشت کی ویرانی میں
عکس میرا مجھے لگتا ہے جہاں تاب ہوا
سرِ کہسار دکھائی جو دیا پانی میں
میرے اطراف ہیں کتنے ہی پرندے خاموش
ہے کوئی کاملِ فن، کارِ سلیمانی میں

○○

○

رخنہ پڑا ہے دیکھئے دیوارِ سنگ میں
آیا نہیں ہے فرق مگر رنگ ڈھنگ میں
سائے کی طرح بھیڑ میں گم ہو گیا ہے وہ
نکلا تھا صبح گھر سے جو اپنی ترنگ میں
زائد تھے اس میں جتنے بھی ذرّے ہٹا دیئے
تب جا کے مل گئی کوئی تصویر سنگ میں
آنکھوں کو اپنی چھوڑ کے نکلا وہ کس طرف
روزن بنانے آیا تھا دیوارِ سنگ میں
مسدود ہو گئے میرے دونوں ہی راستے
اٹکا ہوا ہوں دیر سے اپنی سرنگ میں
کیسی شکست ہے یہ کسی کو خبر نہیں
اب کے تو کوئی کام بھی آیا نہ جنگ میں

○○

○

مصلوب آفتاب سرِ شام کیوں ہوا
ہونا تھا حادثہ تو لبِ بام کیوں ہوا
جس پر کسی جگہ بھی میرے دستخط نہ تھے
منسوب میرے نام وہ پیغام کیوں ہوا
وہ کون تھا جو ہاتھ ملا کر نکل گیا
برپا حصارِ جسم میں کہرام کیوں ہوا
بے زار راستے ہیں، مناظر اداس ہیں
قسطوں میں میرے شہر کا نیلام کیوں ہوا
رُتبہ ملا نہ کیوں اُسے اپنوں کے درمیاں
باہر تھا خاص اگر وہ یہاں عام کیوں ہوا
پھولوں کی وادیوں کی طراوت ملی انہیں
اور قہرِ ریگ زار میرے نام کیوں ہوا
آنکھوں پہ مجھ کو اپنی بھروسہ نہیں رہا
اتنا خراب خواب کا انجام کیوں ہوا

○○

○

کام آساں ہے مگر دیکھئے دشوار بھی ہے
آگے دروازے کے رکھی ہوئی دیوار بھی ہے
دینے والے سے مجھے کوئی شکایت کیوں ہو
راہ میں دھوپ بھی، سایۂ اشجار بھی ہے
قتل کر کے جو مجھے سائے میں پھینک آیا ہے
لوگ کہتے ہیں وہی میرا طرفدار بھی ہے
تجھ کو بس اپنی ہی تصویر نظر آتی ہے
آئینے میں کہیں حیرت، کہیں زنگار بھی ہے
کیوں بھلا وقت کا نقصان کروگے پیارے
جو یہاں اب ہے تماشا وہی اُس پار بھی ہے
میرے آبا سے مجھے کیا نہ ملا ہے ہمدم
طاق میں دیکھئے مصحف بھی ہے، تلوار بھی ہے

○○

○

نہیں آسماں تری چال میں نہیں آوں گا
میں پلٹ کے اب کسی حال میں نہیں آوں گا

مری ابتدا ، مری انتہا کہیں اور ہے
میں شمارۂ مہ و سال میں نہیں آوں گا

مجھے قید کرنے کی زحمتیں نہ اٹھایئے
نہیں آوں گا ، کسی جال میں نہیں آوں گا

ابھی اک عذاب سے ہے سفر اک عذاب تک
ابھی رنگِ شامِ زوال میں نہیں آوں گا

وہی حالتیں، وہی صورتیں ہیں نگاہ میں
کسی اور صورتِ حال میں نہیں آوں گا

میں خیال و خواب حصار سے بھی نکل چکا
سو کسی کے خواب و خیال میں نہیں آوں گا

نہ ہو بدگماں مری داد خواہی ہجر سے
مری جان میں شوقِ وصال میں نہیں آوں گا

○○

○

کہہ دیا تھا بس یونہی دریا سے پانی کے لئے
اب تلک موجیں تڑپتی ہیں روانی کے لئے

لگ گئے رنگِ ہنر سب تیری ہی تصویر میں
پھر کوئی صورت نہ نکلی نقشِ ثانی کے لئے

سوچتا ہوں میں بھی دیکھوں دل کے آئینے میں اب
کتنی گنجائش ہے عکسِ رائیگانی کے لئے

اب کوئی پوچھے تو کیا بتلایئے جاتے ہوئے
ہم نے تو کچھ بھی نہیں چھوڑا نشانی کے لئے

سامنے اس شعلہ رو کے جل سکے کس کا چراغ
چاند سورج بھی ہیں جس کی پاسبانی کے لئے

○○

لکھے......احمد محفوظ

○

اب دل میں یوں تو خواہشِ دیدار بھی نہیں
لیکن وہ سامنے ہو تو انکار بھی نہیں

خوش ہم بھی تھے بہت کہ چلو رات کٹ گئی
دیکھا جو اُٹھ کے صبح کے آثار بھی نہیں

وہ پیاس گھر بنے تھے جو دریا کی سطح پر
سنتے ہیں اب وہاں کوئی دیوار بھی نہیں

میں نے ہی روک رکھی ہے خود راہ نیند کی
آنکھوں کو ورنہ خواب سے انکار بھی نہیں

وہ خواب روشنی ہے کہیں سے در آئے گی
کیا ہے یہاں جو روزنِ دیوار بھی نہیں

یوں تو ہے لاکھ اہلِ ہوس کی ہماہمی
گر ہم نہیں تو آپ کی سرکار بھی نہیں

○○

○

کسی سے کیا کہیں سنیں اگر غبار ہو گئے
ہمیں ہوا کی زد میں تھے، ہمیں شکار ہو گئے

عزیز کیوں نہ جاں سے ہو شکستِ آئینہ ہمیں
وہاں تو ایک عکس تھا یہاں ہزار ہو گئے

سنو کہ اس نواح سے ابھی خبر یہ آئی ہے
حصارِ غم میں جو بھی تھے وہ خود حصار ہو گئے

یہاں جو دل میں داغ تھا وہی تو اک چراغ تھا
وہ رات ایسا گل ہوا کہ سوگوار ہو گئے

ہمیں تو ایک عمر سے پڑی ہے اپنی جان کی
ابھی جو ساحلوں پہ تھے کہاں سے پار ہو گئے

○○

شفق سوپوری

○

خس و خاشاکِ بدن شامِ قضا سے روشن
شمعِ انفاس ہو کیوں موجِ ہوا سے روشن
دشت میں دور کہیں ، دور سیہ ٹیلوں پر
ہیں مرے خواب کسی کے کفِ پا سے روشن
ورنہ کس طرح مری راکھ منور ہوتی
کوئی چنگاری تو ہے اس میں ہوا سے روشن
کس طرح خود سے جل اُٹھے ہیں یہ لفظوں کے چراغ
صفحۂ نطق ہوا کس کی نوا سے روشن
جان اس کو بھی غنیمت کہ بزرگوں کے طفیل
راستے شہر کے ہیں اب بھی ذرا سے روشن
میری راتوں میں جلا شمع مناجاتوں کی
میری صبحوں کو بنا حرفِ دعا سے روشن

○○

○

وجود دشت و بیاباں کی خاک تھا میرا
یہ بات تھی کہ ضمیر اتنا پاک تھا میرا
فسانہ جس کا ہے معلوم اس کو ہے لہجہ
بیاں کے وقت کہاں درد ناک تھا میرا
چکایا قرض فلک کا فروخت کر کے جسے
زمیں سے آخری وہ انسلاک تھا میرا
ذرا سا ہوش جو آیا تو دیکھتا کیا ہوں
شکستہ ہاتھ ، گریباں بھی چاک تھا میرا
وہ میرے دوست تھے جن کو گلے لگاتے وقت
سناں سے چھلنی دلِ پُر تپاک تھا میرا
جہاں کسی میں نہ ہمت تھی سر اُٹھانے کی
اک ایسے ملک میں لشکر ہلاک تھا میرا

○○

○

ہم نے برسرِ آتشِ پیکر رقص کیا
سائے نے پسِ دیوار و در رقص کیا
ہم نے جنوں میں ساری رسمیں توڑی ہیں
ہم نے گلوں کے مرجھانے پر رقص کیا
ہم نے آگ لگا دی سارے خیموں میں
ہم نے جرس کو ساز بنا کر رقص کیا
کیا جانے وہ نغمہ تھا یا نوحہ تھا
ہم نے ساری رات برابر رقص کیا
ہم نے پیار سے خنجر رکھے ہونٹوں پر
ہم نے فرشِ گل کے اوپر رقص کیا
شمع، دھواں، شعلہ، پروانہ اور محفل
تیری خاطر منظر منظر رقص کیا

○○

○

سفید اسپ کا شب میں عجب مقدر تھا
عقب میں فوجِ عدو، سامنے سمندر تھا
میں ساری رات مچھیروں کے گیت سنتا رہا
اگرچہ شور ہوا کا بھی ساحلوں پر تھا
وہ اک پرانے زمانے کا قلعہ تھا جس پر
حصار ڈالے ہوئے اب بھی میرا لشکر تھا
فصیلِ خواب کے گمنام گوشے سے کل شب
میں گر گیا تو ترے راستے کا پتھر تھا
انا کے آئینے میں اپنے ٹوٹ جانے کا
میں خود ہی دیکھنے والا تھا، خود ہی منظر تھا
یہاں بھی ریت کی دیوار اٹھا دی لوگوں نے
مرے مکاں کا وہ ٹوٹا دریچہ ہی در تھا

○○

○

گلی گلی سے ہر اک درد سے چھنتے سناٹے
یہ کس کا شہر ہے کچھ بول گونگے سناٹے
یہ کس کی چیخ نے توڑا طلسمِ خاموشی
لہو لہو ہے ترا جسم کیسے سناٹے
قبا اجالوں کی جب تار تار ہونے لگی
اندھیری رات چلی آئی اوڑھے سناٹے
چلو کہ پیار کی شمعیں جلائیں مل جل کر
مہیب ہونے لگے نفرتوں کے سناٹے
امیر شہر بتا ، تو ہی کچھ بتا ، کس نے
ہر اک غریب کے چہرے پہ لکھے سناٹے
نویدِ صبح سمیٹے ہوئے ہیں دامن میں
یہ کوہ و دشت و بیاباں پہ پھیلے سناٹے
بتائیں کیا تمہیں کامل عذابِ تیرہ شبی
ہماری آنکھوں نے دیکھے ہیں کتنے سناٹے

○○

○

ہر کس و ناکس کو دنیا آئینہ دکھلائے گی
اپنا چہرہ دیکھنے سے خود مگر گھبرائے گی
کر دیا جائے گا پہلے چور زخموں سے بدن
سامنے پھر صبر کی پوشاک لائی جائے گی
خود ہی دنیا دے گی اعزاز و مناصب اور پھر
مجھ پہ یہ تنقید کے شعلے بھی خود برسائے گی
بخت کا اپنے بھی مطلع صاف ہوگا ایک دن
دیکھنا ہے دھند محرومی کی کب تک چھائے گی
میں کہ اخلاص و محبت کا علمبردار ہوں
دھوپ نفرت کی مرے سر تک نہ ہرگز آئے گی
ہے وفا کے دم سے کامل بے وفائی کا وجود
یہ نہ ہو پھر اس کی خود اوقات کیا رہ جائے گی

○○

○

ہم نے برسرِ آتشِ پیکر رقص کیا
سائے نے پسِ دیوار و در رقص کیا
ہم نے جنوں میں ساری رسمیں توڑی ہیں
ہم نے گلوں کے مرجھانے پر رقص کیا
ہم نے آگ لگادی سارے خیموں میں
ہم نے جرس کو ساز بنا کر رقص کیا
کیا جانے وہ نغمہ تھا یا نوحہ تھا
ہم نے ساری رات برابر رقص کیا
ہم نے پیار سے خنجر رکھے ہونٹوں پر
ہم نے فرشِ گل کے اوپر رقص کیا
شمع، دھواں، شعلہ، پروانہ اور محفل
تیری خاطر منظر منظر رقص کیا

○○

○

سفید اسپ کا شب میں عجب مقدر تھا
عقب میں فوجِ عدو، سامنے سمندر تھا
میں ساری رات مچھیروں کے گیت سنتا رہا
اگرچہ شور ہوا کا بھی ساحلوں پر تھا
وہ اک پرانے زمانے کا قلعہ تھا جس پر
حصار ڈالے ہوئے اب بھی میرا لشکر تھا
فصیلِ خواب کے گمنام گوشے سے کل شب
میں گر گیا تو ترے راستے کا پتھر تھا
انا کے آئینے میں اپنے ٹوٹ جانے کا
میں خود ہی دیکھنے والا تھا، خود ہی منظر تھا
یہاں بھی ریت کی دیوار اٹھادی لوگوں نے
مرے مکاں کا وہ ٹوٹا دریچہ ہی در تھا

○○

ﮬ......کاملؔ جنیدی

○

گلی گلی سے ہر اک درد سے چھنتے سناٹے
یہ کس کا شہر ہے کچھ بول گونگے سناٹے
یہ کس کی چیخ نے توڑا طلسمِ خاموشی
لہو لہو ہے ترا جسم کیسے سناٹے
قبا اجالوں کی جب تار تار ہونے لگی
اندھیری رات چلی آئی اوڑھے سناٹے
چلو کہ پیار کی شمعیں جلائیں مل جل کر
مہیب ہونے لگے نفرتوں کے سناٹے
امیرِ شہر بتا ، تو ہی کچھ بتا ، کس نے
ہر اک غریب کے چہرے پہ لکھے سناٹے
نویدِ صبح سمیٹے ہوئے ہیں دامن میں
یہ کوہ و دشت و بیاباں پہ پھیلے سناٹے
بتائیں کیا تمھیں کاملؔ عذابِ تیرہ شبی
ہماری آنکھوں نے دیکھے ہیں کتنے سناٹے

○○

○

ہر کس و ناکس کو دنیا آئینہ دکھلائے گی
اپنا چہرہ دیکھنے سے خود مگر گھبرائے گی
کر دیا جائے گا پہلے چور زخموں سے بدن
سامنے پھر صبر کی پوشاک لائی جائے گی
خود ہی دنیا دے گی اعزاز و مناصب اور پھر
مجھ پہ یہ تنقید کے شعلے بھی خود برسائے گی
بخت کا اپنے بھی مطلع صاف ہوگا ایک دن
دیکھنا ہے دھند محرومی کی کب تک چھائے گی
میں کہ اخلاص و محبت کا علمبردار ہوں
دھوپ نفرت کی مرے سر تک نہ ہرگز آئے گی
ہے وفا کے دم سے کاملؔ بے وفائی کا وجود
یہ نہ ہو پھر اس کی خود اوقات کیا رہ جائے گی

○○

○

کتنے خانوں میں سجا کر زندگی ڈھالی گئی
کانچ کی دیوار پر پتھر کی چھت ڈالی گئی

چاند کمرے میں کھلا تھا چاندنی مخمور تھی
پیار کا نشہ پلا کر رات متوالی گئی

آنکھ جلتی ہے ہر اک دل میں بسی ہے شعلگی
نفرتوں کی آگ سے شہروں کی خوش حالی گئی

ایک ننھی آرزو تھی دل کے اندر جلوہ گر
آج بے دردی سے وہ بھی قتل کر ڈالی گئی

پہلے شطرنجی بساطوں سی بچھی یہ زندگی
دل کے ہر خانے کے اندر مات پھر ڈالی گئی

دل کے ارماں دل کے اندر ہی سمٹ کے رہ گئے
چند سکوں کے عوض یہ زندگی ڈھالی گئی

بجھ گئے آنکھوں سے منظر رفتہ رفتہ اے نثار
شام لے کے ساتھ میں افلاک کی لالی گئی

○○

○

پہلے سا مرا آج وہ پندار نہیں ہے
شمشیر سلامت ہے مگر دھار نہیں ہے

شیشے کی عمارت میں سبھی عکس ہیں لیکن
اک عکس سرِ دیدۂ پندار نہیں ہے

ویران ہے کس درجہ مرا شہرِ تمنا
میخانے کھلے ہیں کوئی میخوار نہیں ہے

ہر کوئی فقط اپنے لئے جینے لگا ہے
جذبوں میں کسی کے کوئی ایثار نہیں ہے

سب جل گیا بس راکھ فقط رہ گئی باقی
اس دل کی انگیٹھی میں اب انگار نہیں ہے

ڈر ہے یہ کہیں ڈوب نہ جائے مرے مولا
کشتی میں ترے نام کی پتوار نہیں ہے

○○

✍……نثار جیراج پوری

○

ایک کشکول لیے کھیت اور کھلیانوں میں
زندگی گھومتی پھرتی ہے بیابانوں میں
ذہن کی چوٹیوں پہ برف جمی رہتی ہے
پھول کھلتے ہی نہیں دل کے نہاں خانوں میں
ان سے آئے گی بھلا کس طرح خوشبو کوئی
کاغذی پھول سجے ہیں ترے گلدانوں میں
ہے وہی مئے بھی مرے دل میں نہاں اے ساقی
جو چھلکتی ہے تری آنکھوں کے پیمانوں میں
یا وہ پہلے سی کشش شمع میں باقی ہی نہیں
یا کہ جلنے کی تمنا نہیں پروانوں میں
ایک ہی پل میں سبھی شیش محل ٹوٹ گئے
لگ گئی آگ اچانک مرے ارمانوں میں
کتنی شفقت تھی بزرگوں کے دلوں میں پنہاں
اب محبت وہ کہاں آج کے انسانوں میں
زندگی قید ہے شوکیس کے اندر اپنی
مورتیں جیسے سجی ہوں بڑی دکانوں میں

○○

○

دشت و صحرا یہاں شاداب نظر آتے ہیں
یہ جزیرے بہت سیراب نظر آتے ہیں
جا کے نزدیک حقیقت کا پتہ چلتا ہے
دور سے دشت بھی تالاب نظر آتے ہیں
کل تلک کانچ کے ٹکڑے جو نظر آتے تھے
اب وہی گوہرِ نایاب نظر آتے ہیں
جانے کیسی ہے تپش دشت کی اس مٹی میں
ذرے ذرے جہاں بے تاب نظر آتے ہیں
جو نمایاں تھے کبھی قوس قزح کی صورت
آج منظر وہی خوناب نظر آتے ہیں
جن پہ تہذیب و تمدن کا اثاثہ تھا نثارؔ
آج ٹوٹے وہی محراب نظر آتے ہیں

○○

○

نئی صدی کی کہانی مجھے سمجھتی ہے
لہو کی سرخ روانی مجھے سمجھتی ہے
اسے میں زندہ رکھوں گا بہت زمانے تک
زبانِ شاہ جہانی مجھے سمجھتی ہے
کبھی بھی جاؤں میں لوٹ آؤں گا ٹھکانے پر
ابھی بھی قیدِ مکانی مجھے سمجھتی ہے
میں جان دیتے ہوئے ہی یہاں تک آیا ہوں
تری خموش زبانی مجھے سمجھتی ہے
میں رقص کرتا رہوں گا جہاں میں مثلِ شرر
کسی کی شعلہ بیانی مجھے سمجھتی ہے
میں مر بھی جاؤں تو باقی رہوں گا لفظوں میں
یہ زندگانی فانی مجھے سمجھتی ہے
کسے میں دیکھتا ہوں روز وشب کے بیچ طرازؔ
مری تمیزِ زمانی مجھے سمجھتی ہے

○○

○

پھیلی ہوئی دنیا میں یہ کیسی کہانی ہے
جو بھی نظر آتا ہے وہ پیکرِ فانی ہے
یہ کیسی حقیقت ہے یہ کیسا فسانہ ہے
ہر شخص یہاں خود میں محکومِ زمانی ہے
زنجیرِ غلامی کو آ کاٹ دیں ہاتھوں سے
پوشیدہ بغاوت میں مفہومِ جوانی ہے
لازم ہے ستائش ہو اس دیدۂ گریاں کی
کہتے ہیں جسے آنسو وہ آنکھ کا پانی ہے
اس نقشِ سویدا سے انکار ہے وحشت کو
اور روح سمجھتی ہے یہ تیری نشانی ہے
ہے جوش مرا شامل اس شورِ سلاسل میں
مانا کہ بہت راشدؔ زنداں کی گرانی ہے

○○

○

توڑ کر سارے عہدِ وفا آدمی
ہوگیا آج کتنا بڑا آدمی
سانس بھی اپنی مرضی سے لیتا نہیں
اور سمجھتا ہے خود کو خدا آدمی
ہر طرف سے برائی کی یلغار ہے
جی نہ پائے گا ہرگز بھلا آدمی
بے ضمیری نے جب پاؤں پھیلا دیئے
چند سکوں کی خاطر بکا آدمی
راستے اس کے خود منتظر تھے مگر
ڈھونڈتا ہی رہا راستہ آدمی
زخم جس نے دیئے، درد جس نے دیا
تم نہیں تھے وہ تھا دوسرا آدمی
شہزر انجام اس کا تباہی نہ ہو
پار کرنے لگا انتہا آدمی

○○

○

ہر ایک گل کو ہے یوں انتظار خوشبو کا
بہار کرتی ہے خود اعتبار خوشبو کا
یہ کون آیا چمن میں صباحتیں لے کر
یہ کس نے توڑ دیا ہے حصار خوشبو کا
کبھی نہاں تو کبھی ہے بدن سے تیرے عیاں
مری نظر میں نہیں اعتبار خوشبو کا
بغورِ خاص بس اک بار ان کو دیکھا تھا
ابھی تلک نہیں ٹوٹا خمار خوشبو کا
اسے وہ اپنی عطائیں عطا نہیں کرتی
مری نگاہ میں دشمن ہے خار خوشبو کا
رخِ حسیں کی لطافت بیاں ہو کیوں شہزر
بنا ہے چہرے کا غازہ غبار خوشبو کا

○○

✍ ...... مجیب شہزر

○

ساری دنیا چھوڑ دی میں نے تجھے پانے کے بعد
دوستی کرتا بھی کس سے تیرے یارانے کے بعد

وہ تو یہ کہیئے کہ ہر مشکل کا حل تھا اس کے پاس
ورنہ مشکل کب سلجھتی ہے الجھ جانے کے بعد

ظلم کرنا ہی روا منشور ہے تیرا اگر
پھر پشیمانی یہ کیسی ہے ستم ڈھانے کے بعد

میرے ہمدم، میرے مونس میرے دل کو یوں نہ توڑ
کون پوچھے گا تجھے پھر تیرے دیوانے کے بعد

اپنے مرکز پر نظر مرکوز رکھنا ہے تجھے
لوٹ کر آتا نہیں ہے تیر چل جانے کے بعد

جانے کتنے تبصرے لکھے گا لفظِ عشق پر
حسن میں جلوہ نمائی کی ادا پانے کے بعد

اپنی ہستی پر ہی قرباں کر دیا اپنا وجود
زندگی کو زندگی کی سطح تک لانے کے بعد

ہے یقیں شہزر کہ اک دن دور ہوں گی ظلمتیں
آئے گا روشن جزیرہ پھر سیہ خانے کے بعد

○○

○

بے غرض، بے محل، بے نتیجہ سفر
میری تقدیر میں عمر بھر کا سفر

پوچھتی ہے یہ اب مجھ سے میری تھکن
منزلیں بیچ کر کیوں خریدا سفر

تم بھی میرے غمو! ساتھ میرے چلو
راس آئے نہ آئے خوشی کا سفر

کوئی ساتھی نہیں، کوئی رہبر نہیں
ان گِنت راستے اور تنہا سفر

دیکھیئے جا کے رکتا ہے کس موڑ پر
وادیٔ برف کا یہ سلگتا سفر

جو سفر طے کیا ماں کی آغوش میں
تھا مری زندگی کا سُہانا سفر

کوک سے جس کی شہزر دھڑکتا تھا دل
کر گیا شاخ سے وہ پرندہ سفر

○○

○

میرا دل تتلی کا پَر ہے
ساری دنیا میرا گھر ہے
عشق جسے کہتے ہیں اس کی
پہلی سیڑھی زخمِ جگر ہے
گونگی بہری اس بستی میں
تیری صدا بے بال وپر ہے
ہونٹوں پر ہے مہرِ خموشی
آنکھوں میں منظر منظر ہے
شیش محل میں رہنے والا
ہاتھوں میں لے کر پتھر ہے
مجھ سے مسیحا پوچھ رہا ہے
زخم کدھر ہے ، درد کدھر ہے
میں تو ہوں بیمارِ محبت
میں کیا جانوں درد کدھر ہے
ساری بستی پتھر پتھر
کانچ کا اس میں اک ساغرؔ ہے

○○

○

کہاں سے پائے گا تو رازِ کائنات ابھی
محیط تجھ کو کئے ہے حصارِ ذات ابھی
سفرِ حیات کا طے کر رہا ہوں صدیوں سے
سمجھ سکا نہ مگر مقصدِ حیات ابھی
زباں کی زد پہ تو روشن ہے کلمۂ توحید
بسے ہیں دل میں ترے لات، ابھی منات ابھی
خرد تو چند اشاروں سے ہوگئی لرزاں
جنوں کے ہاتھ میں ہیں کتنے حادثات ابھی
میں اک چراغ ہوں گرچہ ہوں ظلمتوں کا اسیر
مجھے بھی جلنے دو، چھائی ہے مجھ پہ رات ابھی
جہانِ سود وزیاں سے پرے ہوں اے ساغرؔ
نہ کر سکے ہیں ابھی سر یہ طلسمات ابھی

○○

○

جنونِ عشق کب عقل و خرد کے زیرِ دام آیا
اگر آیا تو پھر منزل سے بے نیل مرام آیا
''مجھے آہ فغانِ نیم شب کا پھر پیام آیا''
شبِ تاریک کے سینے میں جینے کا مقام آیا
ہیں محتاجِ نظر سب میکدے اس ایک مے کش کے
کہ جس کے ہاتھ آہِ صبح گاہی کا ہو جام آیا
اُجالے میری راہوں میں قدم بوسی کو دوڑ آئے
اندھیری منزلوں میں جب لبوں پہ تیرا نام آیا
جلیں اُمید کی شمعیں مری بے نور آنکھوں میں
تصور میرے دل میں جب ترا اے خوش خرام آیا
تو اپنی تشنگی کو اپنی قسمت جان لے ساغرؔ
سکندر چشمۂ حیواں پہ پہنچا، تشنہ کام آیا

○○

○

دورِ گردوں ہم پہ ہر دم مہرباں ہوتا رہا
دِل کی دنیا کا ہر اک پل داستاں ہوتا رہا
سیم وزر کی کھنکھناہٹ لے گئی صبر و قرار
وائے سامانِ طرب آزارِ جاں ہوتا رہا
ہم نے تو پردہ کیا تھا دردِ دل کا دوستو
کیا کریں ظالم نگاہوں سے عیاں ہوتا رہا
ہم درِ جاناں پہ دستک پھول سے دیتے رہے
کیا کریں اُن کی طبیعت پر گراں ہوتا رہا
ہم نے ہر اک بزم کو ساغرؔ بنایا یادگار
ذکر اُس جانِ بہاراں کا جہاں ہوتا رہا

○○

ٹ......صاحبہ شہریار

○

رنگ کچے ہیں جو بھی اُتر جائیں گے
سب اداکار اک دن بکھر جائیں گے
ایک مرکز پہ رہتا نہیں کچھ یہاں
دن یہ گردش کے آخر گزر جائیں گے
پوچھنے والا جن کو نہیں کوئی بھی
تیری دنیا میں اب وہ کدھر جائیں گے
گلستان کو بگڑنا سنورنا بھی ہے
جتنے آئیں گے موسم گزر جائیں گے
ٹہنیوں پر جو لہراتے ہیں صاحبہ
ایک دن سارے پتّے بکھر جائیں گے

○○

○

فرض جو بھی تھا محبت میں نبھایا ہم نے
اس کی ہر بات کو سینے سے لگایا ہم نے
رنج و غم کی ہو وہ یورش کہ مصائب کا ہجوم
خود کو ہر حال میں ہنستے ہوئے پایا ہم نے
اس سے بڑھ کر نہیں کچھ اور محبت کا ثبوت
جب پرائے کو بھی سمجھا نہ پرایا ہم نے
دل پہ جو چوٹ پڑی اس پہ بھی خاموش رہے
کب کسی بات کا افسانہ بنایا ہم نے
اُس کی آنکھوں سے چھلک اُٹھتے ہیں آنسو اکثر
حالِ دل صاحبہ جب اُس کو سنایا ہم نے

○○

○

کس کو سمجھاؤں کہ یہ بات بھی ہوسکتی ہے
دن ڈھلے بھی نہیں اور رات بھی ہوسکتی ہے
ویسے تو نظرِ عنایات بھی ہوسکتی ہے
یہ بھی ہوسکتا ہے، یہ گھات بھی ہوسکتی ہے
یعنی تخیل کے پیکر میں بھی پڑسکتی ہے جان
یعنی تجسیمِ خیالات بھی ہوسکتی ہے
ہم کو جس بات پہ ہوتا ہے حقیقت کا گماں
صرف معراجِ حکایات بھی ہوسکتی ہے
کھیلنے والے! کبھی بازی پلٹ جاتی ہے
کھیلنے والے! تری مات بھی ہوسکتی ہے
ہم اسی زعم میں تکلیف سہے جاتے ہیں
بعد میں پُرسشِ حالات بھی ہوسکتی ہے

○○

○

میں اپنے پاس ہی ہوں، میں یہیں ہوں
قسم اللہ کی، وہ میں نہیں ہوں
یہ کس چکر کی زد میں آگیا ہوں
جہاں سے میں چلا تھا، پھر وہیں ہوں
یہی ہستی کی میری انتہا ہے!
جبینِ خاک پر خاکِ جبین ہوں
یہی ہے میری آزادی کی صورت
غلامِ رحمۃ اللعالمینؐ ہوں!

○○

راشف عزمی......

○

ہوا کچھ گنگنائے تو مجھے تم یاد آتے ہو
کلی جب مسکرائے تو مجھے تم یاد آتے ہو
کبھی پچھلے پہر میں رات کے جو تیز آندھی سے
دیا جب تھرتھرائے تو مجھے تم یاد آتے ہو
لبِ خاموش پہ جب بھی خیالوں کے جزیروں کی
کوئی آواز آئے تو مجھے تم یاد آتے ہو
وہ شالیمار میں بارش میں بھیگے تھے ہم دونوں
وہ موسم لوٹ آئے تو مجھے تم یاد آتے ہو
عروجِ تابنا کی دیکھ کر قسمت پہ خوش ہوکر
ستارہ جگمگائے تو مجھے تم یاد آتے ہو
مسافت کر کے طے ہر شام کو پھر لوٹ کے سورج
جو ڈل میں ڈوب جائے تو مجھے تم یاد آتے ہو
نکل کر گھر کی وحشت سے کہیں صحراؤں میں راشفؔ
جنوں جو سر کٹائے تو مجھے تم یاد آتے ہو

○○

○

سب ہیں آئینہ ساز پیشے سے
اک عقیدت ہے اس قبیلے سے
ایک خط اس کی جیب سے نکلا
لاش لٹکی ہوئی تھی پنکھے سے
اُس کی عظمت پر اعتقاد نہیں
لوگ ملتے ہیں جس وسیلے سے
گرد اُس کے طواف کرنے لگا
نکلا باہر جو پنچھی پنجرے سے
پانی مشکیزے میں بھرا اس نے
اترا اک شہسوار گھوڑے سے
ہم پتہ تجھ ملنگ کا راشفؔ
پوچھ بیٹھے گلی میں بچے سے

○○

معاصرین

✍ ...... کرشن کمار طور

طلسمِ ہزار شیوہ ...... پرتپال سنگھ بے تاب

بیدلؔ کا ایک مصرع ہے ''شعر آنست کہ معنی نہ دارد''۔ بیدلؔ کے اس قول یا Maxim کو اگر آج کی نئی شاعری پر مکمل یا پھر نیم مکمل طور سے وارد کیا جائے تو اس سے گہری شناسائی کی جو رفاقت ہمارے ذہنوں میں موجود ہے اس کی تخلیقیت بے اعتنائی کے دائرہ گرد میں داخل ہوتی ہوئی محسوس ہوتی ہے اور اس کا اعلیٰ اور ارفع مزاج فی الحقیقت اپنی وحدت کے وصف کے باوجود تجزیہ اور تحسین کے مافوق الفطرت انجام کی رو سے وابستہ نظر آتا ہے۔ آخر نئی شاعری کا التزام جذباتی اور ذہنی سطح پر لطف اندوز ہونے میں کیوں مانع ہے اس کا سیدھا سادہ اور کیفیاتی جواب فنی اور تخلیقی عمل میں پوشیدہ ہے۔

نیا شاعر اپنی ذہنی اور قلبی وردات شعر سے اپنے قاری سے لگاؤ اور لگاوٹ کی سطح پر اجنبیت اور غیر صداقتی مظاہر کر دور کرنے میں آخر ناکام کیوں رہتا ہے۔ کیوں اس کی شناسائیت اور جذباتیت اپنی صداقتِ اظہار اور جُرأتِ گفتار کے برمحل استعمال کے باوجود اپنے پڑھنے، سمجھنے اور مجاز و حقیقت سے برآشنا قاری سے بعد خاطر رکھتی ہے۔ شاید اس کی وجہ شاعر کی رعونت اور منقسم مزاجی ہو جس کے اثرات اس کی شاعری پر اثر آمیز ہوتے ہیں اور اس کے پڑھنے والوں کے مابین ایک انحطاطی خلا کو جنم دیتے ہیں۔ اس پسِ منظر میں ہم اگر پرتپال سنگھ

بیتابؔ کے شعری وجدان کے خارجی قیود اور باطنی احتساب کی سطح پر روشن تبصرہ سے گزریں تو ہمیں یہ جاننے اور ماننے میں قطعی دِقّت کا احساس نہیں ہوگا کہ ان کے اندر سے جولاوا ایک آتش فشاں کی مانند پھوٹتا ہوا ہمارے رگ وپے میں سرایت کرتا ہے دراصل وہ ایسی ذہنی ہم آہنگی ہے جو تصوراتی اور حقیقی زندگی پر برحق ہے اور جس کی فضا انہوں نے ایسی چابکدستی سے خلق کی ہے کہ اس میں ایک قسم کی سادگی اور پرکاری در آئی ہے۔ کیوں نہ اس کیفیت کو ان کے شعروں اور نظموں کے ٹکڑوں کے حوالے سے ردعمل کے طور پر مظہر کیا جائے۔

بظاہر بہت خوش ہوں/ کہ لعل وجواہر کے یہ انبار میں نے لگائے ہیں/ بباطن البتہ اداس ہوں/ کہ وہ لعل جس کی مجھے تلاش ہے/ ہنوز میری دسترس سے پرے ہے/ دراصل وہ پہاڑ ہی میری آنکھ سے اوجھل ہے/ جس میں وہ رگ ہے/ جس رگ میں اس لعل کے/ ہونے کی امید ہے۔

(تیشہ بدست)

....

پہلے پہل گیرائی و گہرائی کم تھی، بہت کم/ مگر میں اپنی نظموں کو/ سلیقے سے بیاض میں سہج کر رکھتا تھا/ ایک ایک نظم کا اندراج/ اور حساب باقاعدہ رہتا تھا/ آج گیرائی اور گہرائی زیادہ ہے/ مگر نظم اکثر کہیں بھی کاغذ کے کسی بھی پرزے پر/ تحریر ہو جاتی ہے۔ (تیسری آنکھ کھلنے والی ہے)

....

مزاج کی، تحریر کی، تقریر کی/ سوچ کی، عمل کی کچھ خامیاں تھیں/ جنہیں میں اپنی خوبیاں سمجھتا رہا جن پر میں ناز کرتا رہا/ جو مرے لئے راحت بخش تھیں/ اور دوسروں کے لئے تکلیف دہ/ ایک عمر کے بعد محسوس ہو رہا ہے/ کہ اگر میں نے اپنی خامیوں پر/ وقتاً فوقتاً ناز نہ کیا ہوتا بلکہ ان پر قابو پایا ہوتا/ تو آج میں جہاں ہوں/ اس سے بہت آگے ہوتا۔

(شکست کا نشہ)

پورے اردو ادب میں عموماً اور شاعری میں خصوصاً معاشرتی ناہمواری کا عمل دخل رہا ہے اور ہمارے ادیبوں اور شاعروں نے معاشرہ اور ذات کے بنیادی اصول سے اپنے آپ کو وابستہ کرنے کے بعد جس طرح اس صورت کو واشگاف کیا ہے اور جس طرح اس تعلق اور ہم آہنگی کو شعر کی مثال بنایا ہے وہ ایک خاص اہمیت کا حامل ہے۔ بقول سراج منیؔر ذات کے شکستہ ٹکڑوں کو ترتیب دے کر ذات کی وحدت کو جنم دینا شاعر و ادیب کا اولین مقصد رہا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہمارے پرانے اور نئے شعرا کے سامنے ایک طرح کا المیاتی احساس پیش نظر رہا ہے جس کے ذریعے انہوں نے انسانی زندگی کا مآل اپنی تخلیقات میں شعور آمیز کیا ہے۔ شائستہ سطح پر تعلقات کو اس کے صحیح تناظر میں دیکھنا اور مرئی اور غیر مرئی تعلق کو دید و شنید سے پیوست کرنا انفرادی اور اجتماعی مقامات کے حصول کے لئے بھی ایک سعیٔ پیہم ہے۔

انسانی رشتوں کی برتری ذہن اور قلب دونوں کے لئے مرتکز کے طور پر ابھرتی ہے۔ فرد اور معاشرے کے باہمی رشتوں کے حوالے سے محبؔ عارفی اپنے ایک مضمون میں یوں رقم طراز ہیں:

> ''اس سلسلے میں مغربی دانشوری دو انتہا پسندیوں کا شکار ہے۔ فردیت پرستی اور اجتماعیت پرستی، فردیت پرستوں کے نزدیک حقیقت انسانی فرد تک محدود ہے۔ فرد کا فطری حق ہے کہ اس پر معاشرہ کسی قسم کی پابندی عائد نہ کرے۔ اجتماعیت پرستوں کے نزدیک حقیقت انسانی معاشرے سے عبارت ہے۔ افراد معاشرے کی مشین کے بے روح پرزے ہیں۔ تقاضائے فطرت ہے کہ جملہ صلاحیتیں ہمیشہ بس معاشرے کی خدمت گزاری میں صرف ہوتی رہی ہیں کوئی معاشرہ اپنے افراد سے ضروری قربانیاں وصول کئے بغیر قائم نہیں رہ سکتا۔ لیکن ان قربانیوں کا جائز مصرف بس یہ ہے کہ ان کی مدد کے بغیر معاشرہ اپنے افراد کی خدمت گزاری میں لگا رہے۔ صالح معاشرہ وہی ہوگا جو اپنے ہر فرد کے لئے حصول کمال کے صالح امکانات کو ہر ممکن آزادی کے

ساتھ انتہائی بلندیوں تک پہنچانے کی ہر ممکن سہولیت بہم پہنچائے۔''

اب اس حوالے سے بیتابؔ کی مفکرانہ کاوشوں اور ان کی خلقی معقول پسندی اور غیر معتدل اور معتدل اجتماعیت پرستی اور مغربی افکار سے مملو فردیت پرستی کو تفتیشی کرشموں سے ان کی نظموں اور غزلوں کے اشعار کی ہیئت کے اجزا کا آخری حد تک تجزیہ کیا جائے اور ان کی شعری صلاحیتوں کو تجسّس کے ساتھ از سرِ نو دریافت کیا جائے تو ہمیں اس امکانی شعر فہمی کے نتائج پر پہنچنے میں ذرا سی بھی دِقت نہیں رہتی کہ انہوں نے اپنے ذہنی ارتقا کے باعث خود کو بے وجود ثابت ہر گز ہر گز نہیں کیا ہے بلکہ ان کا ادراک ان کے شعری تخلیق کے وجود کا حسین مگر جاندار جزو ہے۔ اگرچہ انہوں نے اپنے پیش روؤں سے غیر اکتسابی طور پر یہ احساس اپنے آپ پر وارد کیا ہے لیکن یہ مسرّت کا مقام ہے کہ ان کی یہ صلاحیت انسانی فطرت کے داخل سے جنم لینے کی ایک دلکش سعی ہے۔ آیئے ان کی اس معقولیت پسندی کو ان کے شعری رجحان کے حوالے سے تنقیدی ایمان کے سائے میں روشن کریں کہ موجودہ آفاق کا کوئی جز ایسا نہیں ہے کہ اس عمیق احساس کو واردات شعر بنانے میں مانع ہو۔

لمحات کو کھنی میں یہ بڑا سا ہیرا ہاتھ لگ گیا / ناتراشیدہ ہونے
کی وجہ سے / کوئی اسے پہچانتا ہی نہیں بڑے سے بڑے جوہری بھی /
اسے یونہی سی چیز مان کر آگے بڑھ جاتے ہیں / کبھی سوچتا ہوں اسے
تراش کر / اس کی شکل صورت کچھ ایسی بنا دوں / کہ عقل کے اندھے ہی
نہیں بلکہ / آنکھ کے اندھے بھی اسے دیکھتے ہی پہچان جائیں / لیکن پھر یہ
سوچ کر رہ جاتا ہوں / کہ جو اندھے ہیں وہ اگر اسے پہچان بھی لیں تو بھی
کیا / رہیں گے تو اندھے کے اندھے ہی / (بیش قیمت)

....

جب تم میرے حق میں / سزائے موت کا حکم سنا رہے تھے / میرا دھیان

کہیں اور تھا/ جب تمہارے حکم سے مجھے پھانسی دی جارہی تھی/ میرا
دھیان اس وقت بھی کہیں اور تھا/ آج ایک دنیا کے باشندے/ بلکہ کئی
دنیاؤں کے باشندے/ میرے پاس آکر تمہارے خلاف بہت کچھ کہتے
ہیں/ خاص طور سے یہ/ کہ تم نے مجھے سزائے موت دے کر/ بہت بڑی
غلطی کی ہے بلکہ گناہ کیا ہے/ لیکن تمہارے خلاف ان تمام باتوں کے
درمیان/ میرا دھیان کہیں اور ہوتا ہے/ یہ میرا دھیان اور میں/ ہم دونوں
ایسے ہی ہیں/ (یہ میں اور میرا دھیان)

....

جب جسم میں دم تھا/ لباس کیسا ہے یہ فکر ہی نہ تھی/ جسم کا اپنا
مزاج تھا/ ایک نخرہ تھا/ مست ہاتھی کی سی چال تھی/ اب جسم لاغر ہے/
بڑھیا سے بڑھیا نئے سے نئے انداز کے/ شوخ سے شوخ رنگوں کے
خوبصورت لباس/ جسم پر سجا کر نکلتا ہوں/ لباس کی مدد سے/ وہی انداز،
وہی مزاج دم خم/ اپنے جسم میں پیدا کرنے کی کوشش میں رہتا ہوں/
سامنے والوں کی نظر پر نظر رکھتا ہوں۔ (جسم لباس اور میں)

....

دوسروں کی کہانیاں سنتے سناتے/ اس بات کا خیال ہی نہ تھا/
کہ میرے اپنے اردگرد کئی کہانیاں بنی جارہی ہیں/ سنی جارہی ہیں/ سنائی
جارہی ہیں/ اور جب تک اس بات کا پتہ چلا میرے اردگرد/ کہانیوں کے
تانے بانے اتنے الجھ چکے تھے/ کہ ان سے باہر نکل پانا ممکن ہی نہیں تھا
(مکڑ جال)

....

پرتپال سنگھ بیتاب کا ازلی اور بنیادی نظریۂ شعر جذباتی وابستگی اور فکر کے وسیلے اور
حوالے سے خود کو از سر نو دریافت کرنا ہے۔ ان کے اشعار میں تخلیق سے تخلیق کی عدم موجودگی کا

احساس امکانات اور موجودات کے کرب سے نہ صرف نفی عیاں ہے بلکہ وہ اپنے اشعار میں نہ صرف تماشہ ہیں بلکہ تخلیقی، محرکات کے جذب سے خود اپنے تماشائی بھی۔ ان پر وہ قول بڑی خوبصورتی سے صادق آتا ہے کہ تخلیق، تخلیق کار سے لکھواتی ہے اور تخلیق کار اپنے مشاہدات اور تجربات کو ایک حد تک بروئے کار لاتا ہے۔ بیتابؔ آئینہ ہی نہیں بلکہ آئینوں میں خوبصورت پیکر تراشی کا جمال آفرین عکس بھی ہیں۔ وہ صرف خود سے مکالمہ نہیں کرتے بلکہ اپنے پڑھنے والوں کو اس میں شرکت کا احساس بھی دلاتے ہیں۔ شاید یہ شعری وجدان کی غیر مرئی سطح ہے جہاں شاعر اور شعر کا ادراک رکھنے والے اپنے تحفظات کے باوجود ایک دوسرے کی توسیع نظر آتے ہیں۔ یہ مقام تخلیق کی سطح پر بہت کم عیاں ہوتا ہے کہ قاری شعر کے توسط سے اپنے چہرے سے آشنائی حاصل کرے۔ پرتپال سنگھ بیتابؔ کی تخلیق ایک ماورائی جوہر سے کشید ہو کر قاری تک رجوع کرتی ہے اور بڑے غیر محسوس طریقے سے اس کے درک میں جلوہ فگن ہوتی ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ معرفت کا بیش بہا موتی ہر ایک انسان کے اندر موجود رہتا ہے اگر چہ اس کی دریافت مختلف پسِ منظر رکھنے والے افراد پر مختلف اوقات میں وارد ہوتی ہے۔ معرفت میں صدف جسم کے مترادف ہے اور اس میں حقیقت فی الحقیقت اس ابر نیساں کی مانند جو سواتی نکشتر میں ابر بہار کی بوند بن کر اس کے ذہن میں موتی بنتی ہے۔ پانی کی ہر بوند کے مقدر میں موتی بننا نہیں لکھا ہوتا۔ معرفت میں متبادل نام کی کوئی شے موجود نہیں ہوتی لیکن اعتراف حقیقت کو مماثلت سے تعبیر بھی نہیں کیا جاسکتا۔ ظاہری، مذہبی روائتوں اور رسومات سے گیان یا پھر عرفان کا ادراک ممکن نہیں ہے کیونکہ منزل مقصود کو اِدھر اُدھر بھٹکنے سے کبھی بھی حاصل نہیں کیا جاسکتا۔ یہ آگ یہ جوالا انسان کے اندرون میں بھڑکتی ہے اور شعلہ ریز ہوتی ہے۔ اس پسِ منظر میں اگر کچھ ایسے شعراء کا کلام بیتابؔ کے شعری وجدان کے مماثل میں رکھ کر پڑھنے کی سعی کریں تو شاید سلطان باہوؔ کی شمشیر برہنہ کی مانند ہم پر یہ واضح ہو سکے کہ آخر بڑے لوگ بڑوں کی مانند سوچتے ہیں اور ان کا ذہنی آہنگ یکساں طور پر لوگوں کے دلوں میں جلوہ فگن ہوتا ہے۔

معرفت کا بیش بہا موتی کبیرؔ کا شبد اور شاہ عبداللطیف بھٹائی کا ذکرِ الٰہی اور خواجہ میر دردؔ کا سچ مچ کے صوفی کی آواز اور پرتپال سنگھ بیتابؔ کا جوگیانہ وصال اور تت توم امی (میں وہی ہوں) کا روحانی فلسفہ عبودیت کی سرشاری سب ایک ہے۔ حیرت کا مقام یہ ہے کہ پرتپال سنگھ بیتابؔ کے ہاں مذہبی شاعری، صوفیانہ شاعری کے مقابلے میں نہ کے برابر ہے۔ صوفیانہ شاعری میں ایک طرح کی جو آفاقیت واقع ہوتی ہے وہ مذہبی شاعری میں وسعت اور آزاد خیالی سے معدوم رہتی ہے۔

گیان رتن کی کوٹھری چپ کر دینوں تال
پارکھ آ کے کھولئے کنجی وچن رسال (کبیرؔ ۱/۲۱۳)

....

کاش وہ جوہر شناس
نہ جائیں
جو آنکھ پر عدسہ لگا کر
آبداری موتی پرکھتے ہیں
موتی کا مزاج
آب شناسی ہے
جسے صرف جوہری پرکھتا ہے (شاہ عبداللطیف بھٹائی/سری راگ ۴)

....

شیوہ نہیں اپنا تو عبث ہرزہ یہ بکنا
کچھ بات کہیں گے جو کوئی کان ملے گا (خواجہ میرؔ درد)

....

اے میرے خدا مجھ کو یہ توفیق عطا کر
جو دل پہ گزرتی ہے وہ اظہار میں آوے (پرتپال سنگھ بیتابؔ)

....

میں کہ اک تشنہ لب مسافر
پانی کے ان خزینوں کے درمیان بھٹک رہا ہوں
سوالات کے جواب میرے پاس نہیں ہیں
پانی کو ہاتھ میں لگا نہیں سکتا
بھیم، ارجن، نکل، سہدیو کے حشر کو جانتا ہوں
لہٰذا بھٹک رہا ہوں، بھٹک رہا ہوں (پرتپال سنگھ بیتابؔ)

....

گورو گرنتھ صاحب میں رقم ہے ''نانک نام ملے تاں جیواں تن من تھیوے ہریا''۔ محبوب سے وصل انسانی حیات کا نہ صرف خاصہ ہے بلکہ منتہا بھی بلکہ یہی زندگی کی سرسبزی کی دلیل بھی لیکن اس نشاط وصل میں آدمی کو خود اپنے اندر کے صراطِ مستقیم سے گزرنا ہوتا ہے تب ہی وصالِ الٰہی سے نشاط انگیز ہونے کی سعادت حاصل ہو سکتی ہے اور جس طرح سے یہ منزل آسانی سے سر نہیں ہو سکتی بالکل اسی طرح پرتپال سنگھ بیتابؔ کے ذہنی اور لسانی افق کو ایک ذرا سی روشنی اور وسعت درکار ہے جس طرح محبوب سے وصل کو گداختگی لازم ہے کہ ہجرت میں موت ہے۔

آپ کی نظروں سے پنجابی زبان کے مشہور شاعر شاہ حسینؔ کا یہ مصرع ضرور گزرا ہوگا:

''رانجھا رانجھا کردی نی میں آپو رانجھا ہوئی''

اور اسی مضمون کو خواجہ میرؔ درد نے بھی اپنے ایک شعر میں نظم کیا ہے۔ان کا ارشاد ہے۔

نہ پوچھو کچھ ہمارے ہجر کی اور وصل کی باتیں
چلے تھے ڈھونڈنے جس کو سو وہ ہی آپ ہو بیٹھے

اس قسم کے صوفیانہ افکار ہمیں کم و بیش ہر اچھے غزل گو کے کلام میں مل جاتے ہیں۔ پرتپال سنگھ بیتابؔ کسی تخصیص کے حامل نہیں ہیں لیکن ان کے انفرادی تجربے اور موضوع کی رنگا رنگی انہیں دوسرے شعرا سے الگ کرتی ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ شاعر مکمل طور پر اپنی ذات اور تجربات سے ماورا نہیں ہوتا۔ اگر وہ اسے رد بھی کرتا ہے تو وہ اپنے تجربے کے حوالے سے رد کرتا ہے اور اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ بھی ایک طرح کا اظہارِ ذات ہے یعنی Inverted self expressioo ہے۔ لیکن پرتپال سنگھ بیتابؔ نے اپنے تجربات کو اپنی ذات اور زندگی کے حوالے سے جو بھی مواد اپنی شاعری میں استعمال کیا ہے، ان کی حد بندیوں کو زمان و مکان میں محصور ہونے کے باوجود اس طرح توڑ دیا ہے کہ وہ ہمارے ذہن کے نہاں خانوں میں داخل ہو کر ہماری داستاں کا ایک حصہ بن جاتے ہیں۔ ان کی نظموں میں خاص طور پر اس کی بازگشت سنائی دیتی ہے اور اس سے معنی کی نئی دنیاؤں کے در وا ہونے لگتے ہیں۔ انہوں نے اپنی نظموں میں اپنی زندگی سے مواد اخذ کیا ہے اور اسے وسیع اور ہمہ جہت معنوں میں استعمال کیا ہے اور شاید یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں Self reflexivity داخلی معنویت، تہذیبی بازیافت اور تعبیرِ نو کی صورت میں رونما ہوئی ہے۔ پرتپال سنگھ بیتابؔ کا وژن ان کی شخصیت کی شناخت میں معاون ثابت ہوتا ہے اور اسی سے فکر اور اظہار کے پیرائے ترتیب پاتے ہیں اور احساس کی جہتیں بنتی ہیں۔ ان کی تلاشِ ذات اسی سفر اور اسی اظہار سے شروع ہوتی ہے۔ اور بالآخر معاشرے کے انتشار، تہذیب کی تخریب اور کائناتی مدوجزر کی صورت میں تشکیل پاتی ہے۔ آیئے کیوں نہ اپنے اس قول کی روشنی میں ان کی شاعری سے اقتباسات پر نظر ڈالتے چلیں کہ یہ ادراک، اکتساب، تجزیہ، اطلاع اور تشریح کے مماثل ہوگا۔

وہ حقیقت کو سمجھتا ہی نہیں
خواب پر خواب دکھاتا ہے مجھے

....

راہ میں ہوتے ہیں خوش منظر بھی
اپنی ہی کم نظری رہتی ہے

....

ایک مسلسل دوڑ میں شامل ہم بھی ہیں
شوق نہیں یہ اک ذہنی بیماری ہے

اک زندگی ہماری طرح سے نہ ہوسکی
ہونے کو اس جہان میں کیا کیا نہیں ہوا

....

قدم اگلا تھا پذیرائی کا/ مرحلہ آگیا پسپائی کا/ برف موسم میں/ اپنے اندر جکڑا ہوا سکڑا ہوا/ میں سوچ رہا تھا/ سب لوگ میری طرح نیچے درجۂ حرارت میں/ منجمد ہوں گے اپنی اپنی پناہ گاہوں میں/ کوئی باہر نکلنے کی جرأت نہیں کر رہا تھا/ لیکن لگاتار جکڑن اور سکڑن سے/ تنگ آکر میں باہر نکلا/ تو دیکھا کہ ایک دنیا/ باہر گھوم رہی ہے/ برف سے کھیل رہی ہے

(برف موسم میں)

....

بھوت بنگلے کہلانے والے چند ایک محلات/ جن کی ایک ایک اینٹ/ لمحہ لمحہ اکھڑ رہی ہے/ بے بام و در کمروں جیسی ایک دیواریں ہیں/ جن کو دیکھ کے لگتا ہے/ کہ کبھی یہ عمارات کے حصّے رہی ہوں گی/ ہم نہیں ہیں/ مگر شاید ہم بھی ہیں پیچھے دور/ اڑتے ہوئے غبار میں پھیلی ہوئی/ اک فقط شرمندگی کی صورت (غبارِ رفتہ)

....

اس بھیڑ بھاڑ بھرے مہانگر میں/ ایسی جگہ کہاں ہے/ جہاں میں آزاد پنچھیوں کی طرح/ اڑتا پھروں/ درختوں سے لپٹ لپٹ کر/ اونچی اونچی آواز میں روؤں ہنسوں/ قدرت سے مکالمہ کروں/ خود سنوں خدا کو سناؤں/ میں جانتا ہوں کہ ایسا کرنے والے کو/ یہ مہذب دنیا دیوانہ ہی کہے گی/ لیکن پھر بھی اس مہانگر میں/ یا کسی بھی مہانگر میں/ کہیں ایسی جگہ مل جائے/ تو میں یہ سب ضرور کروں گا (میں یہ سب ضرور کروں گا)

....

حکمت کے گہر، علمی تجسس کی تسکین اور موضوع کے تاریک گوشوں کو منور کرنے والے لمحات اگر تہذیبی ،ادبی اور فنی مطالبات اور ساختیات کی سوغات بن جائیں تو ایسے شاعر کا انفرادی جوہر شاداب اور تاب آمیزی کا استعارہ بن جاتا ہے اور یہ دریافت اس کو دوسرے انسانوں سے اور اپنے اندر کی پہلودار شخصیت سے ایک معیاری مکالمہ پر آمادہ کرتی ہے اور اس پر ذات اور کائنات کے ممکنہ امکانی دستاویزی خطوط منکشف ہونے لگتے ہیں۔ پرتپال سنگھ بیتاؔب نے ان مخصوص مطالبات کے پیشِ نظر اپنے کلام میں ایسی معیاری رسائی بہم پہنچائی ہے جو سکہ بند ادبی روایات کے ساتھ ساتھ مستند آئین، بلاغت اور تہذیبی معنویت کی پیکری صورت ہمہ جہتی طرزِ احساس کے ساتھ اجاگر ہوتی ہے۔انہیں ان حقائق کا مکمل ادراک اور عرفان ہے اور ان کی فکری سطح ان سے بے حد متاثر نظر آتی ہے۔ان کے کلام کے شعری دریچے تازہ اور مہک بھری ہوا کے لئے ہمیشہ وا رہتے ہیں اور ان کا فن جذبے میں خلوص اور اظہار میں فنی اور حقیقی صداقت کے لئے نمایاں رہتا ہے۔وہ اس حقیقت سے بھی باخبر ہیں کہ ان کی ہنگامہ خیزی ان کی رجائیت پر دال ہے اور وہ Hope sustains life کے مصداق ایک بصیرت افروز مثال ہیں۔وہ بے حد باخبر شاعر ہیں اور ان کا ہر شعری منظر ایک خوشگوار حیرت کے ساتھ ہمارے دل کے دروازے پر دستک دیتا ہے اور ان کی صلاحیتوں کا منہ بولتا اظہار ہے۔ظاہری توصیف وتعریف سے قطع نظر ان کی ذہنی پختگی اس بات کی متقاضی ہے کہ ان کا فلسفۂ حیات محبت میں مرگ طلب کے اعتبار سے جامع، بلیغ اور مرکب ہے اور ان کے مثبت منفی، ادبی اور فنی رویوں کا اشاریہ۔خدا کا شکر ہے کہ پرتپال سنگھ بیتاؔب ادب میں لایعنی کلام کے خالق نہیں ہیں۔

اک ذرا تھک کے بیٹھ گیا ہوں/ میں سویا نہیں ہوں جاگ رہا
ہوں/ ہاں تھوڑا سا اونگھ رہا ہوں/ ہم سفر آگے نکلتے ہوئے/ میری طرف
اس انداز سے دیکھ رہے ہیں/ گویا سوچ رہے ہوں/ کہ اس کی تو بس ہوگئی/
لیکن میں جانتا ہوں/ میری بس نہیں ہوئی/ ابھی میرا سفر تمام نہیں ہوا/

تھکان دور ہونے پر اٹھوں گا/ پھر چل پڑوں گا اسی راہ پر

(اک ذرا تھک کے)

....

لڑکپن میں اور نوجوانی میں/ مجھے اپنے والد کی اکثر باتیں/ خاص طور سے نصیحتیں/ بوسیدہ اور فرسودہ معلوم ہوتی تھیں/ بباطن بغاوت رہتی تھی/ بظاہر اظہار کم کم تھا/ آج میں اپنی بیٹی سے قریب قریب وہی سب کہتا ہوں/ جو میرے والد کبھی مجھ سے کہا کرتے تھے/ میری بیٹی بغاوت اندر دبائے نہیں رکھتی/ بلکہ اگل دیتی ہے

(خلا ہر لمحہ بڑھتا رہا ہے)

....

میری تنہائی میرا بہترین ساتھی ہے/ اس کے سامنے میں بات بے بات رو سکتا ہوں/ کھلکھلا کر ہنس سکتا ہوں/ اپنے آپ سے باتیں کر سکتا ہوں/ اپنی ذات کو اونچی آواز میں پکار سکتا ہوں/ الف ننگا ہو سکتا ہوں/ اپنے جسم سے پیار کر سکتا ہوں/ جس کے سامنے میں یہ سب/ جب چاہوں کروں اور اسے کوئی تامل نہ ہو

(میری تنہائی میرا بہترین ساتھی ہے)

....

اپنی تصویر کے بند پڑے البم کو/ وقتاً فوقتاً کھولتا ہوں/ ایک ایک تصویر کو بغور دیکھتا ہوں/ ایک تصویر جو میرے البم میں دراصل نہیں ہے/ نہ جانے کہاں سے آجاتی ہے/ کبھی اس ورق پر کبھی اُس وقت پر/ یہ تصویر میری البم کے قریب قریب ہر ورق پر/ کبھی نہ کبھی اپنی نمائش کر چکی ہے/ البم سے باہر/ یاد کرنے پر/ دماغ پر بہت زور دینے پر بھی یاد نہیں آتا/ کہ یہ تصویر کس کی ہے

(ایک تصویر میرے البم کی)

....

محولہ بالا اقتباسات سے بات مظہر الشّمس ہے کہ پرتپال سنگھ بیتاؔب اپنے شعری انکشافات کی روشنی میں اپنے دماغی اُفق کی توسیع کرتے نظر آتے ہیں۔ ان کی صلاحیتیں خود منہ بولتی ہیں اور مستقبل قریب میں وہ بے حد منور اور منفرد ثابت ہوں گے ایسی امید بھی ہے اور یقین بھی۔

پرتپال سنگھ بیتاؔب کے شعری افق کی دو اور پرتیں نہایت واضح اور غیر مبہم ہیں۔ ایک تو وہ جس میں وہ سطحی اور بادی النظر میں ظاہری اشیا کو ہمہ رُخی منطق کے ذریعے اپنی گرفت میں لینے کی سعی کرتے ہیں اور دوسری وہ جس میں وہ غالؔب کی طرح دشت تمنا کے دوسرے قدم کا منظر پیش کرتے ہیں۔ یہ دونوں مناظر ان کی اپنی ذات کی تفہیم کے حوالے سے ان کی شعری دروبست میں بہت واضح اور روشن ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے ہے ان کی رجائیت اس کلبہ احزاں میں بھی قنوطیت کی بجائے مسرت کی خوشگوار زیریں مگر نا معلوم لہروں کے اثرات قبول کرتی ہے اور زندگی کی کم مائیگی کو ایک بے پناہ عشق انگیز احساس سے ممیّز، پرتپال سنگھ بیتاؔب کا احاطہ رمز و شعر دنیا داری نہیں بلکہ دل داری ہے۔

..........OO..........

✍......ایازؔ رسول نازکی

مٹھی بھر غزلیں

○

برف گرنے کا ہے منظر دیکھنا
ہر طرف ہے سنگِ مرمر دیکھنا
ٹھنڈ تو ہے ہاں مگر اتنی نہیں
تم ہو اندر میں ہوں باہر دیکھنا
چیل کوے اُڑ رہے ہیں برف میں
آکے بیٹھے کچھ کبوتر دیکھنا
بجھ گئی ہے کب کی میری کانگڑی
جل رہی ہے کس کی چادر دیکھنا
لو زمین پر اک سفیدی چھا گئی
اب بچھے گی موٹی چادر دیکھنا
لوگ ہانکے جا رہے ہیں اس طرف
اُس طرف ہے شورِ محشر دیکھنا
ہم کو سکھلایا بزرگوں نے ایازؔ
ایک قطرے میں سمندر دیکھنا

○○

○

درد آخر درد ہے پوچھ کر آتا نہیں
اور جب یہ آگیا لوٹ کر جاتا نہیں
عشق کے اس روگ کی پہلی علامت ہے یہی
کوئی منظر سامنے ہو آنکھ کو بھاتا نہیں
زندگی کی منزلیں ہیں سب سرابوں کی طرح
دوڑتے ہیں سب مگر ان کو کوئی پاتا نہیں
اب کسی کے نطق میں بھی کیوں اثر باقی نہیں
اب کے کوئی شعر کیوں دل کو برماتا نہیں
حادثے اتنے ہوئے ہیں شہرِ ناہنجار میں
سانحہ کوئی بھی ہو دل کو تڑپاتا نہیں
گونگی بہری بستیوں میں لوگ رہتے ہیں ایازؔ
کوئی کہتا بھی نہیں، کوئی سن پاتا نہیں

○○

○

گئے دن کا سورج یہی کہہ رہا ہے

کہ اس شب پہ واجب مرا خوں بہا ہے

شبِ ہجر کالی ردا ہے کہ جس میں

مجھے اس نے ہر شام دفنا لیا ہے

کبھی سبز شاخوں سے پتے جھڑے ہیں

مرے ساتھ اکثر ہی ایسا ہوا ہے

مجھے بھی گھروندے بنانے کی ضد ہے

سمندر بھی پاؤں تلک آچکا ہے

اسے اونچے پیڑوں سے نفرت ہوئی ہے

سمجھتا نہیں اُس کا قد گھٹ گیا ہے

پگھلتی ہوئی برف یہ کہہ رہی ہے

کہ موسم کا پہلا شگوفہ کھلا ہے

کوئی اونچے پربت کی چوٹی سے اکثر

مرا نام لے کر مجھے پوچھتا ہے

○○

○

آس میں کاٹے بیس برس اور یاس میں کاٹے بیس برس

کچھ نہ پوچھو ہم نے کیسے کاٹے ہیں چالیس برس

جس نے ہم کو عشق سکھایا جس سے سمجھے سارے گُر

اس کی عمر تھی سولہ سترہ اپنی تھی اکیس برس

آتے جاتے ہر موسم میں اُس کا جادو قائم ہے

بیس برس سے دیکھ رہا ہوں، لگتی ہے انیس برس

میرا جسم بھی سوکھ چلا ہے نیل کے ساحل جیسا کھیت

ملکِ سلیماں پر تو لہرا بادل بن بلقیس برس

آخر شب میں سارے مومن ریشہ ریشہ بھیگ گئے

زاہد جتنے خشک بچے ہیں اُن پہ تو ابلیس برس

ہم کو بچھڑے کتنے گزرے سال بتادوں اے کشمیر

تیرے سولہ، میرے سولہ، ہوتے ہیں بتیس برس

○○

○

ٹھانی اس نے من میں کیا ہے
ورنہ رکھا بن میں کیا ہے

جو بھی ہے وہ من کے اندر
شعر میں کیا ہے، فن میں کیا ہے

اپنی اپنی قسمت سب کی
ورنہ کِس دامن میں کیا ہے

رنگوں کا ہے کھیل تماشا
گُل میں کیا، گلشن میں کیا ہے

بات فقط اک ہونے کی ہے
گھر میں کیا، آنگن میں کیا ہے

میرا عکس ہے جب تک میں ہوں
بعد ازاں درپن میں کیا ہے

بھوکے بچے سوچ رہے ہیں
جانے کس برتن میں کیا ہے

روز جو مجھ کو یاد آتا ہے
میرے اس بچپن میں کیا ہے

سحر ہے کیسا انگڑائی میں
جادو دیکھ بدن میں کیا ہے

○○

○

چھتیں اڑی ہیں، دراڑیں پڑیں مکانوں میں
ستم کی گھاس اُگی ہے نگار خانوں میں

لہولہو تھا بدن، اُس کا ہاتھ ٹوٹے تھے
حنا حنا وہ پکاری تھی آستانوں میں

گھروں میں آج وہ کرب وبلا کا منظر تھا
سہمے سہمے تھے پرندے بھی آشیانوں میں

وہ جن کے نام پہ نکلیں گی کل کی تعبیریں
کئے ہیں خواب مقفل وہ قید خانوں میں

وہ جس کا وار موثر تھا، ضرب کاری تھی
کھڑا ہوا تھا وہ قاتل بھی پاسبانوں میں

زمیں پہ ظلم بہت ہے خدا سے کہہ دیتے
گزر ہمارا اگر ہوتا آسمانوں میں

○○

○

عشق میں کوئی ہمسری کرتا
ہم کو الزام سے بری کرتا
ایک بوتل میں وہ سما جاتی
اس کو جادو سے میں پری کرتا
چھیڑ معصوم سی چلا کرتی
وہ بھی ہنس ہنس کے دلبری کرتا
اس نے جنگل جلا دیئے لیکن
شاخ اک پیڑ کی ہری کرتا
چاند آتا جو روز آنگن میں
ساتھ میرے سخن وری کرتا
شاعری ہم پہ چھوڑ دینی تھی
مرزا غالب سپہ گری کرتا
ایک دن تجھ کو ڈوب جانا تھا
جو بھی کرتا تُو سَرسَری کرتا
خاک ہوتا وہ سربلندی میں
پائمالی میں سروری کرتا
شعر کہتا نہیں اگر میں بھی
خرقہ پہنے قلندری کرتا
وہ جوانی ایاز ایسی تھی
بات میں بھی کھری کھری کرتا

○○

○

چڑھتا دریا اُتر گیا میں بھی
سر سے پانی گزر گیا میں بھی
رات کی تو فصیل اونچی تھی
پار کیسے اُتر گیا میں بھی
اس میں تو بھی تو ٹوٹ پھوٹ گیا
ریزہ ریزہ بکھر گیا میں بھی
پانچ بجتے ہی لوٹ آتا ہوں
اب کے شاید سدھر گیا میں بھی
اس چوراہے پہ بھیڑ اتنی تھی
تو نہ آیا تو گھر گیا میں بھی
تو نے دیکھا مجھے تو گھبرایا
اپنے سائے سے ڈر گیا میں بھی
دن میں ثابت تھا اور سالم بھی
شام ہوتے بکھر گیا میں بھی

○○

○

ٹکڑے ٹکڑے جب بٹ جاؤں شام گئے
دن کا سارا قرض چکاؤں شام گئے
کس کاندھے پر اشک بہاؤں شام گئے
کس کو اپنے زخم دکھاؤں شام گئے
گھر سے چلتے میں نے اکثر سوچا ہے
شاید ہی میں لوٹ کے آؤں شام گئے
سارا دن الجھن ہی میں بیت گیا
کیسے اپنا دل بہلاؤں شام گئے
دھوپ کے مارے لوگوں کو بھی صحرا میں
مل جاتی ہے پیڑ کی چھاؤں شام گئے
پر پھیلائے مرغا بولا میر ایاز
جاگا میرے من کا گاؤں شام گئے

○○

○

شبِ فراق میں مرے وہ بال و پر کتر گیا
پرند اس کی یاد کا نئی اُڑان بھر گیا
یہاں پہ خون بہہ گیا، وہاں پہ لاش گر پڑی
نہ جانے کون شخص تھا سفر تمام کر گیا
کسی کی نیند ٹوٹتی، کوئی تو رات جاگتا
اسی نگر میں رات کو کسی کا خواب مر گیا
نہ طائروں کا غول ہی ہماری چھت پہ آرکا
نہ اپنے گھر کے سامنے وہ کارواں ٹھہر گیا
دوپہر گزر گئی وہ سر کے بال جھڑ گئے
ایاز اتنی دیر میں ہمارا دن گزر گیا

○○

پیش رو

✍️...... برجموہن دتا تریہ کیفی دہلوی

احساساتِ قلبی کا شاعر......طالب کاشمیری[1]

اردو بھی اہلِ ہند کی معاشرت کے اور صیغوں کے ساتھ معرض تغیر واصلاح میں ہے۔ یہ کس نتیجے پر پہنچیں گے، ان کا کیا حشر ہوگا، آیا ہم بہتری کی طرف جارہے ہیں یا ابتری کی جانب، یہ ایسے سوال ہیں جن کا جواب انسانی پیش بینی اور مادی فراست سے بالاتر ہے۔ ہمارا روئے سخن اس وقت اردو زبان یا اردو شاعری کی طرف ہے۔ کیا بہ اعتبار ایک بھاشا کے اور کیا بہ اعتبار لٹریچر کے اردو کی توسیع روز افزوں ہے یہی نہیں بلکہ اس کی لغات دن بدن بڑھتی جاتی ہے۔ خیالات کا تنوع، تخیل کی بلند پروازی، حقیقت نگاری، فسانہ پردازی، مظاہر واحساس طرازی کے اسلوب کی طرز اور انشا کے اصول میں بھی تغیرِ عظیم واقع ہوا ہے اور ہورہا ہے جن کا ذکر اس مقام پر ضروری نہیں۔

ہم دیکھتے ہیں کہ پرانے نمونے اب محض ادبیات قدیمہ کی الماری کی زینت بن گئے۔ بصیرؔ کی سنگینی، ذوقؔ کی فصیح بیانی اور معنی آفرینی، مومنؔ کی نازک خیالی، ناسخؔ کی شوکت بیانی،

---

[1] یہ تحریر برجموہن دتا تریہ کیفی دہلوی نے فروری ۱۹۲۵ء کو جموں میں لکھی ہے جو نندلال کول طالب کاشمیری کے پہلے شعری مجموعہ میں بعنوان ''دیباچہ'' کلامِ طالب حصۂ اوّل بہ رشحاتِ تخیل'' شائع ہوئی ہے۔ اُس وقت کے شعری منظرنامہ اور طالب کے متعلق توجہ طلب معلومات فراہم کرنے والی اس تحریر کو ''شیرازہ'' میں بطورِ قندِ مکرر شائع کیا جارہا ہے۔ (ادارہ)

حسنؔ کی سلیس نگاری اور نسیمؔ کی مرصع کاری آج کل کے شعرا کے زیرِ مشق نہیں۔ اساتذۂ سلف میں سے دو کے کلام کو اس وقت پیش نظر رکھا جاتا ہے۔ ان میں سے ایک مرزا غالبؔ ہیں اور دوسرے شاہ نظیرؔ۔ اس بیان کا تعلق غزل کے سوا اور اصناف شعر سے ہے۔ پرانی چال کی غزل پر کم وبیش تمام ملک میں داغؔ کا رنگ حاوی ومسلط ہے۔ متین موضوع پر جو غزلیں لکھی جاتی ہیں وہ زیادہ تر غالبؔ کو آگے رکھ کر لکھی جاتی ہیں۔ اگر چہ قسمِ اوّل میں نسیمؔ دہلوی اور شیفتہؔ کا پرتو بھی جھلکتا ہے۔ غزل کے علاوہ اور کلام منظوم پر نظر ڈالی جائے تو زیادہ تر غالبؔ کے پیرو ملیں گے۔ اگر چہ غالبؔ کے ہاں غزلیں اور چند قصائد ہی ہیں۔ شاہ نظیرؔ کے ہاں دال بیجی کا خوانچہ ہر وقت تیار ملتا ہے جس کی گرما گرم اور چٹ پٹی اجناس کے آگے ہر کوئی اپنی جھولی پسار دیتا ہے۔ اگر چہ مومنؔ کا ترکیب بند مرثیہ جو نظیریؔ کے اہم مضمون ترکیب بند کو دیکھ کر لکھا گیا تھا اور نظیرؔ کے متعدد ترکیب بند برابر پڑھے جاتے تھے لیکن ترکیب بند کو اردو میں خواجہ حالیؔ نے پھر تازہ کیا جس طرح میر انیسؔ اور مرزا دبیرؔ نے مسدّس کو قصیدے کے برابر کر دیا اسی طرح خواجہ حالیؔ نے ترکیب بند کو اس کے برابر لا بٹھایا۔ لیکن اب ترکیب بند میں حالیؔ کا اسلوب رنگ طرازی نہیں کرتا۔ یہ تذکرہ یہاں اس لئے آیا کہ طالبؔ کا کلام ان اساتذہ کے کلام سے پرتو پذیر اور بہرہ اندوز ہوا ہے۔

جس شخص کے ساتھ ادبی تعلق ہو اُس کے کلام کا تبصرہ بہت سی مشکلات کا مولد ہے۔ کبھی یہ ہوتا ہے کہ وہ پرانی وضع کی تقریظ بن جاتا ہے اور کبھی یہ کہ پوری داد سے محروم رہتا ہے جس کا موجب از بس احتیاط ہوتی ہے۔ بایں ہمہ میرے خیال میں متعلقاتِ ادبی اس کا حق فائق رکھتے ہیں کہ اُن کے کلام پر نظر ڈالی جائے۔ پنڈت نند لال کول طالبؔ انگریزی، فارسی اور اردو میں درجۂ فضیلت رکھتے ہیں اُن کی فضیلت سندی ہے کیوں کہ وہ ایم۔اے، ایم۔او، ایل، منشی فاضل اور ادیب فاضل کی ڈگریاں حاصل کر چکے ہیں۔ لواحقات کو مدنظر رکھا جائے تو آپ انہیں ملّاؔ طاہر غنی مرحوم کا ہم وطن پائیں گے۔ اہلِ خطّہ کی تاریخی ذہانت اور فطانت کا اُن

کو پورا موروثی حصّہ قدرت سے ملا ہے۔ ستھرا چلن اور سلامت روی، انکسار، عالی ہمتی اور سادہ مزاجی اُن کے شعار کے جزو اعظم ہیں۔ مزاج تبختر سے معرّیٰ مگر استقامت سے مجلّی ہے۔ حالانکہ نوجوان ہیں لیکن طبیعت جوش وخروش سے بیگانہ ہے۔ ہمدردی اور جوانمردی ان کے آب وِ گل میں ہے۔ یہ اہلیت، یہ سلیم المزاجی اور نیک اخلاقی ان کے اکثر ہم عمروں میں پائی نہیں جاتی۔

اگر بعض محاسن اس مرقع سے خارج ہیں تو وہ اُن کے کلام سے بھی خارج ہیں یا کہئے اس سے زیادہ تعلق نہیں رکھتے۔ چنانچہ ان کی نظموں میں چہل پہل، چھیڑ چھاڑ، دھوم دھام، ولولہ انگیزی، تعلّی اور مبالغہ اور بدیعات اور لفظی مراعات (فرمایئے تو سنسنی خیزی بھی کہہ دوں) کو لیں گے تو جس طرح طبیعت ہمہ گیر واقع ہوئی ہے اسی طرح کلام میں بھی جامعیت کے ساتھ موجود ہیں۔ ایک ما بہ الامتیاز یہ ہے کہ طبیعت چونکہ سلامت روی اور متانت کا جامہ پہنے ہے، کلام میں قاعدے کی پابندی بدرجہ اتم مدنظر رہتی ہے اور یہ سب سے بڑا وصف ہے۔ طالب کے کلام سے نظری سبق اس امر کا ملنا چاہیئے کہ اصول اور قاعدے کی پابندی ملحوظ رکھتے ہوئے ہر صنفِ شعر میں اور ہر موضوع پر نظم کہہ سکتے ہیں۔ انوکھی بندشوں، غرابت، ثقیل لغات، پیچیدہ اسلوب اور ژولیدہ بیانی سے ان کا کلام پاک ہے۔ اس میں ایک نقص پُر گوئی ہے بعض نظمیں اور ترکیب بندوں کے بعض بند بے تحاشا لمبے ہو جاتے ہیں۔ اس سے کلام کی چستی جاتی رہتی اور تکرار کا نقص عائد ہو جاتا ہے۔ امید کی جاتی ہے کہ یہ نقص زیادہ مشق اور پختگیٔ خیال سے خود رفع ہو جائے گا۔

ناظرین کو تعجب ہوگا کہ ایک شخص وادیٔ کشمیر میں پیدا ہو کر اور وہیں رہ کر کیوں کر ایسی ستھری اردو لکھ سکتا ہے۔ یہ شخصیت اور یہ کلام بلند آواز سے اردو کی آئندہ حالت کی پیشگوئی کرتے ہیں یعنی کہ اردو اب وہ زبان نہیں رہی جس کے چلن کو مقامی ٹکسال کی احتیاج ہو جب ایک زبان اپنے مولد ومنشا سے نکل کر دور دراز کیا دور اُفتادہ مقامات میں جا کر سر سبز اور بار آور

ہو سکے تو اس کی درازی عمر اور تشخصِ ذاتی کی نسبت کیا شبہ ہوسکتا ہے۔ جمنا اور گومتی کے لئے فخر کا مقام ہے کہ اُن کی موجیں وتستا کے سر پر اٹھکھلیاں کر رہی ہیں۔ ان کی گنگا جمنی رنگ آمیزیاں ولر اور ڈل کے شفاف آئینوں پر عکس افشاں ہیں امرمیوں کی دلآویز ہوائیں نسیم باغ کے جھونکوں سے پینگ بڑھا رہی ہیں اور جھرنے کی بہار نشاط باغ اور شالامار کے آبشاروں سے سُر ملا رہی ہے۔ طالب چاہے ناراض ہی کیوں نہ ہوں میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اُن کا اردو میں ایسا اچھا شعر کہنا تحسین کے قابل نہیں جتنی آفریں کے قابل اردو کی دلاویز قابلیت، جذباتی استعداد اور عالمگیر ذاتی مناسبت ہے کہ دہلی سے چل کر ہاری پربت کے دامن پر اپنی دلآویزی کا رنگ جما دیا۔ یہ آثار اردو کے لئے نہایت اطمینان بخش ہیں۔

طالب کے کلام میں ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ ہر طرح زمیں اپنا رنگ جما جاتے ہیں۔ اپنے وقت پر وہ یقیناً صاحبِ طرز مانے جائیں گے۔ احساساتِ قلبی کی تصویر کھینچنے میں ان کو کمال کا درجہ حاصل ہے۔ یہی حال حقائق نگاری کا ہے، مناظرِ قدرت کا جیسا سچا اور دلکش نقشہ کھنچتے ہیں، تعریف کے قابل ہے۔ حُبّ قومی کی ٹھیس بھی ان کے دل کو لگ چکی ہے لیکن سلیم المزاجی حد اعتدال سے بڑھنے نہیں دیتی۔ مجاز میں جو کلام ہے اور وہ تھوڑا ہے اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس کوچے سے ذاتی واقفیت نہیں۔ اس کی زُلفِ مسلسل سے زیادہ خم بہ خم اور بھول بھلیاں جیسے رستوں سے نابلد ہیں۔ پھر بھی اس حصّہ کلام میں ایک سہانا بھولا پن اور سادہ دلآویزی پائی جاتی ہے۔ زبان کی درستی اور محاورے کی صحت اس درجے کی ہے کہ ایک اہلِ زبان کے کلام میں اور طالب کے کلام میں فرق کرنا مشکل ہے۔ کسبی محاسن میں ضرور ترقی کی گنجائش ہے جو اُمید ہے کہ اپنے وقت پر ہو جائیں گی۔

مجھے اُمید ہے کہ ہندوستان میں یہ کلام نہایت دلچسپی سے پڑھا جائے گا اور مقبول ہوگا۔

............OO............

ڪھ......ضیاء احمد بدایونی

کہنہ مشق شاعر......طالب کاشمیری[1]

عمریست کہ بلبلہ بہ چمن نغمہ سرایست　　　　رہ نیست دریں باغ مگر بادِ صبارا

اہلِ سیاست اپنی ذاتی اغراض کے پیشِ نظر جو چاہیں کہیں لیکن یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ اردو ہندوستان کے ہندو و مسلمانوں کا مشترکہ سرمایہ ہے جو بقولِ سرتیج بہادر سپرو نا قابلِ تقسیم ہے۔ یہ امر نہ صرف خواص بلکہ عوام کو بھی معلوم ہے کہ اردو ہندوستان ہی کی ایک قدیم زبان (کھڑی بولی) سے نکلی ہے اور اُس کی جڑیں ہماری تہذیب اور تمدن میں دور تک پھیلی ہوئی ہیں۔ ہر زندہ زبان کی طرح مختلف اوقات میں بدلتے ہوئے ماحول کے اثر سے اس میں تغیرات ہوتے رہے ہیں۔ چنانچہ مسلمانوں کی آمد پر اس نے فارسی و عربی الفاظ اور انگریزوں کے آنے پر انگریزی الفاظ کا خیر مقدم کیا اور ان کو محبت سے اپنے دل میں جگہ دی جس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ الفاظ آج اردو ہی کا سرمایہ سمجھے جاتے ہیں۔ سید انشاء نے ''دریائے لطافت'' میں کتنی پتے کی بات کہی ہے کہ فارسی و عربی کے جو الفاظ اپنی اصل سے ہٹ کر مختلف شکل یا مختلف معنی

---

[1] درج بالا تحریر بعنوان ''مقدمہ'' پنڈت نند لال کول طالبؔ کاشمیری کے مجموعۂ کلام ''مرقع افکار'' سے ماخوذ ہے۔ پروفیسر ضیا احمد بدایونی (علی گڑھ) نے یہ تاثرات ۱۲ر مارچ ۱۹۵۲ء میں تحریر کئے ہیں۔ یہ تحریر طالبؔ کاشمیری اور اُن کے عصر سے متعلق نہایت اہم معلومات فراہم کرتی ہے اس لئے ''شیرازہ اردو'' میں بارِ دگر شائع کی جاتی ہے۔

میں اردو کے اندر رائج ہو چکے ہیں اُن کی اصلی ہیئت پر اصرار کرنا غیر مناسب اور ان کو اردو ہی کی ملکیت جاننا واجب ہے۔ یہی اصول ہندی اور سنسکرت کے شبدوں میں بھی کارفرما ہے۔ مثلاً ورشا، وارتا، کشیر، برہمنڑ وغیرہ کی نکھری ہوئی شکل اردو میں برسات، بات، کھیر، برہمن ہے جو خوش آئند اور فصیح تر ہے۔

ہر زبان کے کلمات اسم، فعل اور حرف پر مشتمل ہوتے ہیں۔ اردو کے سرمایہ پر نظر ڈالئے تو آپ پائیں گے کہ اس کے فعل اور حرف پچانوے فیصدی ہندی الاصل ہیں۔ اسما میں ضرور پچاس فیصدی فارسی اور عربی کا عنصر شامل ہے جس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ یا تو یہ اُن تمدّنی اشیا کے نام ہیں جو مسلمان اپنے ساتھ لائے اور جن کے لئے کوئی بدل مقامی زبانوں میں موجود نہ تھا، یا قدیم ہندی لفظ میں ثقل اور کرختگی تھی جس کے باعث وہ لفظ قدرتی موت مر گیا اور اس کی جگہ فارسی یا عربی نے لے لی۔

تاریخ اور لسانیات کے طلبہ واقف ہیں کہ یہ زبان نہ ہندوستان سے باہر کہیں بولی جاتی تھی نہ مسلمان اس کو باہر سے لائے۔ نہ یہ کبھی یہاں کی سرکاری زبان رہی۔ یہ دراصل ہندو مسلمانوں کی زبان تھی جس کو انھوں نے اپنی ضرورت کے مطابق تراش خراش کر کے ایک عمدہ سانچے میں ڈھال لیا۔ ورنہ اہلِ علم تو تصنیف و تالیف کے کاموں میں عموماً سنسکرت یا فارسی و عربی استعمال کرتے تھے۔ یہ ضرور ہے کہ مسلمانوں نے اس کی ساخت و پرداخت میں نُمایاں حصّہ لیا اور مسلمان شاعروں اور نثر نگاروں کی تعداد نسبتاً زیادہ ہے مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ اس سلسلے میں ہندو بھائیوں کی خدمات بھی کافی اہم ہیں۔ انھوں نے تن، من، دھن سے اس پودے کو پروان چڑھایا اور اُن کی اَن تھک کوششوں سے آخر یہ برگ و بار لایا۔

اردو شعرا کے تذکرے اُٹھا کر دیکھ جایئے۔ مسلمانوں کے پہلو بہ پہلو ہندو شعرا کے نام بھی آپ کو کثرت سے ملیں گے۔ یہ امر خاص طور پر قابلِ غور ہے کہ مسلمان تذکرہ نگاروں نے اُن کا ذکر نہایت محبت و احترام سے کیا ہے۔ میر تقی، میر حسنؔ، مصحفیؔ وغیرہ کی تصانیف کو

پڑھ جایئے ہمارے دعویٰ کی تصدیق ہوجائے گی۔ اول تو وہ عہد تعصب اور فرقہ پرستی کی وبا سے پاک تھا پھر ادب کی فضا خاص طور پر صلحِ کل کی فضا تھی۔ جس میں کہیں استاد مسلمان تھا اور شاگرد ہندو تھا جیسے خان آرزوؔ کے شاگرد رائے آنند رام مخلصؔ۔ کہیں اُستاد ہندو اور شاگرد مسلمان جیسے رائے سرب سنگھ دیوانہؔ کے تلامذہ میر حیدر حیراںؔ اور حسرتؔ (اُستادِ جرأت) میر وغیرہ نے جس فراخ دلی اور شائستگی سے ہندو شعرا کا تذکرہ کیا ہے وہ آج بھی ہم سب کے لئے سبق آموز ہے۔ چند نمونے سنیئے۔:

میر صاحب بڑے دماغ دار ہیں لیکن ٹیک چند بہارؔ کی نسبت فرماتے ہیں۔

''مرد مستعد ے ست از یارانِ سراج الدین صاحب تصانیفِ بسیار۔
دماغِ تفصیل ندارم۔ برہمن رنگیں۔ بہارِ سخن از لفظ لفظش ہزار ہزار رنگ
معنی گل میکند۔ بافقیر آشنا ست''

میر حسنؔ کی شہادت رائے سرب سنگھ دیوانہؔ کے متعلق سننے کے قابل ہے۔:

''شاعر زبردستِ فارسی ست۔ شعر بسیار گفتہ است۔ اُستاد ریختہ
گویاں لکھنؤ۔ چنانچہ میاں حسرتؔ و میر حیدر علی حیراںؔ واکثر دیگراں
شاگرد اونید۔ در آنجا مشہور و معروف است۔ دراوائلِ مشق فکر ریختہ ہم
میکرد۔ عجب شخصے ست۔ خدا سلامتش دارد''

اسی طرح مصحفیؔ کی عبارت راجہ جسونت سنگھ پروانہؔ کے حال پر ملاحظہ ہو۔:

''جوانے خلیق وذی شعور است مشقِ او بسیار رساو پختہ گردیدہ.........
ایں ہم خوبی اوست والا شاعر لیش از ہیچ صاحب طبیعتے در مرتبہ کمی نیست۔''

اوپر کے حوالوں سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ باکمال دوسروں کے کمال کے اعتراف میں کبھی تعصب اور تنگ نظری کو دخل نہ دیتے تھے اور دراصل عطر محبت کی یہ شمیم انگیزیاں تھیں جن سے ہندوستانی سماج صدیوں تک معطر رہا۔

جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا اردو کی تعمیر میں برادرانِ وطن کا حصّہ مسلمانوں سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ اپنے دعوے کے ثبوت میں ہم یہاں مختلف تذکروں سے ہندو شعرا کے ناموں پر اکتفا کریں گے۔ مثلاً نکات الشعرا میر تقی میر، آنندرام مخلص، رُسوا، لالہ ٹیک چند بہار، بندرابن راقم۔ عشاق۔

تذکرۂ شعرائے اردو میر حسن، رائے پریم ناتھ، ٹیک چند بہار، سنتوکھ رائے بے نوا، سیانا ناتھ سنگھ، رائے سرب دیوانہ، لالہ گھاسی رام خوشدل، بندرابن راقم، ہلاس رائے رنگیں، خوشوقت رائے شاداب، بھکاری داس عزیز، فارغ، بدھ سنگھ قلندر، لالہ کاشی ناتھ، آنندرام مخلص، راجہ رام نرائن موزوں، عجائب رام منشی، لالہ نول رائے وفا تذکرۂ ہندی مصحفی، راجہ جسونت سنگھ پروانہ، لالہ ٹیکا رام تسلی، لالہ بالمکند حضور، آفتاب رائے رُسوا، لالہ کانجی مل صبا مجنوں، کنور سین مضطر، درگا پرشاد مضطرب، گنگا سنگھ نادر۔

اگر کوئی شخص تمام تذکروں کا استفصار کرنا چاہے تو بے شبہ ہزاروں ناموں کی ایک طویل فہرست تیار کرسکتا ہے۔ اگر اس میں ماضی قریب اور زمانۂ حال کے چند ممتاز ہندو شعرا کے نام بڑھالئے جائیں تو فہرست کمیت و کیفیت کے اعتبار سے وقیع ہوجائے گی۔ مثلاً سرشار، برق، شاد، نظر، سرور، چکبست، رواں، ساحر، شوق، کیفی، طالب، جوش، محروم، وحشی، جگر، فراق، ملا، عرش، تاجور، سحر، منور، بسمل، آزاد وغیرہم۔

شمالی ہند خصوصاً دہلی اور یوپی کو اردو شعروادب کے سلسلے میں جو مرکزی حیثیت حاصل ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ اس علاقے کو چھوڑ کر خطہ جنتِ نظیر کشمیر اس خصوص میں کافی اہمیت رکھتا ہے۔ کشمیر کے سر بہ فلک پہاڑوں، نظر فریب آبشاروں، لہلہاتے سبزہ زاروں اور گنگناتی جوئباروں ہی کے مناظر تو تھے جن کو دیکھ کر عرفی بے ساختہ پکار اُٹھا تھا

زیبائی کشمیر گرش باعثِ عشوہ ست
من می خرام ارزالِ فلک عشوہ گرآید

یہ حقیقت ہے کہ قدرت کی بے دریغ فیاضیوں نے اس قطعۂ ارض کو عروس البلاد بنادیا ہے۔اس لئے کوئی تعجب نہیں اگر کشمیر کے فرزند اپنی غیر معمولی ذہانت وفطانت اور دل ودماغ کی اعلیٰ صلاحیت میں فخر روزگار ہوں۔کون نہیں جانتا کہ پنڈت نہرو، سرسپرو، ملا غنیؔ، علامہ اقبالؔ، مرزا عزیزؔ، آغا حشرؔ اسی خاکِ پاک سے اُٹھے ہیں۔ کشمیر کے ہندو شعرا فارسی اردو کی خدمت میں ہمیشہ سے ممتاز رہے ہیں۔ چنانچہ فارسی شعرا میں برہمنؔ، بہارؔ، بیخودؔ، خوشدلؔ، درویشؔ، ویریؔ، زیرکؔ، ساحرؔ، سرورؔ، صبرؔ، ضمیرؔ، فرخؔ، مبتلاؔ، نیکوؔ، وارستہؔ، اور اردو سخنوروں میں ابرؔ، بیدلؔ، چکبستؔ، رعناؔ، ساقیؔ، سرشارؔ، سعدؔ، شاکرؔ، شوقؔ، طالبؔ، کیفیؔ، گلشنؔ، ملاؔ، نسیمؔ، ہجرؔ کے کارنامے رہتی دنیا تک یادگار رہیں گے۔

زیرِ نظر مجموعہ ''مرقع افکار'' بھی کشمیر کے ایک لائق اور ذی علم پروفیسر پنڈت نندلال صاحب کول طالبؔ ایم، اے کی منظومات پر مشتمل ہے۔جس میں طالبؔ صاحب نے نیچرل، تخیئلی، جذباتی، قومی، مذہبی غرض مختلف موضوعوں پر اظہارِ خیال کیا ہے۔ طالبؔ صاحب ایک خوشگوار اور کہنہ مشق شاعر ہیں جن کا ایک مجموعۂ اشعار آج سے ۲۵ رسال پہلے شائع ہوکر قبولِ عام حاصل کر چکا ہے۔موجودہ مجموعے کو اوّل سے آخر تک پڑھنے کے بعد جو تاثرات ہمارے ذہن میں پیدا ہوئے حسبِ ذیل ہیں:

(الف):......طالبؔ صاحب کو شعر سے فطری ذوق اور طبعی مناسبت ہے کسی داخلی یا خارجی محرک کے برروئے کار آتے ہی اُن کا ذہن اُن کو تخیئل کی وادیوں میں رہبری کرتا ہوا شعر کی دنیا میں پہنچا دیتا ہے جس کا نتیجہ اُن کی نظمیں ہوتی ہیں۔ یہ نظمیں کبھی نوروز، بسنت، بہار، شفق، قوسِ قزح سے متعلق ہوتی ہیں۔کبھی شکوہ دوست، نامۂ محبوب، جلوۂ دلدار سے، کبھی نورجہاںؔ اور غالبؔ اُن کا موضوعِ فکر ہوتے ہیں کبھی سری کرشن اور جنم اشٹمی اور کبھی کشمیر کے قومی اور ملی مسائل اور جو کچھ وہ کہتے ہیں خود محسوس کر کے کہتے ہیں۔

(ب) اُن کے کلام میں تخیئل کا عنصر کافی ہے جس نے موقع موقع سے نئی دلکش

تشبیہوں کا چمن کھلا دیا ہے۔ بہت ممکن ہے کہ ان لطیف تشبیہات کا سر رشتہ اُن کے جنت نظیر اور فردوسِ نظر وطن کے ماحول سے جا ملتا ہو۔ لیکن خود ان کی باغ و بہار طبیعت کی گل کاری کو اس میں خاص دخل ہے۔

از بسکہ خاطر ہوسِ گل عزیز بود
خوں گشتہ ایم وباغ وبہارِ خودیم ما

چند مثالیں ملاحظہ ہوں

شفق

محوِ آرائش عروسِ نو بہارِ شام ہے ۔ گنبدِ اخضر پہ عکسِ ارغواں ہے نور پاش
موج زن خونِ تمنائے دلِ ناکام ہے ۔ ہے مۓ احمر کا مینا سے فلک میں ارتعاش
برقعِ تاریک میں
پردۂ باریک میں

قوسِ قزح

ہے بحرِ موّاج میں تلاطم بکھر رہی ہے ہوائے دلکش
سنور رہی ہے کوئی دوشیزہ ادا سے اوڑھے ردائے دلکش
کنارِ ہستی میں آب جو ہے ضیائے خورشید سے منوّر
کہ عالمِ رنگ میں تبسم سے ہے کسی کے فضا معطّر
ہے اس میں وہ طرزِ کج ادائی نہیں ہے حد و حساب جس کا
ملے خمیدہ کمانِ ابروئے یار میں کیا جواب اس کا
یہ فکرِ اہلِ نظر میں ہالہ ہے کرشن کے روئے دلنشیں کا
پریمیوں کے گماں میں حلقہ ہے حُسن کے موئے عنبریں کا

اس طرح ''سورج کی پہلی کرن'' کی تشبیہات بھی اپنے رنگ میں خوب ہیں۔

(ج) اُن کے یہاں لطیف جذبات اور نازک احساسات کی فراوانی ہے، خصوصاً انھوں نے اپنے ہونہار عزیز فرزند کی موت پر جو مرثیہ لکھا ہے اس قدر پُر تاثیر ہے کہ کوئی شخص اس کو چشمِ پُرنم کئے بغیر نہیں پڑھ سکتا۔

تحقیقِ حالِ ما زنگہ می تو اں نمود | حرفے زحالِ خویش بہ سیما نوشتہ ایم

پوری نظم کا نقل کرنا طوالت سے خالی نہیں اور ایک دو بندوں سے پورا مرقع سامنے نہیں آتا۔ تاہم مالا یدرک کلّہ لا یترک کلّہ چند شعر سنیئے۔

چاہتا ہوں کہ نُمایاں غمِ پنہاں ہوجائے
ترجمانِ غمِ دل خاطرِ سوزاں ہوجائے
لذّتِ شورشِ وحشت نمک افشاں ہوجائے
ٹکڑے دامن کے اُڑیں، چاک گریباں ہوجائے
اک کشش کھینچے ہوئے مجھے لئے جاتی ہے
کان میں کھوئی ہوئی کوئی صدا آتی ہے
کھا گئی کس کی نظر تجھ کو مری جاں ہے ہے
ہوگیا تو نگہِ شوق سے پنہاں ہے ہے
کیا سیہ روز ہوں میں کُشتۂ حرماں ہے ہے
دل کے دل ہی میں رہے سب مرے ارماں ہے ہے
رقت انگیز نہ کیوں کر ہو کہانی تیری
حیف صد حیف کہ دیکھی نہ جوانی تیری

نور جہاںؔ اور غالبؔ پر جو نظمیں ہیں ان میں بھی جذبات لطیف کی کمی نہیں۔

(د) اُن کے خیالات میں پاکیزگی اور اندازِ بیان میں ستھرا پن ہے اور کسی جگہ بھی ابتذال اور سوقیت کا شائبہ نہیں۔ راقم کو پروفیسر صاحب موصوف سے ذاتی طور پر نیاز حاصل نہیں ہے مگر اس قدر وثوق سے کہا جاسکتا ہے کہ اُن کی شاعری پر روحانی پاکیزگی کی جو فضا چھائی ہوئی ہے وہ اُن کی صوفیانہ طرز فکر کا نتیجہ ہے اور خیال کی وسعت اور انداز کی متانت اس کے قدرتی لوازم ہیں۔

(ھ) طالبؔ صاحب کا وطنِ مالوف کشمیر جو دہلی، آگرہ اور لکھنؤ سے کوسوں دور ہے لیکن یہ دیکھ کر مسرت ہوتی ہے کہ اُن کو زبان اور بیان پر پوری قدرت حاصل ہے۔ یہ ایک مزید ثبوت ہے اس امر کا کہ اردو کسی خاص صوبے یا طبقے کی ملکیت نہیں ہے۔ اُن کے کلام میں بے

ساختگی اور روانی کی افراط ہے۔ نظموں پر نظمیں پڑھ جایئے یہ گمان نہیں ہوتا کہ یہ ایک ایسے فرد کا کلام ہے جس کی مادری زبان کشمیری ہے۔ ممکن ہے کہ کافی احتیاط کے باوجود بعض خوردہ بین نگاہیں دیوان میں کسی جگہ زبان کا سُقم یا بندش کی سستی محسوس کریں۔ لیکن لغزش سے کون بشر خالی ہے۔ واقعی اگر یہ نہ ہو تو انسان کو انسانیت کی حدود سے آگے بڑھنے کا حوصلہ ہونے لگے۔

مجھے یہ ڈر ہے کہ ایمان لے نہ آئیں لوگ
خدا کرے غلطی کچھ مرے سخن میں رہے

تاہم یہ واقعہ ہے کہ دیوانِ مذکور مجموعی طور پر اردو میں ایک اچھا اضافہ ہے اور ہمیں توقع ہے کہ ہمارے ملک کے ادبی حلقوں میں اس کو عام مقبولیت نصیب ہوگی۔

زبان کا کلچر سے اور کلچر کا سوسائٹی کی زندگی سے جس قدر گہرا تعلق ہے اُس سے کوئی انکار نہیں کرسکتا۔ اس سلسلے میں اردو جو ہماری مشترکہ کلچر اور ہندو مسلم اتحاد کا امتیازی نشان ہے ایک مخصوص درجہ رکھتی ہے۔ ہمیں اُمید ہے کہ طالبؔ صاحب کی طرح ہمارے وطن کے دوسرے وسیع النظر اور ہمدرد اصحاب بھی دیس کی موجودہ تاریک فضا کو دیکھتے ہوئے دور دراز علاقوں میں اپنے امکان بھر اردو کی مشعل روشن رکھیں گے اور اس عمارت کو جسے اُن کے بزرگوں نے پریم کی بنیادوں پر قائم کیا تھا برقرار رکھنے میں کامیاب ہوں گے۔

خلل پذیر بود ہر بنا کہ می بینی
مگر بنائے محبت کہ خالی از خلل است

............○○............

انتخابِ کلام

نندلال کول طالب کاشمیری

پیامِ نوروز

○

رات کا پچھلا پہر تھا ، جلوۂ مہتاب تھا
شاعرِ خوشگو ابھی محوِ خمارِ خواب تھا
صبحِ خنداں جلوہ ہائے نو سے ہم آغوش تھی
دل نشیں انداز سے ساری فضا خاموش تھی
عرش سے اُترے فرشتے نور برساتے ہوئے
فرش والوں کی تمناؤں کو گرماتے ہوئے
اہتمامِ سالِ نو میں لے کے پیغامِ نشاط
آئے اور عالم پہ چھائے بن کے نورِ انبساط
چپکے چپکے آگئے شاعر کے مسکن کی طرف
بڑھتے بڑھتے بڑھ گئے اُس کے نشیمن کی طرف
پاسِ دلداری سے ہمدردی کا دم بھرنے لگے
رازدارانہ بہم سرگوشیاں کرنے لگے
کان میں شاعر کے جب الہام کی آئی صدا
جاگ اُٹھا ، جائزہ ماحول کا لینے لگا
دیکھ کر نوواردوں کو محو حیرت ہوگیا
دم بخود سا رہ کے منظر میں سراپا کھوگیا
بیخودی کا شاخسانہ تھی کششِ الہام کی
یا مسرّت قاصدِ نوروز کے پیغام کی
سحر تھا، جادو تھا یا افسوں تھا اس آواز میں
آگئی قوت تخیل کے پرِ پرواز میں
تن بدن میں اُس کے دوڑی لہر اک سرعت کے ساتھ
انتشارِ قلب پر قبضہ کیا ہمت کے ساتھ
کھچ گیا چشمِ حقیقت بیں میں نقشہ قوم کا
گوشِ شنوا جس کے حالِ بد سے تھے نا آشنا
جوش دل میں آگیا، جذبات میں جاں آگئی
حالتِ کیف آفریں دیوار و در پہ چھاگئی
ذرّہ ذرّہ میں بہارِ زندگی پیدا ہوئی
پیکرِ افسردگی میں جان سی پیدا ہوئی
ہوگیا عالم پہ طاری ارتعاش و اضطراب
نغمۂ شاعر نے پیدا کردیا اک انقلاب

○○

کھ......نندلال کول طالبؔ کاشمیری

بسنت

بسنت میں شگفتہ ہے حدیقۂ بہارِ گُل
چمن کی شاخ شاخ پر ہے جلوۂ نگارِ گُل
بھڑ ک اُٹھا شرارِ گُل

بھڑک اُٹھا شرارِ گُل ترنمِ نشاط میں
عجب مزے ہیں عندلیب وگُل کے ارتباط میں
سرور و انبساط میں

سرور و انبساط میں طیور نغمہ زن ہوئے
نظر نواز نو بہ نو گلوں کے پیرہن ہوئے
شجر بھی گلبدن ہوئے

شجر بھی گلبدن ہوئے، ہے لالہ آج مے پرست
عروسِ نو بہار بھی مۓ شباب سے ہے مست
خزاں ہے مائلِ شکست

خزاں ہے مائلِ شکست، گل کی آب وتاب سے
اُبھر رہے ہیں ولولوں کی موج سے حباب سے
بہارِ لا جوب سے

بہارِ لاجواب سے ہیں رِند محوِ ہاوہو
ہے ذرّہ ذرّہ چمن شگوفہ ریز سُو بہ سُو
مثالِ برق شعلہ رُو

مثالِ برق شعلہ رو شگفتہ لالہ زار ہیں
سرور خیز گردنوں میں گل رخوں کے ہار ہیں
بہار پر نثار ہیں

بہار پر نثار ہیں، جہاں کے صبر و ہوش بھی
فضا میں گونجنے لگی نوائے ناو نوش بھی
دلوں میں ہے خروش بھی

دلوں میں ہے خروش بھی، ہوائے خوشگوار سے
بسنت کی رُت آئی ہے بہار کے دیار سے
ہر ایک اعتبار سے

ہر ایک اعتبار سے، شگفتہ حسنِ یار ہے
نگاہِ انتخاب اب سکون در کنار ہے
یہ شانِ کردگار ہے

یہ شانِ کردگار ہے کہ جلوہ گاہِ ناز ہے
یہ مظہرِ جمال ہے کہ لطفِ کارساز ہے
یہ انکشاف راز ہے

یہ انکشافِ راز ہے، شہود اور ظہور کا
ہے انعکاسِ سوزِ دل میں ارتعاش نور کا
نگاہِ شوق لڑ گئی درِ حریمِ ناز سے
دل وجگر اُچھل پڑے ہوائے سوز و ساز سے

............OO............

قوسِ قزح

سفینۂ نیرنگِ دہر کا ہے محیطِ چرخِ بریں کے اوپر
لباسِ کثرت میں نورِ وحدت برس رہا ہے زمیں کے اوپر
تجلّیٔ ذات ہے نمایاں صفت کے پردے میں راز ہوکر
کہ چند شمعیں چمک رہی ہیں امینِ سوزو گداز ہوکر
حقیقتِ جوشِ ابرِ باراں فضائے عالم میں موجزن ہے
نمونۂ موجِ حوضِ کوثر طراوتوں سے ہر انجمن ہے
کہ ہیرے ، پنّے ، عقیق ، پکھراج اور نیلم کی یہ حمائل
پہن کے ذوقِ نظر نوازی پہ حسنِ فطرت ہوا ہے مائل
جہاں کی نیرنگیوں کا اوراقِ چرخ پر منعکس ہے نقشہ
کھِچا ہے یا حور کی جبیں پر یہ دلکش و دلفریب قشقہ
شہیدوں کے خونچکاں کفن کررہا ہے کیا خشک دستِ قدرت
کہ اس کے نظارے سے ہوا ہے ہلال پابندِ شرم و غیرت

نہ سلکِ گوہر میں یہ چمک ہے نہ اس قدر دل رُبا ہیں تارے
چھپی ہے پردے میں ابر کے کہکشاں اسی سے حیا کے مارے

ہے بحرِ موّاج میں تلاطم نکھر رہی ہے ہوائے دلکش
سنور رہی ہے کوئی دوشیزہ ادا سے اوڑھے ردائے دلکش

کنارِ ہستی میں آبِ جو ہے ضیائے خورشید سے منور
کہ عالمِ رنگ میں تبسّم سے ہے کسی کے فضا معطر

ہے اس میں وہ طرزِ کج ادائی نہیں ہے حد و حساب جس کا
ملے خمیدہ کمانِ ابروئے یار میں کیا جواب اس کا

یہ فکرِ اہلِ نظر میں ہالہ ہے کرشن کے روئے دل نشیں کا
کہ پریمیوں کے گماں میں حلقہ ہے حسن کے موئے عنبریں کا

یہ دفترِ حسن و عشق کی بے مثال اور ہفت رنگ جدول
بجا ہے کہئے جو کلکِ معجز نگار قدرت کا نقشِ اول

نہاں نہاں کارسازِ فطرت نقوش اس کے مٹا رہا ہے
کہ اس پہ طاؤس اپنے رنگیں پروں کا پردہ گرا رہا ہے

غرض یہ ایسی ہے جیسے شاعر کے ذہن میں پیکرِ ہوائی
ہمیشہ معمورِ انقلاباتِ نو بہ اندازِ دل ربائی

............OO............

.....نند لال کول طالبؔ کاشمیری

ایک دلکش رات

وقفِ تنعم روئے زمیں ہے محوِ ترنم عالمِ بالا

مست اور سرخوش قلبِ حزیں ہے

مست اور سرخوش قلبِ حزیں ہے ہر بادل ہے کالا کالا

ساقی لے آ بادۂ رنگیں

وادیٔ گُل کیا خلد آئیں ہے

وادیٔ گل کیا خلد آئیں ہے رقص میں ہے ہر ندی نالا

کیف میں ہیں سرشار یہاں سب

دیدۂ دل ہے منظرِ رنگیں

شاہدِ فطرت خندہ جبیں ہے

شاہدِ فطرت خندہ جبیں ہے حسن نے جوبن خوب نکالا

محوِ تماشا ہر دل والا

مست ہے ساری بزم یہاں اب

جذبۂ دل ہے محشر آگیں

سازِ مکاں میں سوزِ مکیں ہے

(۲)

مست فضائے روئے زمیں ہے رنگِ شفق مے خانہ گستر

کافر سارا جلوۂ بُستاں

کافر سارا جلوۂ بستاں نازشِ غنچہ غمزۂ دلبر

لیلیٰ شب ہے پھر زلف آرا

نکہتِ گیسو شامِ بہاراں

نکہتِ گیسو شامِ بہاراں حُسنِ تصور، رنگیں پیکر

گویا فطرت خاموشی میں

محوِ اشارہ اک اک تارا

محفلِ انجم سبحۂ تاباں

محفلِ انجم سبحۂ تاباں دامنِ گردوں چشمۂ اخضر

ادنیٰ و اعلیٰ ، بدتر و برتر

ہر اک ہے مسرورِ نظارہ

فتنۂ محشر جوشِ جواناں

(۳)

نور کا دریا چرخِ بریں ہے فرشِ زمیں ہے تختۂ رنگیں

تاروں میں ہے سامانِ تبسّم

تاروں میں ہے سامانِ تبسّم دامنِ صحرا، دامنِ گل چیں

بحرِ تفکّر میں ہے وہ ہلچل

سکتے میں ہے ہر موجِ تکلّم

سکتے میں ہے ہر موجِ تکلّم   جلوۂ قدرت عارضِ سیمیں

آئینہ خانہ حُسن سراسر
چشم خماریں کیفِ مسلسل

خاطرِ صوفی وقفِ تلاطم

خاطرِ صوفی وقفِ تلاطم   صرف تبسّم ہیں لبِ رنگیں

کاکلِ شب میں طرۂ مشکیں

عقدِ ثریا ، جعد منوّر
غرقِ تحیّر سارے جل تھل
اشکِ رواں میں لطف ترا کم

............○○............

سورج کی پہلی کرن

ہے جلوہ ریز سوئے زمیں آسماں سے
شمعِ سپہر وارض جہاں گرد آفتاب
تصویرِ آفتاب وتاب

ہے موجِ زر نگار شبِ ماہتاب میں
یا لُطف خیز جزر و مدِ دورِ انقلاب
تفسیرِ اضطراب

یا جامِ چرخ سے مۓ احمر چھلک گئی
یا جوہرِ بلّور کا ہے حُسنِ بے مثال
آئینۂ کمال

انگڑائی ہے نشے میں یہ مستِ شباب کی
یا رقص میں ہے محو کوئی شوخِ مہ جمال
باعشوہ ودلال

کوئی ملک ہے نور کے ہالے میں جلوہ گر
یا کوئی حُور عالمِ وجد وسرور میں
نازاں غرور میں

لرزاں یہ روشنی ہے دُرِ تابدار کی
یا غرق تارِ کاہکشاں بحرِ نور میں
ضُو کے وفور میں

نقش و نگارِ قدرتِ حق کا ظہور ہے
یا نور پاش تابشِ افشاں مہ جبیں
خوش رنگ ودل نشیں

پیغامِ زیست مُردہ دلوں کا کہوں اسے
یا جلوۂ تبسّمِ محبوبِ نازنیں
یا اِک خطِ جبیں

ہے یہ خلاصہ گردشِ لیل ونہار کا
یا دیدہ زیب گوشۂ دامانِ آرزو
مفتونِ شانِ ہُو

رنگینیٔ بہار سے تشبیہ دوں اسے
یا خواہشِ دروں کی کہوں اس کو جستجو
آوارہ چار سُو

تسکین سوزِ قلب کی اس میں نہاں ہے اب
تاریکیٔ ممات میں وجہِ حیات ہے
غم سے نجات ہے

جاگ اُٹھے ذرّہ ذرّہ نہ کیوں کائنات کا
پُرنور اس کے دم سے رُخِ شش جہات ہے
کیا خوش صفات ہے

اے منزلِ حیات کے وامانده راہرو
اس خوابِ بےخودی سے ہو اب شرمسار، اُٹھ
ہو ہوشیار، اُٹھ

اے طالبِ سعادتِ دنیا و آخرت
اُٹھ ولولے کی طرح تُو، بے اختیار، اُٹھ
اور بے قرار، اُٹھ

............OO............

نندلال کول طالبؔ کاشمیری

جلوۂ دلدار

(۱)

دہر کے گلزار میں لطف دکھاتا ہوا
پھول اُڑاتا ہوا
نرگسِ مستانہ سے کیف بڑھاتا ہوا
درد مٹاتا ہوا
صرفِ خرامِ بہار
جلوۂ دلدار ہے

(۲)

پھول میں ہے رنگ وبو اور ہے موتی میں آب
برق میں اک اضطراب
روح و دل و جان عشق حاملِ صد انقلاب
نغمے سناتا ہوا
صرفِ خرامِ بہار
جلوۂ دلدار ہے

(۳)

عشرتِ خلدِ بریں طنطنۂ لا مکاں

دولتِ ہر دو جہاں

محورِ دنیا و دیں مقصدِ پیر و جواں

دل میں سماتا ہوا

صرفِ خرامِ بہار

جلوۂ دلدار ہے

(۴)

جذبۂ دردِ نہاں خاطرِ ناشاد کو

فطرتِ آزاد کو

گوشۂ ہر بزم میں عالمِ ایجاد کو

رقص میں لاتا ہوا

صرفِ خرامِ بہار

جلوۂ دلدار ہے

(۵)

بھرتا ہوا اک بہار پیکرِ مسرور میں

طالبِ رنجور میں

جوش اُٹھاتا ہوا دیدۂ مخمور میں

فتنے جگاتا ہوا

صرفِ خرامِ بہار

جلوۂ دلدار ہے

(۶)

رنگ بدلتا ہوا حُسنِ جہانگیر میں
عشق کی تاثیر میں
سوز کی تعبیر میں ساز کی تعمیر میں
راز بتاتا ہوا
صرفِ خرامِ بہار
جلوهٔ دلدار ہے

(۷)

کلبهٔ درویش میں کاخ و شبستان کا
قصر کا ایوان کا
محفلِ اغیار میں اُلفت و احسان کا
رنگ چڑھاتا ہوا
صرفِ خرام بہار
جلوهٔ دلدار ہے

(۸)

دل کو مسلتا ہوا طالبِ دیدار کے
بے کس و ناچار کے
وسعت کونین میں کاکلِ خم دار کے
دام بچھاتا ہوا
صرفِ خرامِ بہار
جلوهٔ دلدار ہے

............OO............

✍……نندلال کول طالبؔ کاشمیری

تنہائی

میں آغوشِ تنہائی میں سرمستِ تصور رہتا ہوں
خود گوشِ ہوش سے سنتا ہوں جب غم کی باتیں کہتا ہوں
جب غم کی باتیں کہتا ہوں سرمستِ تصور رہتا ہوں

کچھ راحت ایسی ملتی ہے اک وجد سا طاری ہوتا ہے
پھر یاد کسی کی آتی ہے دل ہوش و خرد سب کھوتا ہے
دل ہوش و خرد سب کھوتا ہے اک وجد سا طاری ہوتا ہے

اک کیفِ مسرت ملتا ہے گلزار کی سرد ہواؤں میں
میں نغمۂ دلکش سنتا ہوں شب کی خاموش فضاؤں میں
شب کی خاموش فضاؤں میں گلزار کی سرد ہواؤں میں

بے بادہ ہو کے عالم میں مستوں کا رنگ بدلتا ہے
دنیا کی گردش کے بدلے وحدت کا ساغر چلتا ہے
وحدت کا ساغر چلتا ہے مستوں کا رنگ بدلتا ہے

پھر موجِ ترنم اُٹھتی ہے رندانِ الست کی محفل میں
اور سازِ محبت بجتا ہے اک سنّاٹے کی منزل میں
اک سنّاٹے کی منزل میں رندان الست کی محفل میں

عقبیٰ کی حسرت مٹتی ہے دنیا کی یاد بھی جاتی ہے
پردہ جو دوئی کا اٹھتا ہے دنیا کی یاد بھی جاتی ہے
یک رنگی رنگ جماتی ہے دنیا کی یاد بھی جاتی ہے

احساسِ خودی تنہائی میں کچھ ایسا غالب ہوتا ہے
خود بندہ خالق بنتا ہے مطلوب ہی طالب ہوتا ہے
مطلوب ہی طالب ہوتا ہے کچھ ایسا غالب ہوتا ہے

خود رفتہ ہوں کچھ ہوش میں ہوں کچھ سنتا ہوں کچھ کہتا ہوں
میں آغوشِ تنہائی میں سرمستِ تصور رہتا ہوں
سرمستِ تصور رہتا ہوں کچھ سنتا ہوں کچھ کہتا ہوں

…………OO…………

…… نندلال کول طالبؔ کاشمیری

خطاب بہ خواب

(۱)

اے منبعِ کیفیتِ آرامِ دل و جاں اے مخزنِ سرمایۂ تسکین فرواں
اے دافعِ آزارِ خیالاتِ پریشاں اے رافعِ آثارِ تعب ، نافعِ گیہاں
اے راحت وآسائشِ مخلوق کے ساماں بھولے نہیں اب تک وہ ترے لطف، وہ احساں

(۲)

ہوں محوتری دُھن میں نہ کیوں خوابِ مسرت مقدم ہے ترا یا کرم شاہدِ فطرت
ہے تیری خموشی میں نہاں جلوۂ قدرت تاریکیٔ شب میں ہے تو دمسازِ طبیعت
ہے کون بشر جس کو نہیں تجھ سے ارادت اے پردہ براندازِ رُخِ حسنِ حقیقت

(۳)

تو سحر ہے، نیرنگ ہے، فتنہ ہے کہ جادو تو غمزۂ دلکش ہے کہ عشوۂ دل جُو
خمیازہ میں تیرے ہے نہاں حُسن کا پہلو وا دیدۂ دل ہوگئے آیا جو نظر تُو
ہے تجھ میں بسی گلشنِ الہام کی خوشبو کیا وصف ترا مجھ سے ہو اے شاہدِ خوش خُو

(۴)

پاس آ نگہِ شوق میں کرلوں تجھے مستور
اور دامنِ مژگاں کو کروں نور سے معمور
لوں کروٹیں پھر ذوق سے ہو جاؤں جو مسرور
دنیا کی تن آسانیاں مجھ کو نہ ہوں منظور
ہو تیری دل آرائی کبھی مجھ سے نہ پھر دور
الطاف وکرم تیرا زمانے میں ہے مشہور

(۵)

نومید کیا حیف تمنائی کو اپنے
مٹی میں ملاتے نہیں سودائی کو اپنے
محروم ولا کر نہ تولّائی کو اپنے
مایوسِ نظر کر نہ تماشائی کو اپنے
پامال کہیں کرتے ہیں شیدائی کو اپنے
اک جامِ مۓ ناب دے صہبائی کو اپنے

(۶)

اب میرے لئے تیری جدائی ہے جگر سوز
بیٹھا ہوا سینے میں ہے اک ناوکِ دلدوز
کردے مجھے الطاف سے اپنے طرب اندوز
ہو جا کہیں شب ہائے خزاں میں نظر افروز
بے طرح تری یاد ستاتی ہے شب و روز
تجھ سا تو زمانے میں نہیں کوئی رم آموز

(۷)

تو آئے تو بھولے مجھے سارا غمِ دنیا
حتیٰ کہ فراموش ہو اندیشۂ عقبیٰ
تو آئے تو ہو جائے مری روح شکیبا
آ اے مری آنکھوں کے نگہبان ، چلا آ
ہو جائے نظر سے مری معدوم یہ دنیا
اس کون و مکاں پر ہو مجھے خواب کا دھوکا

(۸)

میں دار کے قابل نہ درِ یار کے قابل
لے دے کے ہوں بس سایۂ دیوار کے قابل
اب حالِ دل اپنا نہیں اظہار کے قابل
رفتار کے قابل ہوں نہ گفتار کے قابل
آنکھیں ہیں فقط تیرے ہی انوار کے قابل
ہوں طالبِ دید اور نہ دیدار کے قابل

............○○............

شری کرشن جی کی بانسری

دیکھو وہ شام سندر مرلی بجا رہے ہیں
رس راگ کے کرشمے کیا کیا دکھا رہے ہیں
کس کس ادا سے میٹھے نغمے سنا رہے ہیں
رنگیں نوائیوں کی گنگا بہا رہے ہیں
ہونٹوں کے زیر و بم سے طوفاں اُٹھا اُٹھا کر
خاموشیٔ فضا میں ہلچل مچا رہے ہیں
شاداب گلشنوں میں خوابیدہ بستیوں کے
سنسان جنگلوں میں آوارہ ہستیوں کے
عالم میں بے خودی اور بیدار مستیوں کے
بالا بلندیوں سے نزدیک پستیوں کے
نیرنگیٔ جہاں کے فتنے جگا جگا کر
سوز و گداز بن کر دنیا پہ چھا رہے ہیں

چھن چھن کے آ رہی ہیں من موہنی صدائیں
اُٹھ اُٹھ کے جھومتی ہیں بکھری ہوئی گھٹائیں
انگڑائیوں کے بس میں ہیں رس بھری ہوائیں
کروٹ بدل رہی ہیں سوئی ہوئی فضائیں

آواز دور رس میں گردھر سما سما کر
مثلِ صدائے گنبد چکر لگا رہے ہیں

اپنے خیال بھولے گئویں، گوال سارے
پنچھی، ہرن، چکارے بھرنے لگے طرارے
اس زیر و بم میں گم ہیں جمنا کے دو کنارے
محوِ سرودِ نو ہیں گوپال کرشن پیارے

پیالے سے جذبِ دل کے مے پیت کی پلا کر
دور و قریب سب کو متائے جا رہے ہیں

طنبور اور دف ہیں اسبابِ جاں نوازی
تارِ رباب و بربط، آہنگِ سحر سازی
سُر جل ترنگ کے ہیں وجہِ فسوں طرازی
لیکن نہیں ہے ان میں وہ شانِ امتیازی

چھپ چھپ کے جس سے نٹ ور جادو چلا چلا کر
عالم میں اپنے فن کا سکّہ جما رہے ہیں

سکھیوں نے جھولے ڈالے، سب جھولنے کو آئے
پینگیں بڑھا بڑھا کر ساون کے گیت گائے
آوازِ کرشن سن کر حسرت کے تیر کھائے
ہوش اُن کے لڑکھڑائے، اوسان ڈگمگائے

رنگ اور راگنی کی چھینٹیں اُڑا اُڑا کر
گھنشام لخلخہ خود اُن کو سنگھا رہے ہیں

گانے لگا پپیہا حمدِ جنابِ باری
موروں کے شور میں ہے اندازِ نغمہ باری
طوطے کے بولِ میٹھے، کوئل کی کوک پیاری
بنسی کے راگ سے ہے لیکن وہ وجد طاری
جس کے مقابلے میں گردن جھکا جھکا کر
شرم وحیا کے مارے سب منہ کی کھا رہے ہیں

راگی نے مست ہوکر دل سوز راگ گایا
دھیانی نے دُھن میں ہر کے چرنوں سے چت لگایا
گیانی نے گیان ورنن کرنے میں سُکھ اُٹھایا
لیکن کسی عمل میں ایسا مزا نہ پایا
چت چور جس ادا سے چنتا مٹا مٹا کر
پہلو میں ہر منش کا دل گد گدا رہے ہیں

آکاش سے اُچھل کر شمس وقمر ہیں رقصاں
روئے زمیں پہ کیا کیا شاخ وشجر ہیں رقصاں
پربت کی گودیوں میں سنگ وحجر ہیں رقصاں
موجوں میں پانیوں کی درّو گہر ہیں رقصاں
ہر ذرّۂ جہاں کو موہن نچا نچا کر
برہمانڈ راس منڈل اب بھی رچا رہے ہیں

اُٹھی صدائے سرمد جس سے وہ نَے یہی ہے
اور نعرۂ انا الحق کی اصل لَے یہی ہے
جس نے امر بنایا میرا کو مَے یہی ہے
تھی گوپیوں میں جس سے چھل بل وہ شے یہی ہے
اب بھی ہیں آپ ہی جو جلوے دکھا دکھا کر
مرکز کی سمت اپنے سب کو بلا رہے ہیں

اے دو جہاں کے مالک ، اے حسنِ کبریائی
ارضِ و سما کے خالق ، مختارِ کُل خدائی
طالبؔ کو بھی عطا کر وہ ذوقِ ہم نوائی
مٹنے نہ پائے جس سے یہ دردِ آشنائی

قدموں میں تیرے اپنی ہمت بڑھا بڑھا کر
ہم آہ! مدّتوں سے آنکھیں بچھا رہے ہیں

..........OO..........

طلب یا شوق

طالبِ صادق کے دل میں جلوہ گر ہو شوقِ دید
بہرِ وصلِ مالکِ کُل ہے یہی فالِ سعید
شوق جس دل میں نہیں وہ لائقِ عزت نہیں
جو نہیں جویائے حق وہ صاحبِ ہمت نہیں

شوق ہی کی ابتدا ہے باعثِ تحریکِ وصل
شوق ہی کی انتہا ہے مژدۂ تبریکِ وصل
ہے طریقِ حق میں دائم حاجتِ سامانِ شوق
دستگیرِ طالبِ صادق ہے یہ طوفانِ شوق

شوق کیا ہے ! دل کو اسرارِ حقیقت کی طلب
شوق کیا ہے ؟روح کو پروازِ رفعت کی طلب
بے طلب کچھ بھی زمانے میں کوئی پاتا نہیں
بے نیازی سے کسی کو ہاتھ کچھ آتا نہیں

روٹی بھوک کے لئے، پانی ہے پیاسے کے لئے
بے ضرورت کون پھرتا ہے خزانے کے لئے

دہر میں ہر شے ہے بے شک مستحق کے واسطے
اہلِ دل مخصوص تر ہیں ذاتِ حق کے واسطے

زندگانی بنتی ہے جلوے سے جب وسعت پذیر
تجربے سے چشمِ انساں ہوتی ہے عبرت پذیر

خود بخود سچی طلب کا ہوتا ہے جوہر عیاں
جس سے ہوتا ہے رُخِ مطلوب انساں پر عیاں

..........OO..........

مالکِ کل

خواہش ادھکاری کو رہتی ہے کہ ہو وہ باکمال
اس لئے ست پُرش کا مطلوب ہے اس کو وصال

جو ہے کامل کچھ اسے اسباب کی حاجت نہیں
ایسی ہستی میں سرور و علم کی قلت نہیں

شئے ناقص میں عیاں ہے شورشِ نقص وفتور
نقص ہی ہے باعثِ تشویش وغم ، فسق و فجور

ہستیٔ موجودہ انساں کی ہے ناقص ، بے اثر
انتشار وموت سے جس کو نہیں ہرگز مفر

باوجودِ علمِ دنیاوی نہیں ہم میں شعور
باوجودِ عیش و عشرت ہم ہیں محرومِ سرور

کون کہہ سکتا ہے اس ہستی کو پھر اصلی حیات؟
خاک ایسی زندگی پر جو ہو پابندِ ممات!

داغِ ناکامی وحسرت پے بہ پے کھاتے ہیں ہم
سہتے سہتے رنج وغم دنیا سے اُٹھ جاتے ہیں ہم

طالبِ حق، حق بجانب ہے جو یہ کرلے سوال
کیا سرور وعلم و ہستی میں ہے امکانِ کمال

اس سوالِ دلکشا کا 'سنت' دیتے ہیں جواب
ہاں! ہراک جو یندہ ہوگا فیضیابِ اکتساب

شرط ہے سچی طلب ہو، رہروِ جادہ بنے
مالکِ کُل، ہستیٔ مطلق کا دلدادہ بنے

ہے طریقِ دیدِ حق ہی جس کا مذہب نام ہے
باعثِ برکات جس میں حرکتِ ہرگام ہے

............OO............

فقیروں کی صحبت

بہرِ سالک بہتریں طرزِ عمل ست سنگ ہے
جس سے بہرہ ورنہ ہونا باعثِ صد ننگ ہے

مدعا 'ست' سے ہے زندہ 'سنگ' سے ہے اختلاط
یعنی ذاتِ عارفِ کامل سے خوئے ارتباط

صحبتِ کامل یہی ہے، مسلکِ احسن یہی
اصطلاحِ اہلِ دل میں بہتریں کندن یہی

قُربتِ آتش میں ہے موجود گرمی کا اثر
ہم نشینی آب کی رکھتی ہے سردی کا اثر

بخشتا ہے روشنی کا فائدہ قربِ چراغ
صحبتِ گل سے معطر کیا نہیں ہوتا دماغ ؟

یوں ہی ماحولِ فقیری سے ہے سالک فیضیاب
حاملِ آثار بنتا ہے ، حقیقت انتساب

صحبتِ بد میں بدی کا ہے اثر پنہاں ضرور
صحبتِ نیکاں میں ہے موجود نیکی کا سرور
اچھی صحبت کے اثر پر اتنا ہے دارو مدار
کرتے ہیں حیوان بھی انساں کی خوبو اختیار
مادّی چیزوں میں بھی انسان کی صحبت کا اثر
سو طرح سے ہے جہان رنگ و بو میں جلوہ گر
چاہیئے سالک کو صحبت سُنت کی حاصل کرے
تا کہ ہم آہنگیٔ جذبات کا وہ دم بھرے

نور جہاں

اے بہارِ گُلشنِ ہندوستاں آب ورنگِ محفلِ کون و مکاں
تیرے دم سے ملک تھا رشکِ جناں جانِ عالم تھی تو اے نور جہاں
آسمانِ ہند کا تارا تھی تو
ماہِ عالم تاب کا پارا تھی تو

تو ہر اک انداز میں ممتاز تھی تیری صورت جلوہ گاہِ ناز تھی
اہلِ ہمت تھی ، بڑی جانباز تھی رحم اور انصاف کی دمساز تھی
تھے بہادر تیری جرأت پر نثار
کھیلتی تھی کوہ وصحرا میں شکار

پیکرِ شرم وحیا، عصمت کی جاں بذلہ گو ، رنگیں ادا ، معجز بیاں
سروِ رعنا ، قمریٔ شیریں زباں اور حُسن وعشق کی روحِ رواں
فخر تھی تومہ جمالوں کے لئے
نازنین، نازک خیالوں کے لئے

حُسنِ عالمگیر تیرا لاجواب تجھ سے شرمندہ تھے ماہ وآفتاب
دیکھ کر چہرے کی تیرے آب وتاب زہرہ تھا شیر افگنوں کا آب آب

صاف اک آئینہ تھا تیرا ضمیر
لوگ تھے دل سے ترے فرماں پذیر

نور کی پتلی تھی تو اے مہ جبیں کیوں نہ ہوتا تجھ پہ شیدا نوردیں
دل رُبا تیری ادائے دل نشیں ایسی عورت آج تک دیکھی نہیں

رنگ وحُسن ونور سے معمور تھی
بھیس میں عورت کے تواک حور تھی

ہند کا وہ شہریارِ کامگار ہوگیا تیری بدولت نامدار
جلوہ گر ہوتی تھی جب تو گل عذار زندگی میں اس کی آتی تھی بہار

محفلِ عیش و طرب آباد تھی
تجھ سے سب تیری رعیت شاد تھی

دل فریبی تھی تری دنیا میں عام آسماں بھی جھک کے کرتا تھا سلام
اے جہانِ نور کی ماہِ تمام کیا ہوا وہ تیرا دورِ احتشام

موت نے پامال تجھ کو کردیا
کتنا خستہ حال تجھ کو کردیا

..........OO..........

مرثیۂ فرزند

چاہتا ہوں کہ نمایاں غمِ پنہاں ہوجائے
ترجمانِ غمِ دل خاطرِ سوزاں ہوجائے
لذّتِ شورش وحشت نمک افشاں ہوجائے
ٹکڑے دامن کے اُڑیں، چاک گریباں ہوجائے
اک کشش کھینچے ہوئے مجھ کو لئے جاتی ہے
کان میں کھوئی ہوئی کوئی صدا آتی ہے

روح فرسا ہے شبِ غم ، ہے بلا کا اندھیر
نہ رہا گھر کا اُجالا ،یہ ہوا کیا اندھیر
مری آنکھوں میں سراسر ہے یہ دنیا اندھیر
منہ چھپا کر ترا اے چاند ہے جانا اندھیر
قابلِ ذکر نہیں آہ و بُکا تیرے بعد
کیا کہوں دل کا جو کچھ حال ہوا تیرے بعد

یاد رہ رہ کے تیری ہائے ستاتی ہے مجھے
بات ایک ایک تری خون رلاتی ہے مجھے
تپِ غم خاک میں افسوس ملاتی ہے مجھے
آتشِ فرقتِ بے وقت جلاتی ہے مجھے
آگ پانی میں لگادوں تھی یہ میں نے ٹھانی
اُف رے گرمیٔ محبت کہ ہوں پانی پانی

کھا گئی کس کی نظر تجھ کو مری جاں ہے ہے!
ہو گیا تو نگہِ شوق سے پنہاں ہے ہے!
کیا سیہ روز ہوں میں کشتۂ حرماں ہے ہے!
دل کے دل ہی میں رہے سب مرے ارماں ہے ہے!

رقت انگیز نہ کیوں کر ہو کہانی تیری
حیف صد حیف کہ دیکھی نہ جوانی تیری

لعل و گوہر سے بھی تو بڑھ کے تھا پیارے موتی
لختِ دل ، لختِ جگر آنکھ کے تارے موتی
لذّتِ روح و رواں ، دل کے سہارے "موتی"
ہائے ماں نزع میں رو رو کے پکارے "موتی"

اور تو مائلِ گفتار نہ ہو کیا معنی؟
شورِ ماتم سے بھی ہشیار نہ ہو کیا معنی؟

صبر کے ساتھ تو دُکھ درد سہا کرتا تھا
جو دوا دیتے تھے چپ چاپ پیا کرتا تھا
یوں تسلی ہمیں اُلٹی تو دیا کرتا تھا
"اچھا ہو جاؤں گا" اکثر یہ کہا کرتا تھا

کیوں نہ دل خوں ہو نہ کیوں منہ کو کلیجہ آئے
زیست کا ہو جو سہارا وہی جب اُٹھ جائے

حیف صد حیف کہ جینے کا سہارا نہ رہا
زیست جس سے مجھے پیاری تھی وہ پیارا نہ رہا
چین دل کا وہ مری آنکھ کا تارا نہ رہا
نہ رہا ہائے مجھے صبر کا یارا نہ رہا

دیکھ کر کس کو جیوں نورِ نظر گھر میں نہیں
کیوں کلیجہ نہ پھٹے لختِ جگر گھر میں نہیں

زخم دل کے لئے بیٹھا ہوں دکھاؤں کس کو؟
تپشِ شوق بجھانے کو بلاؤں کس کو؟
اب وہ قصے ، وہ کہانی میں سناؤں کس کو؟
بھولتا ہی نہیں تو ، ہائے بھلاؤں کس کو؟

کچھ بن آتی نہیں، میں دل کو سنبھالوں کیوں کر؟
ہائے موتی تجھے سینے سے لگالوں کیوں کر؟

کس کی باتیں مجھے گرمائیں گی اب اے معصوم؟
کون بہلائے مجھے گا کے کلامِ منظوم؟
کس سے اب شرحِ عمل پائے وفا کا مفہوم؟
ہاتھ لرزش میں ہے لکھتے ہوئے تجھ کو مرحوم

آہ! جس وقت تصوّر میں تو آجاتا ہے
آنکھ سے نور، سکوں دل سے چلا جاتا ہے

طالعِ بد نے مجھے رنگ دکھائے کیا کیا
ملک الموت کے بھی ناز اُٹھائے کیا کیا
نقش دل سے تری خاطر نہ مٹائے کیا کیا
اب فسانے دلِ بیتاب سنائے کیا کیا

سچ تو یہ ہے تو ابھی خلد کا حق دار نہ تھا
زینتِ دوش ابھی رشتۂ زنّار نہ تھا

کس قدر پائی تھی دِلدار طبیعت تو نے
شوخیوں کو بھی دیا رنگِ سعادت تو نے
زندگی بھر کیا اظہارِ مروّت تو نے
پھیرلی کیوں نگہِ چشمِ محبت تو نے

تری احساس نوازی سے یہ اُمید نہ تھی
اک یہی تیری ادا قابلِ تائید نہ تھی

کیا قیامت ہے یہ اے گردشِ چرخِ دوّار
دل میں ہو جس کے لئے حسرتِ آغوش و کنار
کر دے مجھ کو وہی یوں موت سے اپنی بیمار
لوٹ آ، اے مرے گلزارِ مسرت کی بہار

کاش پھر زیست سے بدلے یہ قضا آئی ہوئی
کاش پُر نور ہوں آنکھیں مری پتھرائی ہوئی

کس قدر تیرگی ہونے لگی محسوس ، افسوس!
شمعِ اخلاص ہے اور پردۂ فانوس ، افسوس !
کر دیا شومئ تقدیر نے مایوس ، افسوس !
مل گیا خاک میں، دل جس سے تھا مانوس، افسوس!

یہ دعائے دلِ مغموم اجابت پا جائے
رحم اللہ کا اس پر ، ہو ہمیں صبر آ جائے

...........OO...........

✍......نندلال کول طالبؔ کاشمیری

مرزا غالبؔ

(تضمین بر اشعارِ ارشد)

وجہ حیرت کس کے خوابِ مرگ کی تعبیر ہے؟
رشکِ صد الہام کس کی شوخیِ تحریر ہے؟
مدتوں کے بعد کس کی یاد دامن گیر ہے؟
سامنے آنکھوں کے کس کا پیکرِ تصویر ہے؟
جس کی خاموشی میں بھی اک لذّتِ تقریر ہے

بے بدل انشا نویس وشاعرِ فخرِ زماں
بذلہ گو، جادو سخن ، رنگین نوا، شیریں بیاں
نکتہ رس ، جدت پسند، اہلِ قلم ، اہلِ زباں
آہ ! یہ ہے غالبؔ جنت نشیں ، خلد آشیاں
باعثِ اعزازِ دلی ، نازشِ ہندوستاں

روح کی بالیدگی ملتی ہے جس کو یاد میں
تر زباں ہیں خوش بیاں جس کے سخن کی داد میں
جس کا نغمہ وجد زا ہے خاطرِ ناشاد میں
جو نظیر اپنی تھا خود اس عالمِ ایجاد میں

اور اب خوابیدہ ہے خاکِ جہاں آباد میں

دل میں اُس کے درد تھا اور سر میں سودائے سخن
دیدنی ہے چشمِ باطن سے سراپائے سخن
ہونے میں یکتائے فن اُس کے نہیں جائے سخن
زندگی بھر جو رہا سرمستِ صہبائے سخن

مرتے مرتے بھی نہ چھوڑا جام و مینائے سخن

..........○○..........

کھــ......توصیف تابشؔ

فلک رنگ غزلیات

○

تمھیں یہ کس نے کہا ہم سدھرنے والے ہیں
تمہارے بعد نیا عشق کرنے والے ہیں
جو کہہ رہے تھے کہ سرحد پہ جان دینی ہے
وہ لوگ تیرے محلے میں مرنے والے ہیں
نہیں ہے مجھ سا کوئی اور بدنصیب درخت
کہ جس کے حق سے پرندے مکرنے والے ہیں
مجھے یہ کوئی بتائے کہ کیا حقیقت ہے
سنا ہے لوگ خدا سے بھی ڈرنے والے ہیں
میں سوچتا ہوں نئی چوٹ کھا کے آجاؤں
پرانے زخم تو کچھ دن میں بھرنے والے ہیں

○○

○

پہلے دریا کا اہتمام کِیا
بعد میں پیاس سے کلام کِیا
اپنی آنکھیں جھکا کے باتیں کی
اس کی آنکھوں کا احترام کیا
میں کسی سے کبھی ملا ہی نہیں
عمر بھر خود میں ہی قیام کیا
دم کیا اس پہ اپنی غزلوں کا
اور اس شخص کو غلام کیا
آخری سانس لے کے جنگل نے
سب پرندوں کو میرے نام کیا
ہجر کی رات کاٹ دی تابشؔ
تم نے تو بے مثال کام کیا

○○

○

جب سنا اس نے کہ پیاسا مر گیا
شرم سے بستی کا چشمہ مر گیا

تیرے آتے جی اٹھا تھا ایک شخص
تیرے جاتے ہی دوبارہ مر گیا

اس طرح روکے ہوئے تھا سانس میں
دیکھنے والوں نے سمجھا مر گیا

دوست جس کو ڈھونڈتے پھرتے ہیں اب
میرے اندر کا وہ لڑکا مر گیا

اِس لیے پہچانتا کوئی نہیں
کم جیا ہوں اور زیادہ مر گیا

جس کی خوشبو تھی ہمارے شہر میں
گاؤں کا وہ پھول والا مر گیا

تیرے حصّے کا ابھی زندہ ہوں میں
اپنے حصّے کا تو پورا مر گیا

وقت ہے اک ریل گاڑی کی طرح
جس نے روکا اس کا رستہ، مر گیا

○○

○

میں تیری آنکھ میں یہ کیا تلاش کرتا ہوں
بھنور کے بیچ کنارہ تلاش کرتا ہوں

میں اک سکون کا لمحہ تلاش کرتا ہوں
اداسیوں میں بھی رستہ تلاش کرتا ہوں

جو میری آنکھ سے اوجھل کبھی نہیں ہوتا
اسے میں سب سے زیادہ تلاش کرتا ہوں

اسی لیے تو کبھی ڈھونڈ ہی نہیں پایا
ہر ایک شخص میں خود سا تلاش کرتا ہوں

جو میرے ہاتھ سے بچپن میں کھو گیا تھا میاں
میں آج بھی وہی بستہ تلاش کرتا ہوں

بچھڑنے لگتا ہے کوئی ذرا ذرا کر کے
پھر اس کو سارے کا سارا تلاش کرتا ہوں

تلاش کرتے ہوئے بھول جاتا ہوں خود کو
کبھی کبھی تجھے اتنا تلاش کرتا ہوں

یہیں کہیں کبھی بیٹھا ہوا تھا میں تابشؔ
سو طے کیا کہ دوبارہ تلاش کرتا ہوں

○○

○

کچھ نے آنکھیں، کچھ نے چہرہ دیکھا ہے
سب نے تجھ کو تھوڑا تھورا دیکھا ہے

تم پر پیاس کے معنی کھلنے والے نہیں
تم نے پانی پی کر دریا دیکھا ہے

جن ہاتھوں کو چومنے آجاتے تھے لوگ
آج انہیں ہاتھوں میں کاسہ دیکھا ہے

روتی آنکھیں یہ سن کر خاموش ہوئیں
ملبے میں اک شخص کو زندہ دیکھا ہے

بابا بولا میری قسمت اچھی ہے
اس نے شاید ہاتھ تمہارا دیکھا ہے

لگتا ہے میں پیاس سے مرنے والا ہوں
میں نے کل شب خواب میں صحرا دیکھا ہے

اندھی دنیا کو میں کیسے سمجھاؤں
ان آنکھوں سے میں نے کیا کیا دیکھا ہے

قیدی رات کو بھاگنے والا ہے تابشؔ
اس نے خواب میں خفیہ رستہ دیکھا ہے

○○

○

میں ترے دھیان کے گاؤں میں نکل آیا ہوں
دھوپ کو چھوڑ کے چھاؤں میں نکل آیا ہوں

اس نے ہونٹوں کے لئے تِل کی دعا مانگی تھی
اس کی قسمت کہ میں پاؤں میں نکل آیا ہوں

خاک پر بوجھ سمجھتے تھے زمیں والے مجھے
خود کو میں لے کے خلاؤں میں نکل آیا ہوں

اب کے برسات بھی ہوگی تو الگ سی ہوگی
چشمِ تر لے کے گھٹاؤں میں نکل آیا ہوں

بجھ بھی جاؤں تو کوئی بات نہیں ہے تابشؔ
اتنا کافی ہے ہواؤں میں نکل آیا ہوں

○○

○

وہ پری زاد ہے، یہ سب کو دِکھانا تھا مجھے
صرف اک بار اسے ہاتھ لگانا تھا مجھے

یہ تو میرا ہی ہنر تھا جسے اظہار ملا
ورنہ مرشد نے کہاں اسم سکھانا تھا مجھے

اسلئے بھی میں بہت دیر سے پہنچا تجھ تک
اپنے قدموں کا ہر اک نقش مٹانا تھا مجھے

اپنی تیراکی بھی کرنی تھی سبھی پر ثابت
اور پھر خود کو بھی لہروں سے بچانا تھا مجھے

میں کہانی کو سناتے ہوئے خود ہی رویا
جب کہ قصّے کے مخاطب کو رلانا تھا مجھے

ایک ہی اشک بچا رکھا تھا میں نے آخر
اور اسی اشک کو دن رات بہانا تھا مجھے

میری شہرت کے تقاضے ہی الگ تھے تابشؔ
گم شدہ رہتے ہوئے نام کمانا تھا مجھے

○○

○

اِس لئے کم کسی سے ملتا ہے
خود سے مل کر مجھ ہی سے ملتا ہے

جس کو دیکھا نہیں کبھی میں نے
تیرا چہرہ اسی سے ملتا ہے

میں نے دیکھا تھا خواب میں اس کو
وہ مری شاعری سے ملتا ہے

آئینہ دیکھ کر خیال آیا
میرا چہرہ کسی سے ملتا ہے

کچھ تو خوبی ہے آپ میں ایسی
ہر کوئی آپ ہی سے ملتا ہے

خود سے ملتا نہیں کبھی تابشؔ
شہر میں ہر کسی سے ملتا ہے

○○

○

آئینے کے روبرو اک آئینہ رکھتا ہوں میں
رات دن حیرت میں خود کو مبتلا رکھتا ہوں میں
دوستوں والی بھی اک خوبی ہے ان میں اس لئے
دشمنوں سے بھی مسلسل رابطہ رکھتا ہوں میں
روز و شب میں گھومتا ہوں وقت کی پرکار پر
اپنے چاروں سمت کوئی دائرہ رکھتا ہوں میں
کھٹکھٹانے کی بھی زحمت کوئی آخر کیوں کرے
اس لئے بھی گھر کا دروازہ کھلا رکھتا ہوں میں
آج کل خود سے بھی ہے رنجش کا کوئی سلسلہ
آج کل خود سے بھی تھوڑا فاصلہ رکھتا ہوں میں
چند یادیں، ایک چہرہ، ایک خواہش، ایک خواب
اپنے دل میں اور کیا ان کے سوا رکھتا ہوں میں
چند تصویریں، کتابیں، خوشبوئیں اور ایک پھول
اپنی الماری میں تابشؔ اور کیا رکھتا ہوں میں

○○

○

بے قراری سی بے قراری ہے
اب یہی زندگی ہماری ہے
میں نے اس کو پچھاڑنا ہے میاں
میری سائے سے جنگ جاری ہے
عشق کرنا بھی لازمی ہے مگر
مجھ پہ گھر کی بھی ذمہ داری ہے
پیار ہے مجھ کو زندگی سے بہت
اور تو زندگی سے پیاری ہے
میں کبھی خود کو چھوڑتا ہی نہیں
میری خود سے الگ سی یاری ہے
شہر کا شہر سو گیا تابشؔ
اب مرے جاگنے کی باری ہے

○○

......بلراج بخشی

تخلیقی اظہار میری مجبوری ہے!!

جب میں نے یہ سطور لکھنا شروع کیں تو معلوم ہوا کہ میرے تخلیقی سفر کا آغاز دوسروں کے تخلیقی سفر کے ابتدائی حالات وواقعات سے بے شک جداگانہ رہا ہوگا، مگراس کا محرک وہی تھا، یعنی اظہارِ ذات۔

ہم جانوروں یا پرندوں کی زبان تونہیں جانتے لیکن کئی جانوروں اور پرندوں کومختلف قسم کی آوازیں نکالتے ہوئے سنا جاسکتا ہے۔کئی پرندے اپنی ماداؤں کومتوجہ کرنے کے لئے رقص کے ذریعے اپنے جذبے کا اظہار کرتے دیکھے گئے ہیں، اس سلسلے میں مور کی مثال واضح ہے۔ ازمنۂ قدیم میں غاروں میں رہنے والا انسان غاروں کی دیواروں پر شکار کے مناظر کی تصاویر بنا کر اظہار کی جبلت کا اظہار کرتا تھا۔ کہا جاسکتا ہے کہ ان ہی جذبات کا اظہار فنون لطیفہ کی شکل میں سامنے آیا۔

اصل میں کئی جبلتوں کے ساتھ اظہار بھی انسان کی بنیادی جبلتوں میں سے ایک ہے جو کہ ہرانسان میں کسی نہ کسی حد تک ودیعت ہے اور جس کا اظہار ہرانسان ہنس کر، گا کر، رو کر کسی نہ کسی صورت میں کر ہی دیتا ہے۔ میرے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔

میرے والدین پاکستان کے زیرانتظام علاقہ پونچھ سے تعلق رکھتے تھے۔ 1947ء

میں پاکستانی فوج کے پونچھ کے محاصرے کے دوران میرے والدین کو بذریعہ طیارہ پونچھ سے انخلا کروا کر، مظفر آباد اور میر پور سے بچے کھچے ڈیڑھ دو لاکھ پناہ گزینوں کے ساتھ جموں میں اور ہماچل پردیش میں یہاں وہاں پھینک دیا گیا تھا۔

بعد میں مجھے بتایا گیا کہ جموں کے مضافات میں نگروٹہ کے مقام پر اسی قسم کے ایک خیمے میں 10 / دسمبر (سرکاری ریکارڈ میں 7 / دسمبر) 1949ء کو میری پیدائش کا حادثہ ہوا تھا۔ لیکن میرے شعور میں یاداشتوں کا اولین ترین سلسلہ ادھم پور سے شروع ہوتا ہے جہاں پر ادھم پور کے پٹھار کی شمالی ڈھلان کے سرے پر سرائے کے پاس دیوک ندی کو جانے والی ڈھکّی (پتھروں کو جوڑ کر بنایا گیا پہاڑی راستہ) کے آغاز میں پانچ چھ کمروں کے درمیان ایک صحن کے درمیان میں نے اپنے آپ کو پایا۔ میں نے دیکھا کہ اس چھوٹی سی دنیا میں میرے والدین، میرے ماموں اپنے اہل خانہ سمیت اور میری دونوں خالائیں رہتی ہیں۔ میرے نانا نانی بھی یہیں ہیں۔ سب کے رسوئی گھر اپنے اپنے ہیں۔ سب لوگ ہنستے کھیلتے، لڑتے جھگڑتے، روٹھتے مناتے وہاں رہ رہے ہیں۔

اندھیرے اندھیرے سے بلا کھڑکیوں کے کمرے تھے جہاں سورج کی روشنی کا بلاواسطہ آنا ممنوع تھا بس یہاں وہاں سے بھٹکتی ہوئی کچھ شعائیں در آتی تھیں۔ ایک بڑا سا کمرہ بھی تھا جہاں دوپہر کو کم اور رات کو لالٹین کی روشنی میں زیادہ نظر آتا تھا۔ ٹین کا چھوٹا سا مخروطی شکل کا مٹی کے تیل کا دیا ہوتا تھا جس کی بتی سے کئی برسوں سے مسلسل اٹھنے والا دھواں کمرے کی چھت کے برگوں اور دیواروں پر جم کر کِلوں (جما ہوا دھواں) بن چکا تھا۔ ایک جانب لکڑی کے دو ستونوں کے بیچ باندھی گئی رسی کی ٔبلگنی پر لحاف اور کمبل تہہ کر کے لٹکائے گئے ہوتے جنھیں استعمال کے لئے سردیوں میں اتارا جاتا۔ کمرے میں کچھ جگھوں پر ٹند واریں بھی لگی ہوئی تھیں۔ بارش میں مٹی کی چھت جگہ جگہ سے ٹپکتی رہتی۔ بھتاروں (مٹی سے بنی ہوئی دیواریں) پر جگہ جگہ لگائی گئی ٹانڈوں پر گھر کا سامان رکھا رہتا تھا۔ برسات کے موسم میں چھت

پر چھوٹے چھوٹے گول پتوں والا گلفا ساگ اُگ آتا تھا جسے توڑ کر ہم پکاتے تھے۔

میرے نانا پونچھ میں چھاترا علاقے کے سینکڑوں کنال کھیتوں کھلیانوں کے مالک ایسے متمول زمیندار اور با شعور ذیلدار تھے کہ انھوں نے میری ماں کو اس زمانے میں آٹھویں تک پڑھایا تھا اور آج میں دیکھ رہا تھا کہ میری نانی جو مسلسل دھوئیں میں دمے کی مریضہ ہو چکی تھیں، اس مکان کے برانڈے میں کھاٹ کو دیوار کے ساتھ لگا کر اودائن میں بانس کی پتلی پتلی تیلیاں پھنسا کر پھُندنے والے ریشمی ازار بند بن رہی ہیں، جنہیں بازار میں بیچا جاتا تھا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ میر پور کے ریفیو جی بھی یہی کچھ کرتے تھے۔ وہ آٹے کی بوری لے آتے اور بازار سے بھی کم بھاؤ پر شام تک بوری کا آٹا فروخت کر دیتے اور شام کو خالی بوری کو منافع سمجھ کر گھر لے جاتے تھے۔

1957ء میں جب میں آٹھ سال کا تھا تو میرے والد بخشی کرپا رام کا انتقال ہو گیا۔ ان کے انتقال کے چار دنوں کے بعد، پھر ایک مہینے کے بعد، پھر چھ مہینے کے بعد، پھر ایک سال کے بعد، پھر چار سال کے بعد موت سے جڑی ہوئی رسمیں نبھائی جاتی رہیں۔ یہ رسوم قریب ہی مقدس دیوک ندی کے کنارے پر ادا کی جاتی تھیں۔ پھر میرے نانا کا انتقال ہو گیا، پھر نانی کا اور اس طرح اسی صحن میں موت سے جڑی رسموں کا ایک سلسلہ چلتا ہی رہا جن میں کئی کئی دنوں تک اور کئی کئی مخصوص دنوں پر بلا لہسن، پیاز کی دال سبزی، پوڑی اور کھیر کا پروسا جانا مجھے یاد ہے۔ (بلا لہسن پیاز کی دال سبزی اور پوڑی، کھیر سے مجھے آج بھی وحشت ہوتی ہے)۔

ہم گھر میں پہاڑی (پوٹھو ہاری کی ایک بولی) میں بات کرتے تھے۔ گھر کی اس محفوظ دنیا سے باہر نکلنے کا واحد راستہ گھر کی ڈیوڑھی تھا۔ ڈیوڑھی سے باہر نکل کر جب میں اسکول جانے لگا تو وہاں اس خطے کی زبان ڈوگری کو سنا۔ لیکن اسکول میں ہندی اور اردو دونوں رائج تھیں، دونوں پڑھائی جاتی تھیں۔ میری والدہ رام پیاری شرما نے مجھے اردو پڑھانے کا فیصلہ کیا اور اس طرح میری تعلیمی تربیت کا آغاز ہوا۔

میری والدہ جواں عمر میں بیوہ ہوگئی تھیں۔ وہ ہر وقت اس غم میں آزردہ رہتی تھیں۔ میرا بھائی اشوک مجھ سے دو سال چھوٹا تھا۔ والدہ اکثر ہمیں اپنی گود میں لے کر میرے والد کو یاد کرتیں اور روتی رہتی تھیں۔ محاصرہ پونچھ سے بذریعہ طیارہ انخلا کے وقت میرے والد پونچھ میں پولیس سب انسپکٹر کے طور پر تعینات تھے۔ والدہ میرے والد کی پولیس یونیفارم، گھوڑ سواری کی برجیس، ان کے رینک کے ستارے، شانہ رسن، بیلٹ، کراس بیلٹ، پولیس کیپ اور اس قسم کے دوسرے memorablia ہم دونوں بھائیوں کو دکھاتی اور روتی رہتیں۔ یہ ایک بہت دلدوز منظر ہوتا تھا جسے دیکھ کر میں بھی رونے لگتا تھا اور میرا بھائی بھی۔ انھیں چیزوں میں میرے والد صاحب کی ایک ڈائری بھی تھی۔

جب میری عمر چالیس سے بھی تجاوز کر گئی تو مجھے معلوم ہوا کہ سرزمین پونچھ کا یہ خاصہ ہے کہ وہاں کا ہر تیسرا شخص شاعر ہو یا نہ ہو، تخلص ضرور رکھتا ہے۔ چنانچہ آپ کو وہاں (کم سے کم اس دور میں) کئی اس قسم کے لوگ مل جائیں گے جن کے نام موہن لال زخمی یا سریندر سنگھ باغی یا کچھ بھی ہو اور اس کے ساتھ تخلص کا لاحقہ ضرور ہوتا ہے۔ اگر آپ پوچھیں کہ بھائی آپ نے زخمی تخلص کیا ہے تو کیا آپ شاعر ہیں؟ تو جواب ملے گا کہ لو جی، شاعری اپنی جگہ ہے تخلص اپنی جگہ۔ شاعری کا تخلص سے کیا تعلق؟ (ایسا مجھے بتایا گیا ہے)۔ بہر حال اس سارے خطہ پیر پنچال کا یہ وصف ہے کہ یہاں کی دو بڑی ادبی شخصیتوں، کرشن چندر اور چراغ حسن حسرت کی وجہ سے یہاں کے عوام و خواص کا مزاج اور ذوق آج بھی واضح طور پر ادبی ہو گیا ہے۔

میرے والد شاعر تو نہیں تھے لیکن اس ڈائری میں انھوں نے اس زمانے کے مشہور فلمی گانے یا کچھ مشہور اشعار وغیرہ لکھ رکھے تھے جنھیں میری والدہ مجھے اکثر سنایا کرتی تھیں۔ کچھ طبیعت میں بھی موزونیت رہی ہوگی کہ اس طرف میری دلچسپی بڑھتی گئی۔ 1947ء کے پناہ گزینوں کو حکومت نے کبھی کچھ نہیں دیا۔ والد کی وفات کے بعد سارا خاندان ہی بے سہارا ہو گیا۔ نہ کوئی زمین، نہ نقدی نہ کچھ۔ شکر تو یہ ہے کہ اس دور میں میری والدہ آٹھویں پاس تھیں

اور اردو، ہندی، گورمکھی کو بخوبی پڑھ لکھ سکتی تھیں۔ ان کی اس اہلیت پر انھیں یہاں کے گوردوارے میں استانی کا کام ملا اور روکھا سوکھا گزارہ ہونے لگا۔ پھر کئی سال بعد انھیں ٹیچر کی سرکاری نوکری مل گئی۔

ساتویں آٹھویں جماعت میں اسکول کی لائبریری میں ناول دیکھے تو ماں سے پوچھا کہ آپ کے اسکول میں بھی تو ناول ہوں گے، لا دیجیے۔ چنانچہ ماں اسکول سے پریم چند کے ناول لانے لگیں۔ گودان، میدانِ عمل، چوگانِ ہستی، بازارِ حسن، کرشن چندر، منٹو، عادل رشید اور جانے کیا کیا اسی عمر میں پڑھ لیے۔ ستم ظریفی دیکھیے کہ گھر کے اندر ایک بالکل الگ لسانی ماحول تھا، گھر کے باہر ایک یکسر الگ لسانی فضا اور ان دونوں میں کوئی مماثلت یا ہم آہنگی نہیں تھی۔ دونوں کا لہجہ الگ، لفظیات الگ۔ میں بہ یک وقت دونوں لسانی منطقوں میں جی رہا تھا۔ پھر اردو کتابوں کا ایسا ماحول ملا کہ چھٹی جماعت تک پہنچتے پہنچتے میں اردو میں تک بندی کرنے لگا اور لاشعوری طور پر اردو میرے اظہار کی اختیاری زبان بنتی گئی۔

ماں نے دیکھا کہ بیٹا تو ہر وقت ناولوں میں ڈوبا رہتا ہے تو انھوں نے اسکول سے کتابیں لانا بند کر دیں۔ ان دنوں یہاں ادھم پور کے بازار میں کئی دوکانوں پر چھوٹے بورڈ لگے تھے کہ 'یہاں پر ناول کرائے پر ملتے ہیں'۔ دو روپے کی سکیورٹی تھی اور ایک آنہ کرایہ۔ ان دکانوں پر ابن صفی کی جاسوسی دنیا سے متعارف ہوا۔ منشی تیرتھ رام فیروز پوری کے بڑی ادبی ترجموں کے بعد آج تک ابن صفی کے سحر میں گرفتار ہوں۔ ماں نے دیکھا تو انھوں نے ادھم پور کے چھوٹے سے قصبے میں کرائے پر ناول دینے والے تمام دکانداروں کو مجھے ناول دینے سے منع کر دیا۔ میں گھر میں آکر بہت رویا گڑگڑایا مگر ماں ٹس سے مس نہیں ہوئی۔ یہ شاید 65-1964 یا تھوڑا آگے کا زمانہ تھا۔

میں ان دنوں نویں یا دسویں میں بوائز ہائر سیکنڈری اسکول میں پڑھتا تھا۔ ہمارے اسکول میں سائنس بلاک کے ساتھ ڈسٹرکٹ لائبریری تھی۔ میں اس لائبریری میں گیا اور

پوچھا کہ مجھے کتابیں کیسے مل سکتی ہیں۔ لائبریرین تھوڑو رام نے بتایا کہ اس کے لئے مجھے بیس روپے کی سیکیورٹی جمع کروانی پڑے گی۔ میرے بیک گراؤنڈ والے کسی طالب علم کے لئے 1964-65 میں بیس روپئے بہت بڑی رقم تھی۔ بہرحال میں نے جیب خرچ میں سے بچا بچا کر خفیہ طور پر چھ سات مہینوں میں بیس روپے جمع کر لئے اور لائبریرین تھوڑو رام کو لائبریری کی سکیورٹی دے کر ممبر بن گیا۔ میں آج تک اس لائبریری کا ممبر ہوں۔

ماں بگڑتی رہتی تھیں اور میں اسکول کی کتابوں میں چھپا کر ناول پڑھتا رہتا تھا۔ نتیجہ ظاہر ہے۔ میں گیارہویں میں فیل ہوگیا۔ اگلے سال پاس ہوکر 1967ء میں ادھم پور ڈگری کالج میں داخلہ لیا۔ وہاں اچانک ہم تین چار لوگوں نے ایک دوسرے کو دریافت کرلیا۔ یہ تھے کلدیپ گپتا صابر، سریندر ساجد، آنند سروپ انجم اور میں۔ کلدیپ صابر اچھے افسانے لکھتے تھے اور ان کے افسانوں پر پریم چند کی چھاپ ہوتی تھی۔ سریندر ساجد فیض کے رنگ میں شاعری کرتے تھے۔ صابر اور ساجد اب حیات نہیں ہیں۔ آنند سروپ انجم تین مجموعہ ہائے کلام شائع کر چکے ہیں اور اب خواہی نخواہی ایک آدھ شعر کہہ لیتے ہیں۔ کالج کے ایام کے دوران ہی جموں کے ادبی لوگوں سے نہ جانے کیسے رابطہ ہوگیا۔ ایک دن جموں سے میکش کاشمیری، منظر اعظمی، عابد مناوری، نورالزماں صدیقی نور، او پی شرما سارتھی، مدن موہن، غافل سنگشہری نے یہاں وارد ہوکر انجمن ادب کی تشکیل کی۔ مجھے صدر بنایا اور آنند سروپ انجم کو سیکریٹری۔

جموں کی انجمن ادب والوں نے میرا اولین افسانہ 'مشین کا پرزہ' جموں کی کسی مقامی اخبار میں شائع کروا دیا تھا۔ پھر 1969ء میں میرا افسانہ 'چاندنی کا دھواں' شاعر ممبئی میں شائع ہوا۔ ان دنوں اعجاز حسین صدیقی مرحوم اس کے مدیر تھے۔ شاعر ممبئی میں میرے کئی افسانے شائع ہوئے جیسے: ہم سفر، سورج کا اغوا اور کئی دوسرے۔

ظاہر ہے 1969ء میں بی ایس سی کے امتحان میں مجھے ناکام ہونا ہی تھا۔ پتہ ہی نہ

چلا کہ اگلے دو برسوں میں کہاں کہاں اور کیسی آوارگی ہوتی رہی۔ 1972ء میں بی ایس سی پاس کر کے جموں یونیورسٹی کے شعبہ قانون میں داخلہ لیا۔ اسی دوران کہیں آنند لہر، فاروق مضطر اور شب خون سے ملاقات ہوگئی۔ شب خون میں خوب اشاعتیں ہوتی رہیں۔ کچھ نامساعد حالات کی وجہ سے دو سال کے بعد قانون کی پڑھائی بھی چھوٹ گئی۔۔ کچھ پتہ ہی نہ چلا کہ جانا کہاں ہے، کرنا کیا ہے۔

1972ء میں بی ایس سی کی ڈگری بہت بڑی بات تھی۔ لیکن ''یہ تو 1947ء کا ریفیو جی ہے'' والے tag کے ساتھ سسٹم میں کہیں کوئی داخلی دروازہ کھلا نہیں ملا۔ اپنی بے بضاعتی، سیاسی، حکومتی اور انتظامیہ کی دانستہ بے حسی سے زبان کا ذائقہ تلخ ہو گیا اور طبیعت پر ایک لازوال افسردگی طاری ہوتی گئی۔ افسردگی کی یہ پرتیں اتنی دبیز ہیں کہ ان میں دفن fossils کی شناخت کر پانا بھی اب مشکل ہے۔

میری شاعری یا میری فکشن نگاری انھیں احساسات کے دبے دبے سے، سہمے سہمے سے اظہار کی معدوم سی کوشش ہے۔ افسانوں کا ایک مجموعہ ''ایک بوند زندگی'' شائع کر چکا ہوں۔ چار مزید کتابیں مکمل ہونے کے باوجود کئی سال سے طباعت کے مختلف مراحل میں ہیں۔

کئی سال قبل انگریزی روزنامہ اسٹیٹ ٹائمز جموں کے نامہ نگار نے ایک انٹرویو لیتے وقت مجھ سے پوچھا تھا:

'شعر و ادب کی کاوشوں کے عوض سوسائٹی نے جو کچھ آپ کو دیا کیا آپ اس سے مطمئن ہیں؟'

اس وقت میں نے جواب دیا تھا کہ '.... سوسائٹی میرے پاس وفد لے کر نہیں آئی تھی کہ بلراج بخشی تم شاعری کرو یا افسانے لکھو۔ اظہار میری مجبوری ہے۔ سوسائٹی پر میرا کوئی احسان نہیں ہے۔ میرا نظریہ آج بھی وہی ہے۔

............OO............

○

ہر چند چراغِ سحری ہے دنیا
گھر شر کا ہے، فتنوں سے بھری ہے دنیا
جو طالبِ دنیا ہیں وہ نابینا ہیں
برسات کے اندھوں کو ہری ہے دنیا

○

کرتا ہوں بسر زیست قلندر کی طرح
ہر خار بھی مجھ کو ہے گلِ تر کی طرح
رضواں سے کہو خلد مبارک ہو اُسے
فردوس بھی کیا ہوگا مرے گھر کی طرح

○○

غلمانِ حسین ، حورِ سمن بر لے کر
فردوسِ بریں چشمۂ کوثر لے کر
وہ کیا کرے جو صرف ترا طالب ہے
یہ مال و زر و دولت و کشور لے کر

○

○

پوشیدہ ہیں پتھر میں نگینے اکثر
رکھتے ہیں خرابات دفینے اکثر
باطن کو ٹٹول، صرف ظاہر پہ نہ جا
اک دھوکا ہیں ظاہری قرینے اکثر

○

احساس کو لفظوں میں پرونے کا فن
قطرے کا دُرِ خوش آب ہونے کا فن
کہتے ہیں رباعی جسے وہ ہے ناوکؔ
کوزے میں سمندر کو سمونے کا فن

○

افسردہ و رنجور رہا کرتا ہوں
ہر عیش سے میں دور رہا کرتا ہوں
اس طرح سمایا ہے تو میرے دل میں
ہر حال میں مسرور رہا کرتا ہوں

○

○

ہر سانس کو زندگی کی دولت جانو
ہر لحظہ کو اللہ کی نعمت جانو
اک آن بھی ضائع نہ کرو بے مصرف
ہر لمحۂ زیست کو غنیمت جانو

○

ارض اور سماوات کا عقدہ کھولو
ما بعد طبیعات کا عقدہ کھولو
ہو جائیں گے اسرار بہت سے روشن
خود اپنی اگر ذات کا عقدہ کھولو

○

حد سے ہے بڑھی تشنہ لبی اے ساقی
ہے حاصلِ زیست مے کشی اے ساقی
ہے عمر دو روزہ جو گیا دنیا سے
وہ لوٹ کے آیا نہ کبھی اے ساقی

○

○

ناموسِ قلم کو اے قلم کار نہ بیچ
تو اپنا ضمیر، اگر ہے خود دار نہ بیچ
باقی کیا رہ گیا جو عزت نہ رہی
سر بیچ دے لیکن کبھی دستار نہ بیچ

○

کیا غم جو نہ حاصل ہوئی دولت ان سے
ہوتی ہے بہت شاد طبیعت ان سے
مجھ کو یہ کتابیں ہیں دل و جاں سے پسند
ملتی ہے مسرت و بصیرت ان سے

○

اعمال کی سوغات سے شرمندہ ہوں
ہر کام سے، ہر بات سے شرمندہ ہوں
آیا ہوں چھپائے ہوئے منہ زیرِ کفن
میں ربِ سماوات سے شرمندہ ہوں

○

لمحہ

لمحے سے آنکھوں کا مضموں
ہاتھوں کی ریکھائیں پڑھ لیں
سارے پکّے وعدے لے لیں

○

لیکن لمحہ خاموشی سے
تنہا تنہا جب آئے گا
جاتے جاتے ہر سچائی
سچے منہ سے جھٹلائے گا

○

لمحہ ، فطرت کا پروانہ
بیٹھے گا در پر اک پل کو
پھر وہ اک ہرجائی بن کر
جھونکا بن کر اڑ جائے گا

○

موسم

کبھی رنگوں، کبھی خوش بو سے مل کر
کبھی برسات، گاہے پت جھڑوں سے
دہکتے گلشنوں کی نوجوانی
فسانہ میں حقیقت ڈھونڈتے ہیں

○

گزرتی ساعتوں سے باخبر ہے
زمانہ میرے آگے کچھ دِگر ہے

○

کسی موہوم آہٹ کی صدا ہے
نہ جانے کیوں مرا دل کہہ رہا ہے
بدل جائیں گے موسم ایک دن سب

○

حسرت

اجالوں میں اندھیروں کی قطاریں
پرو کر دِل میں خوابوں کے اشارے
سمو کر آنکھ میں جذبات سارے
کسی آنسو سے ہر احساس دھو کر
گزر کر وقت کی سرحد کے آگے
نئے انداز سے میرا فسانہ
حقیقت کہہ کے بانہوں میں چھپالے
مرے ہر راز سے پردہ ہٹالے

○

میں دیکھوں اپنی آنکھوں سے وہ رخ بھی
خوشی سے بھول جاؤں اپنی ہستی
فنا کو دوں بقا کا نام ہنس کر
ہنسی میری چُرالے سارے خدشے
مِرا دل خوف سے عاری ہو یک سر

○

میں واپس آؤں پھر فانی حدوں میں
بتاؤں جگ کو جو باقی رہے گا
مری تقدیر کو حسرت یہی ہے

○

خزاں

بجھ چکا دل میں وصل کا تارہ
بجھ چکا آنکھ میں فراق کا رنگ
پھول کھلنے لگے ہیں خوابوں میں
زرد پتے نہیں ہیں شاخوں پر
بے لباسی شجر کی قسمت ہے

○

نیند، خوابوں سے اب نہیں ملتی
رت جگوں میں نہیں رفاقت اب
بے صدا، بے ادا ہوئے لمحے
آس کے دل میں اب نہیں خوش بو

○

دیکھ کر یہ جہاں کی ویرانی
پوچھتی ہے طلب سے بے تابی
کیا خزاں پر بہار آئی ہے

○

○

وہ جذبہ، وہ احساس کہاں سے لاؤں
جو ٹوٹ گئی آس کہاں سے لاؤں
تم ڈھونڈ تو لائے ہو اب امرت لیکن
میں کھوئی ہوئی پیاس کہاں سے لاؤں

○

دنیا کی رسومات میں ڈھلنا سیکھو
سب چلتے ہیں جس راہ پہ چلنا سیکھو
شعلوں کی تمازت سے یہ شکوہ کیسا؟
جب آگ سے رشتہ ہے تو جلنا سیکھو

○

احساس کی سرحد سے گزرنے والے
رہ رہ کے تصور میں اُبھرنے والے
دل کے بھی جزیرے پہ کبھی آکے ٹھہر
اے خواب کے ساحل پہ اُترنے والے

○

موسم گئے، برسات گئی، چھوڑو بھی
وہ میل ملاقات گئی، چھوڑو بھی
کیا رکھا ہے اس یادِ گزشتہ میں نگاؔہ
اب رات گئی بات گئی، چھوڑو بھی

○

سولی پہ ابھی چاند لٹکتا ہوگا
آنکھوں میں کوئی خواب کھٹکتا ہوگا
یادوں کے گھنے بن میں کہیں شہزادہ
ہرنی کے تعاقب میں بھٹکتا ہوگا

○

سینے کا داغ داغ روشن کردے
بھر دے ساقی ایاغ روشن کردے
کوئی ایسا چراغ روشن کردے
جو میرا دل دماغ روشن کردے

○

○

دریاؤں سے دریاؤں کا پانی پوچھے
کشتی سے سفینے کی روانی پوچھے
غم آج بہ اندازِ تمسخر دل سے
اک لفظِ محبت کے معانی پوچھے

○

فریاد کے پر کاٹ کے لے جاؤں گا
آہوں سے اثر کاٹ کے لے جاؤں گا
اُس در کے سوا جھکنے سے پہلے ہی نگاہ
میں اپنا ہی سر کاٹ کے لے جاؤں گا

○

وحشت سی ہر اک سمت برستی دیکھی
جو شہر، جو آبادی، جو بستی دیکھی
ہر دل پہ کسی درد کا سایا دیکھا
ہر آنکھ محبت کو ترستی دیکھی

○

○

پھر خواب نہ دکھلاؤ کہ ڈر جائیں گے
اس مہر و مروت سے بکھر جائیں گے
اک عمر گزاری ہے سہارے غم کے
ٹوٹا یہ سہارا بھی تو مر جائیں گے

○

رہ رہ کے مرے ذہن میں اٹھتا ہے سوال
یہ دورِ ترقی ہے کہ انساں کا زوال
خود کار مشینوں کی یہ چیرہ دستی
بے کار ہیں سب اہلِ ہنر، اہلِ کمال

○

دنیائے ادب میں ہے اگر کچھ پہچان
ہے اہلِ نظر، اہلِ قلم کا احسان
اس بات کا اے دوست مگر رکھنا دھیان
ہم نے ہی رباعی میں نئی پھونکی جان

○

نظمیں

○

گھر جل رہا ہے
گھر کا مالک کاہے کو بھاگے
واں تو ہزاروں اشیا
جن میں کچھ تو جان سے پیاری
جلنا اُن کا دیکھا نہ گیا
عشق کو آگ میں کودنا پڑا
بھیانک شعلوں نے گھیر لیا وہ
گوشت کا لوتھڑا جل گیا وہ
جتنی دیر آنکھوں میں دم ہے
وہ ٹکٹکی باندھی رہیں
گھر جل گیا
وہ جل گیا
''آنکھوں میں دم تو ہے''

○○

○

راہ کے نکڑ پر
روز ایک سانحہ ہوتا تھا
ٹھوکر سے گرڈھوں کے ڈھکن اُٹھ جاتے تھے
ان میں کالا دھواں اور بھیانک شعلے
باہر لپک کر
مجھ سے
بے بسی کے عالم میں
لپٹ جاتے تھے
روز کے اس جھنجھٹ سے بچنے کے لئے
میں نے دوسری راہ اختیار کی
جہاں کالا دھواں ہے نہ بھیانک شعلے
بالم کی تصویر ہے نہ سوکن کا جلاپا
پس اک مشین ہی مشین ہے

○○

✍......عائشہ مستور

نظم

باغ میں بلبل کا اک بچہ دیکھا ہے
اس کو نازوں سے پالا ہے
دانے دانے سے نوازا ہے
خُم پہ خُم لُنڈھائے ہیں
عشق سے بھرپور دل نچھاور کر دیا ہے
عشق اللہ ہے
عشق حقیقت ہے
جس دل میں عشق نہ ہو، وہ دل بیمانہ ہے
عشق کی چنگاری دل کے تہہ خانوں میں
بھڑک کر جسم کو بھسم کر دیتی ہے
کتنے صورت گر پیدا ہوتے ہیں
کتنے قلم کار ظاہر ہوتے ہیں
نقشِ دلبر سنگ پر تراشتے ہیں
رقص و سرود کی محفلیں گرم رہتی ہیں

یہ سب عشق کی کارفرمائیاں ہیں
اس کی ہر ادا پر دل قربان کرتی آئی ہوں
اس کو میں نے پالا پوسا ہے
دانے دانے سے نوازا ہے
بلبل کے بچے کی ماں آئی
میرے جگر کے ٹکڑوں کو اپنی چونچ سے
تہس نہس کر کے
ایک ٹکڑا لے کر بھاگی
اور میں اس ٹکڑے کی تلاش میں کہیں دور جا نکلی
میں نے اس کو پالا پوسا ہے
دانے دانے سے نوازہ ہے

○○

ماں

میں
سرابوں، عذابوں میں قید
تنہا
کبھی پیشِ نظر پھیلے ہوئے
ترے رستے تکتی ہوں
تجھے دیکھنے کو ترستی ہیں نگاہیں
عجب ویران موسم ہے
ہوا نے جو چپ آسماں سے اتاری تھی
وہ مرے ساتھ ٹھہری ہے
ڈر لگتا ہے
مرے ہر سو اندھیرا ہے
تاروں کی روشنی اب گھر آتی نہیں
یہ تاریکی جاتی نہیں
ایسے میں، میں تجھے آواز دیتی ہوں

مگر مری صدا
درِ اظہار پر دستک دیئے بغیر
واپس آتی ہے
میں حیراں ہوں
تو مرے نہایت پاس رہتی ہے
تیری قربت کا ہر لمحہ مجھے محسوس ہوتا ہے
پھر بھی پکاروں تو
زباں لڑکھڑاتی ہے
تجھے دیکھنے کی خواہش ہے مجھے
سرابوں، عذابوں میں قید تنہا
کبھی پیشِ نظر پھیلے ہوئے
ترے رستے تکتی ہوں

○

کٹھ ...... پروین راجہ

نظم

کھینچتی چلی گئی مجھے

ہوا

صدیوں پرانے راستے سے

میرے قدموں تلے زرد پتے کراہنے لگے

دھول اُڑاتی ہوا میں

درخت بین کرتے تھے

میں لہولہان ہوتی رہی

مجھ پہ گرد جمتی رہی

تب آسماں سے اتری شام

پل بھر جانے کیوں ٹھہری اور

درختوں، ٹیلوں سے پھسلتی

میرے پاس رکی

میری آنکھوں میں جھانکی

میرے گرد آلود چہرے کو

دھیرے دھیرے چھوتی گئی، مسکراتی گئی

اور ڈھلوان پر سے آ کر آہستہ آہستہ

پھسلتی نیچے کھڈ میں اُتر گئی

میں نے پیچھے دیکھا

رات میرا انتظار کر رہی تھی!

○○

نظم

من کے اندر جھانک کے دیکھو
من کتنا مٹیالا ہے
اندھی دھوپ سمندر جیسی
آنکھ کے اندر جالا ہے
دور ندی بہتی رہتی ہے
پاؤں کے نیچے کنکر پتھر
پانی کو ترستے ہیں پرندے
پانی کتنا نیارا ہے
خواب سے آنکھوں میں لیکن
دھوپ نگر اندھیرا ہے
آنکھیں موند چکا ہے سورج
سب گڑبڑ گھٹالا ہے
جسم ادھورے لوگ ادھورے

دنیا عجیب سی لگتی ہے
سہمی سہمی ساری سانسیں من کے
اندر بستی ہیں
نیکی کرنا اچھا ہے پر نیکی کر کے دیکھ لیا
دریا میں ڈوبے ہے نیکی
دریا بن کے دیکھ لیا

OO

✍......عفت زرّیں

داستان

میری آنکھ کے کاجل جیسا
تیری یاد کا ہر اک لمحہ
آنکھوں میں چبھتا رہتا ہے
دور کہیں اک پنکھ پکھیرو میٹھی آواز
میں اکثر یاد تجھے کرتا رہتا ہے
قدموں قدموں ریت جمی اور
راہ کے بیچ اندھیرا ہے
من نگری کا سانپ ڈسے ہے دل پر
درد کا پہرا ہے
دھوپ ندی اور گہرا ساگر
من کے اندر پیاس کی گھاگر
ڈوبنے والا ڈوب گیا ہے
تنکا تنکا نتھرا پانی ریزہ ریزہ شیشہ بکھرا
پھر بھی ہیں چپ چاپ پرندے
اپنی اپنی ڈال پہ بیٹھے
من کے موتی رول رہے ہیں
چپ ہیں پر کچھ بول رہے ہیں
طوطا مینا سکھی سہیلی/ دنیا جیسے ایک پہیلی
قصہ دل کا ان کی کہانی

شیش محل میں بیٹھی رانی
داستاں سب کو سناتی ہے
دور دیس سے شہزادہ کوئی
گھوڑے پر آجائے گا اور مجھے/ لے جائے گا
لمحہ لمحہ وقت کٹے ہے
آہٹ آہٹ دل کی دھڑکن
بیت چکی مدت بھی لیکن/ کوئی نہیں ہے آنے والا
شہزادی اب بوڑھی ہوگی
پھول بھی تنہا، وہ بھی تنہا، جنگل دور
تلک/ ہے تنہا
کوئی نہیں ہے ساتھی سجنا
دفن کتابوں میں پھر ہوں گے
قصے میرے، اس کی کہانی
صدیاں بیت چکی ہیں زرّیں
قصہ یہ دہراتی ہوں/ رات کو پھر سو جاتی ہوں
اپنی تنہائی کے دکھڑے سب کو
خود ہی سناتی ہوں

○○

○

سمجھو نہ تم آسان، بہت مشکل ہے
مشکل ہے مری جان، بہت مشکل ہے
یہ رنگ بدل لیتا ہے گرگٹ کی طرح
انسان کی پہچان بہت مشکل ہے

○

جذبات کا چڑھتا ہوا دریا اُترا
نظروں میں سمایا ہوا نقشہ اُترا
رکھتے ہی سنگلاخ زمینوں پہ قدم
کیا کیا نہ مرے دوست کا چہرہ اُترا

○

مولیٰ کی عنایت نہیں دیکھی جاتی
تسکین کی حالت نہیں دیکھی جاتی
اعدا کی شکایت نہیں، اپنوں سے مرے
ہرگز میری راحت نہیں دیکھی جاتی

○

○

افکارِ ضیا بار سے ڈر لگتا ہے
سب نور کے آثار سے ڈر لگتا ہے
کیا قتل اُجالے کا کرو گے، تم کو
ہر روزنِ دیوار سے ڈر لگتا ہے

○

تاثیرِ لہو سرد ہوئی جاتی ہے
رنگت بھی یہاں زرد ہوئی جاتی ہے
اللہ عجب ہے ترے عرفاں کا مقام
ہر چیز جہاں گرد ہوئی جاتی ہے

○

سورج کے نکلنے کا تماشا دیکھا
پھر دن کے بھی ڈھلنے کا تماشا دیکھا
مٹھی میں بھری ریت ہے یہ عمر جسے
پوروں سے پھسلنے کا تماشا دیکھا

○

✍ ...... سلیم ساغر

○

سورج کو نکلنے میں بڑی دیر لگی
اس رات کو ڈھلنے میں بڑی دیر لگی
کچھ ذات کا عرفان بھی آسان نہ تھا
کچھ مجھ کو سنبھلنے میں بڑی دیر لگی

○

حالات کی سولی پہ لٹکتا ہوں میں
خود اپنے تجسس میں بھٹکتا ہوں میں
ناحق ہی الجھتی ہے یہ دنیا مجھ سے
ناحق ہی زمانے کو کھٹکتا ہوں میں

○

یہ شہرِ ستم کار نہ جینے دے گا
یہ وقت کا بازار نہ جینے دے گا
ہوتی ہے یہاں زر کے مطابق عزت
مجھ کو تو یہ معیار نہ جینے دے گا

○

دن رات تخیل میں بسر کیا کرنا
بے فیض جزیروں کا سفر کیا کرنا
شاعر ہوں میسّر نہ ہو روٹی تو مجھے
شہرت، یہ نمائش ، یہ ہنر کیا کرنا

○

یہ راہ کی دیوار بھی ہوجاتا ہے
اک باعثِ تکرار میں ہوجاتا ہے
تم لاکھ اسے پھول بتاؤ لیکن
یہ لفظ تو تلوار بھی ہوجاتا ہے

○

احساس کی شدت بھی ہے خوشبو کی طرح
یہ درد کی لذت بھی ہے خوشبو کی طرح
موجود رہے اور کہیں ہاتھ نہ آئے
واللہ محبت بھی ہے خوشبو کی طرح

✍......تنویر طاہر

نذرِ غنیؔ کاشمیری

منتظر ہے مثلِ عاشق شہرِ یارانِ غنی — قلزمِ معنی میں آئے پھر سے طوفانِ غنی

فخرِ میرؔ ورشکِ غالبؔ کی ثنا مقصود ہے — اے خدایا لفظ دے دے جو ہو شایانِ غنی

رنگِ گل یا نغمۂ بلبل نہیں تنہا یہاں — داغِ لالۂ سے مُزیّن ہے گلستانِ غنی

احتیاجِ ابرِ باراں آنسوؤں میں گم ہوئی — رشکِ فصلِ لالۂ وگل ہے بیابانِ غنی

شرحِ حُسنِ یار کہہ دو یا عروجِ آگہی — ہاں جبینِ فکر کا جھومر ہے دیوانِ غنی

رفعتِ اہلِ تخیل سے ہوا کچھ آشنا — دِل میں پیوستہ ہوا ہے جب سے پیکانِ غنی

کیا ضرورت ہے کہ ہو منّت کشِ بالِ ہما — خود ثبات وحُسن کا پیکر ہے دیوانِ غنی

حسنِ استقبال میں آؤ سجائیں انجمن — کرالہ پن کو ڈھونڈنے آیا ہے مہمانِ غنی

ہم نوائے طالبؔ وصائبؔ امیرِ اہلِ فن — حلقۂ یاراں نہیں بھولا ہے احسانِ غنی

عہدِ ماضی کے پریشاں کھنڈرو دیکھو ذرا — ارضِ دِل پر کس طرح قائم ہے ایوانِ غنی

آستانِ مغلیہ پہ سر جھکایا ہی نہیں — کیا فقیری میں سوا تھی دیکھئے شانِ غنی

پہلے آہِ آتشیں جاتی ہے استقبال کو — پھر نکلتی ہے تنورِ عرش سے نانِ غنی

دِل شکن عہدِ جفا میں جب شکستہ خواب تھے — مخزنِ ترتیب تھے موئے پریشانِ غنی

چار صدیاں ہو گئیں پر بڑھ رہا ہے روز وشب — کیا بیاں ہو وسعتِ چاکِ گریبانِ غنی

ساقیا ویرانیٔ مرقد پر روئے کیوں نہ دل — خندہ زن ہے ماہ و اختر پر شبستانِ غنی

زندگی کا کیا بھروسہ لکھ دیا کچھ حالِ دِل — سوچا طاہرؔ کچھ تو کم ہو سر سے احسانِ غنی

○○

تنویر طاہر...... ✍

دیوانِ غنیؔ کی پہلی غزل کا منظوم ترجمہ

جنوں وہ دے نکالوں میں حدودِ عقل سے پا کو
اے دل زنجیرِ پا کرلو فقط دامانِ صحرا کو
یہ دیکھو محتسب کا کیا عجب رتبہ ہے محفل میں
فقط اِک آن میں خالی صراحی نے کِیا جا کو
درونِ مے کدہ زاہد نہ کرنا ہوش کی باتیں
کہ رندوں نے ہے چھلکایا جنوں میں خونِ مینا کو
تمنّا گر ہے شہرت کی اسیرِ دامِ عزلت بن
رہِ پروازِ خلوت سے ہے شہرت نامِ عنقا کو
تھی بے رنگی درو دیوار سے ظاہر فلک پھر کیوں
ڈبویا رنگِ ماتم میں مری چھوٹی سے دنیا کو
رہِ گردوں نہیں پاتا اسیرِ تن نفس گر ہو
تعلق اوج سے کیسا ہے مرغِ رشتہ دریا کو
غنی روزِ سیاہ پیرِ کنعاں کا تماشا دیکھ
کہ روشن کر گیا نورِ نظر چشمِ زلیخا کو

☆☆

☆: ...... شبیر احمد شبیرؔ

محمد ایوب بےتابؔ کا منفرد لہجہ

کشمیر کے مقامی شعری ادب میں غزل گوئی، نظم نگاری کی نسبت ترجیحی توجہ کی حامل رہی ہے۔ اِسی علّت کی پاداش میں یہاں کے ادبی ذخیرے میں نظموں کا فقدان دِکھائی دیتا ہے۔ حالانکہ اظہارِ تخیل کے تئیں غزل کے مقابلے میں نظم کی بساط لامحدود امکانی وسعتوں کو محیط ہے۔ اس تناظر میں کہ پابند نظم کے ماورا نظم کی باقی اقسام میں طائرِ تخیل کی پرواز کے لئے تعیّنِ جہات میسر ہیں۔ نظم کی ان اقسام میں نہ تو بحور و اوزان کی تخصیصی اور تقرری بندشیں آڑے آتی ہیں نہ قافیے کا تدارُک۔

اس تمہید میں نظمیہ اسلوب کی جانب کشمیری شعرا کی خاصی تعداد کے مائل ہونے کی اُمید کی جاسکتی تھی۔ مگر صورتِ حال اس کے یکسر برعکس رہی ہے۔ اکثر کشمیری شاعروں کے اظہارِ تخیل کو غزلیہ اسلوب ہی راس آیا۔ اس کی ایک خاص وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ نظمیہ اسلوب کی گنجائشی پہنائیاں موضوع اور مضمون کی پہلوداریوں کے ساتھ ساتھ معنی آفرینی کی بالیدگی کا بھی مطالبہ کرتی تھیں۔ اس مطالبے کو تخیلی سفر کی منزل جان کر جن کشمیری شاعروں نے نظمیہ اسلوب میں طبع آزمائی کی اُن میں ''محمد ایوب بیتابؔ'' قابلِ ذکر ہیں۔

جنوبی کشمیر کے شوپیان نامی تاریخی قصبے کے باسی محمد ایوب بیتاب کی اس مقدور بھر نظم گویانہ کوشش کی ترجمانی اُن کے ''ویتر اون پیوم'' (مجھے جھیلنا پڑا) نامی کشمیری نظموں کے مجموعے سے ہوتی ہے۔

بیتاب کی نظموں کی پہلی خوبی اسلوبی سلاست اور سادگی ہے۔ کئی جگہوں پر بیتاب کے مختصر اور عام فہم الفاظ میں خیالات کی جامعیت نظر آتی ہے۔ اگر چہ اس اسلوبی اختصار کو ایجاز سے تعبیر نہیں کیا جاسکتا تاہم کئی جگہوں پر ارادی یا غیر ارادی سطح پر اُجاگر ہونے والے مجازی اور استعاری پہلو ایجازی خوبی کا ضرور عندیہ دیتے ہیں۔

''وہتر اوُن پیوم'' (مجھے جھیلنا پڑا) نامی کشمیری نظموں کے اس مجموعے کا نام معروف کشمیری صوفی شاعر صمد میر کے اس صوفیانہ شعر سے مستعار لیا گیا ہے۔

وسِیہ کار مشکل بار گوٗب گوم...... وہتر اوُن پیوم[1]

اس کی تائید بیتاب کے نظمیہ مجموعے میں نظر آنے والے کچھ ایسے شعری نمونوں سے ہوتی ہے جن پر اگر حقیقت سے قطع نظر مجازیت کا اطلاق کیا جائے تو شعری متن صوفیانہ مفہوم کے قریب ہو جاتا ہے۔ حالانکہ بیتاب خود صوفیانہ مزاج کے حامل نہیں ہیں۔ کشمیری زبان کے معروف ناقد پروفیسر شفیع شوق، محمد ایوب بیتاب کے نظمیہ اشعار سے اُبھرنے والی اس معنوی صورت کو بھانپ کر ''ویتر اون پیوم'' نامی نظمیہ مجموعے کے پیش لفظ میں یوں رائے دیتے ہیں۔

''میے چھُہ از تہِ فخر محسوس سپدان زِ ہائیر سیکنڈری سکوٗل شوپیان کہِ میگزینہِ کس ۱۹۶۴ء شمارس منز رُوٗ دُس بہِ بیتاب صأب تہِ ییلہ زن بہِ نوٗی مہِ جمأژ پران اوُسس۔ تِنہ پتہ از تام چھے میہ بیتاب صأبنہ شأعری متعلق مستقِل پأٹھی رائے پیہٗ زِ بیتاب صأب چھُہ حسین لفظن منز پیش کرن وول شأعر۔ بشری محبت چھُہ تِمسند بن غزلن تہِ تمی سِنزن نظمن منز بشری سوٗتھرِس پیٹھے تہِ یہِ چھُنہِ کانہہ لبادٕ اختیار کراں''

یعنی مجھے آج بھی فخر محسوس ہوتا ہے کہ میں ہائر سیکنڈری شوپیان کے میگزین کے شمارے میں بیتاب صاحب کے قریب رہا۔ تب سے آج تک بیتاب کی شاعری کے تئیں میری یہی مستقل رائے ٹھہری ہے کہ بیتاب حسین الفاظ میں پیش کرنے والا شاعر ہے۔ اُس کی غزلوں اور نظموں میں بشری محبت بشری سطح کی ہی حامل ہے اور یہ کوئی لبادہ نہیں اوڑھتی ۔ شعری مجموعے سے چند نظمیں منتخب کر کے ان کا مفہوم اردو ترجمے کی صورت میں پیش کرنے کی کوشش کروں گا۔ اور اُبھرنے والی فنی خوبیوں کی نشاندہی بھی کروں گا۔ محمد ایوب بیتاب کی مختصر مگر جامع تخیل سے عبارت پہلی نظم کا عنوان ہے ''شُرٛ س'' (چُبھن) اس نظم کا متن یوں ہے۔ ع

لیس نہٕ کرتَلِچ چھو کھ چکارس کھوٚت رائٕہنٛز

دَگ ؤ ژھس چھو کہٕ دأ وِی گو

تس ظأہر لوٚگ قلمہٕ ترٛوس

ترجمہ: ...... جس نے کبھی تلوار کے زخم کو بھی قابلِ اعتنا نہ سمجھا اُس کے بدن میں درد اُٹھا، زخمی ہو گیا، شاید اُس کے بدن میں قلم کی نوک چُبھ گئی۔

مختصر کلمات سے مرکب بیتاب صاحب کی یہ سہ مصرعی نثری نظم کسی نادر خیالی کا مخزن نہیں۔ قلم اور تلوار کا تقابلی موازنہ بیانیہ صورت میں کئی اور شعرا نے بھی کیا ہے۔ اس تعلق سے عامیانہ اسلوب سے عبارت ایک اردو شاعر کا یہ شعر مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔

یہ پوچھو کسی مردِ مختار سے — قلم تیز چلتا ہے تلوار سے

اس تناظر میں شعوری یا لاشعوری سطح پر بیتاب صاحب کی اس سہ مصرعی نظم کو تتبع کا نتیجہ بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔ البتہ بیتاب صاحب کے شعری اسلوب کی خوبی یہ ہے کہ انہوں نے اس نظم میں مسند الیہ کو ضمیری صورت میں پیش کیا ہے۔ علمی معانی کے مطابق اس طرزِ اسلوب سے نفسِ مضمون کی پوری وضاحت ہوتی ہے۔ اس وضاحت کی رو سے مسند الیہ پر تلوار کے گھاؤ کی نسبت نوکِ قلم کی چُبھن سے اُٹھنے والی ٹیس کے نتیجے میں اُس پر طاری ہونے

والی درد بھری تڑتڑاہٹ کا خاصا احساس ہوجاتا ہے۔ یوں تقابلی موازنہ سے برآمد ہونے والے نتیجے سے یہ عندیہ کھلتا ہے کہ قلم کی چُبھن ضربِ تلوار سے کہیں زیادہ تکلیف دِہ ہے اور قلم کی چُبھن سے اُٹھنے والی ٹیس استمراری ہوتی ہے جب کہ تلوار کا زخم دیر سویر اندمال پا ہی جاتا ہے۔ قلم کی یہ استمراری ٹیس ہجوِ قبیح یا ملیح کی صورت میں قرطاسِ ابیض پر عبارت ہوکر نہ صرف زندگی بلکہ موت کے بعد بھی جاری رہتی ہے۔

بیتابؔ صاحب کی دوسری مختصر نظم ''آنہٕ''یعنی ''آئینہ''عنوان سے کچھ اس طرح کے اسلوب سے مزیّن ہے۔

یامہٕ آنن آٮ۪نہٕ وُچھ
گوٚو سنخ روٚبوٚد
گتہِ روٚدیوٚد روٚ وس وجوٗد

ترجمہ:...... جوں ہی آئینے نے آئینہ دیکھا، حیرت کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈُوب گیا۔ اپنی ہستی سے گیا اور اُس کا وجود کھو گیا۔

بیتابؔ صاحب کی اس مختصر نظم کو جملۂ خبریہ کی حیثیت حاصل ہے۔ اس تناظر میں کہ پہلے مصرع میں لفظ ''آئینہ'' کے برتاؤ کی دو صورتیں ہیں۔ پہلا آئینہ مبتدا کی صورت پا گیا ہے جب کہ دوسرا آئینہ فعلی صورت پا کر اپنے مبتدا کی خبر بن گیا ہے۔ یعنی قاری کو جانکاری ملتی ہے کہ کسی آئینہ نے آئینہ دیکھا، اس کے بعد کے دو مصرعے پہلی خبر سے مل کر خبریہ صورت کو مستزاد کرتے ہیں۔

یہ نظم کے متن کا ظاہری پہلو تھا۔ اب اصل اور ترجمے کے تناظر میں نظم سے عبارت تخیل کی گہرائی ناپنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بیتابؔ صاحب کا پہلا برتا ہوا لفظ ''آئینہ'' استعارۂ اصلیہ کی حیثیت کا حامل ہے۔

استعاریۂ اصلیہ کا تعارف علمِ بیان میں یوں کیا گیا ہے:۔

"الاستعارةُ الاصلية :- وهی ما کان اللفظ المستعار فیها اسماً جامداً غیر بھم ......
سواءٌ کان اسماً جامداً لذاتِ لا کاالبدر اذا استعیر للجمیل اور اسماً جامداً لمعنی کاالقتل اذا استعیر للضربِ الشدید"

یعنی استعارۂ اصلی سے مراد ہے وہ مستعار لفظ جو اسمِ جامد ہو اور اس میں ابہام نہ ہو۔ چاہے اسم جامد (یا اسمِ جنس) کسی ذات سے متعلق ہو جیسا کہ چاند کسی شخص کے جمال کا استعارہ بنایا جاتا ہے چاہے اسمِ جامد کی استعاری صورت معنوی ہو جیسے قتل کو گہرے زخم کا استعارہ بنایا جاتا ہے۔

اس استعاریہ مجازیت میں نظم کے مصرع اوّل میں برتا ہوا پہلا آئینہ محبوب کی جانب اشارہ کرتا ہے۔ اس کی تائید آئینہ لفظ کی اسنادی صورت سے بھی عیاں ہے۔ دوسرا لفظ "آئینہ" اسمِ جامد کی صورت میں اپنے لغوی معنی سے ہی عبارت ہے۔ حقیقت و مجاز کا یہ اسلوبی قالب بیتاب صاحب کی اس مختصر نظم کا معنوی خاکہ کچھ اس طرح آشکارا ہوتا ہے کہ عاشق کے محبوب کے بے نیاز دِل کو گمان تھا کہ میں کسی پر فریفتہ نہیں ہو سکتا چاہے کسی کے حُسن و جمال سے کس قدر بھی جوبن ٹپکتا ہو لیکن جب اتفاقاً آئینہ سامنے آنے پر اُس کی نگاہ حسین و جمیل چہرے پر پڑی تو جذبات پر سکتہ طاری ہونے کے نتیجے میں اپنا ہوش کھو بیٹھا۔

بیتاب کے نظمیہ ظرف سے چھلکنے والی اس مستعار مجازیت کو تقلیدی کوشش سے تعبیر کیا جا سکتا ہے، اس تناظر میں کہ نظم کے متن سے اظہار پانے والی معنویت غمّاز ہے کہ نظم کا خاکہ اُتارنے کے موقع پر بیتاب صاحب کی لاشعوری پرت پر شاید مرزا غالب کے اس شعر کا مفہومی خلاصہ سایہ فگن رہا ہو۔

آئینہ دیکھ اپنا سا منہ لے کے رہ گئے
صاحب کو دِل نہ دینے پر کتنا غرور تھا

میرا یہ قیاس صحیح ہونے کی صورت میں بھی محمد ایوب بیتاب کی اس مختصر نظم کے

اسلوب و متن کے بانکپن پر حرف نہیں آسکتا ہے کیونکہ کسی مقتدر شاعر کے تخیل سے اثر لے کر تقلیدی تجربہ کرنا بجائے خود ایک فنکارانہ کمال گردانا گیا ہے۔

بیتاب کی تیسری نظم ''زِندِ لاش'' (زندہ لاش) کے عنوان سے ہے۔ جس میں کچھ اس طرح کی خیال بندی ہوئی ہے۔

میون ضمیر

یۄ دوے نہٕ رکر ہے خودکُشی

اَدٕ بہٕ زِندٕ کتہٕ آسہٕ ہا

ترجمہ:......میرا ضمیرا اگر خودکُشی نہ کرتا۔ تو میں کیوں کر زندہ ہوتا......!

محمد ایوب بے تاب کی اس نظم کا عنوان اس کے متن سے پوری مطابقت رکھتا ہے۔ کیوں کہ انسانی وجود میں ضمیر ہی وہ بے بہا گوہر ہے جو انسان کو انسانیت اور انسانی اقدار کی بقا اور اس انمول اثاثے کو محفوظ رکھنے کے تئیں تحریکی جذبے سے سرشار رکھتا ہے۔ یہ ایک ایسا عظیم کارنامہ ہے جس کی انجام دہی کے لئے باضمیر افراد کو ان گنت آزمائشی مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ ان مراحل میں ایسے بھی مواقع پیش آتے ہیں جب انسان کی جان جوکھم میں پڑتی ہے۔ انسان کا جذبہ بودا ہو تو وہ ضمیر کا گلا داب کر حالات اور سماجی تقاضوں سے سمجھوتا کرنے میں ہی عافیت سمجھتا ہے۔ اس طرح کے ضمیر کُش سمجھوتے کے بعد اگرچہ انسان کو زندگی کا کچھ اور عرصہ جینے کا پروانہ مل ہی جاتا ہے مگر اس عرصے میں انسان لاش کے مشابہ ہوجاتا ہے۔

ضمیر کی خودکشی کو زندگی سے محرومیت کی علت ثابت کر کے محمد ایوب بیتاب نے مضمون کے اسی بحرِ بیکراں کو نظمیہ کوزے میں سمونے کی سخنورانہ کوشش کی ہے جس کا خلاصہ معروف اردو شاعر عرش صہبائی کے اس شعر میں مضمر ہے۔

خاموش رہیں گے تو ضمیر اپنا گھٹے گا

حق بات پہ سنگین سزائیں بھی ملیں گی

بیتاب کی ایک اور نظم کا عنوان ہے ''اَتھر'' یعنی (دیمک) اس نظم کا متن یوں ہے۔

چھُس یہٕ لیکھاں مجبۄر چھُس

لۄکھ کیا مجبۄر چھاسائبۄزِنس

دِتی ہۄر ران گئے کاغذٕ کٕ اُتھرِ بن غذا

ترجمہ:......میں اپنی مجبوری کی بنا پر لکھتا ہوں......(یعنی میرے اندر کی تخلیقی صلاحیت اور اضطراب مجھے لکھنے پر مجبور کرتا ہے) لوگ میرا لکھا ہوا سننے یا پڑھنے کے لئے مجبور تو نہیں ہیں۔! (یعنی لوگوں کو پڑھنے کے لئے کون مجبور کر سکتا ہے) ایسے میں میری تخلیقات پر مشتمل کاغذات دیمک کی غذا کے اضافی وسیلے بن گئے۔ (یعنی میری تخلیقات سے مزیّن کاغذات کو دیمک چاٹتے ہیں)۔

بیتاب کے یہ نظمیہ اشعار تخیل سے ماورا موجودہ ماحول اور منظر نامے کے تئیں اُن کی حد درجہ مایوسی کے مظہر ہیں۔ بے تاب صاحب صرف اپنی ہی تخلیقات کے دیمک زدہ ہونے پر متاسف نہیں بلکہ کشمیری زبان کے پورے ادبی ذخیرے کے دیمک زدہ ہونے پر بھی فکر مند ہیں۔ یہ بیتاب صاحب کی ادیبانہ شخصیت میں مضمر غایت درجہ حسّاسیت کی واضح دلیل ہے۔

محمد ایوب بے تاب کی ایک اور نظمیہ سوغات کچھ اس طرح کے اسلوب سے مرکّب ہے۔

راتہٕ گئے دوہہ کھوٗٹ زمانن جولہِ منز

چھِنہٕ اُز ئیک دوہہ تام گُنہ تام گُنہِ تس اَتھِ یِواں

چِرِ گرُس تھف بُتھہِ لگِی ماسخ بکار

ترجمہ:......گزرے ہوئے کل کے دِن کو زمانے نے جھولی میں چھُپا دیا۔

آج کے دن کے لمحے کا ابھی تک اُس کو سراغ نہیں ملتا ہے

ایسے میں غنیمت سمجھ کر اس موجودہ لمحے کو مضبوطی سے پکڑے رہو کہ آئندہ اس کے کام آنے کا امکان ہے۔

بے تاب نے زمانے کی برق رفتار گردش کو کِنایہ بنا کر دو حقائق آشکار کئے ہیں۔ ایک

یہ کہ زمانے کے برق رفتار گردشی عمل کی اتھاہ گہرائیوں میں گم ہونے والے گزرے کل کا واپس آنا ممکن نہیں۔ اس غیر امکانی حقیقت پر غور کر کے موجودہ یعنی آج کے دن کے لمحات کا صحیح اور مناسب استعمال کرنا حسّاس ذہنیت کی علامت ہے۔ کیونکہ ابھی تک آج کا دِن ماضی کی گرفت سے محفوظ ہے اور اس کے لمحات پر ہمارے اختیارات حاوی ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہمارے آس پاس سے ہماری لاپروائی اور غفلت کی کیفیت میں کھسک جائیں اور ہمیں ان کے معدوم ہونے کی خبر بھی نہ ہو پائے۔ اس اندیشے کے پیش نظر لازم ہے کہ وقت پر ہماری پوری گرفت رہے تاکہ ان موجودہ لمحات سے کیا جانے والا مثبت استفادہ ہمارے آنے والے ایام کے روشن امکانات کی تمہید ثابت ہو جائے۔ اس نظم سے دوسری نمایاں ہونے والی حقیقت دنیا کی وہ ناپائیداری ہے جو حسّاس ذہن اور سنجیدہ جذبات کے حامل شعرا کے سخنورانہ اسلوب میں قدرِ مشترک موضوع کی حیثیت سے شامل رہا ہے۔

بے تاب کی ایک اور غور طلب سوغات کا اسلوبی حُسن کچھ اس انداز سے جھلکتا ہے۔ نظم کا عنوان ہے ''کشکول''

میانہِ اَڈِ وَژِھ اَچھ
کشکول دأ رِتھ منگاں

لا اِلٰہ میٔ بخشو خاب واپس ورأ وی متہ

ترجمہ:...... میری ادھ کھلی آنکھیں
کشکول لئے سوالی ہیں

لَا الٰہ مجھے اپنے کھوئے ہوئے سپنے لوٹا دو :

نظم کا سیاق وسباق عندیہ دیتا ہے کہ بے تاب صاحب کے کچھ حسین اور تعبیری استحقاق کے حامل خواب سماج کی بے اعتنائی کی نذر ہو گئے ہیں۔ اس کی عکاسی اُن کی شاعرانہ حیات سے بھی ہوتی تھی کہ سماج میں اُن کی شاعرانہ تخلیقات کے ردِ عمل کے تئیں اُن کے بُنے ہوئے

سارے سپنے چُور ہو گئے۔ ادبی حلقوں میں اُن کو وہ توجہ نہیں ملی جس کا موہوم سا امکان بھی اُن کے خوابوں کی خوش تعبیری کا وسیلہ بنتا۔ شاید اسی لئے بے تاب صاحب لا الٰہ کے متبرک الفاظ کا واسطہ دے کر اپنے زمانے سے یاس و نا اُمیدی کی بھول بھلیوں میں کھوئے ہوئے اپنے خوابوں کی واپسی کا مطالبہ کرتے ہیں۔ بے تاب صاحب کی اس نظم کی اسلوبی زینت کا ایک روشن پہلو اس میں اظہار پانے والی صنعتی خوبی ہے۔ علمِ بیان کے استعاری اقسام میں ایک قسم استعارہ تخلیلیہ کے اصطلاحی نام سے متعارف ہے۔ استعارے کی اس قسم کا تذکرہ علمِ بیان سے متعلق کتابوں میں ان الفاظ میں ہوا ہے۔

" الاستعارة التخييلية : –وهی مالم يكن المستعارلهٗ فيها محققاً (حِسّاً او عقلاً)
یعنی استعارہ تخیلیہ استعارے کی وہ قسم ہے جس میں مستعار لہٗ کی ایسی کوئی بھی تحقیقی حیثیت نہ ہو جو عقل یا احساس (حِس) سے تعلق رکھتی ہو۔ یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ کسی غیر ذی روح کے تئیں ایسی شباہت قائم کرنا جو حقیقت میں اُس کا خاصہ نہ ہو۔

بے تاب نے اپنی اس نظم میں آنکھ کے لئے کشکول پھیلانا استعارہ بنایا ہے۔ ظاہر ہے کہ آنکھ نہ تو عقلاً اور نہ ہی احساساً کشکول پھیلا سکتی ہیں۔ اس تناظر میں بے تاب کے اس نظمیہ متن میں تخیلی استعارے کی جھلک نظر آتی ہے۔ یعنی ایسی شباہت کا جو صرف تخیلی اور تصوّری حیثیت کی حامل ہوتی ہے اور جو استعاری شباہت صرف غیر ذی روح اشیاء کے لئے ثابت کی جاتی ہے۔ محمد ایوب بیتاب کا ایک اور نمونہ '' خاب '' یعنی '' خواب '' عنوان سے یوں اُن کے تخیل کا مظہر ہے۔

بیدار چشموۄ ٹلی رنگہٕ دار خاب

تأپر ژھارۄ

أچھہٕ ؤٹھہ

ترجمہ:...... بیدار آنکھوں سے رنگین خواب بُنیے

پھر اُن کی تعبیر آنکھیں بند کر کے کیجئے (ڈھونڈ یئے)

بے تابؔ کی اس مختصر نظم کا لہجہ انشائیہ ہے۔ علمِ معانی کی رو سے اگر انشائیہ اسلوب میں کسی چیز کی طلب مقصود ہو تو اس امر کی رعایت ضرور رہنی چاہئے کہ طلب کے اسلوب میں ایسی شئے کی خواہش کی جائے جس کا حاصل ہونا ممکن ہو۔ جس چیز کا حصول ناممکن ہو اُس کی طلب کو قولِ محال ہی سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ اس نظم میں دوسری صورت کا اظہار ہوتا ہے۔ یعنی چیز کے حصول کی وہ طلب جو قولِ محال کی صورت اختیار کرتی ہے۔ نظم میں بے تابؔ قارئین یا سامعین سے کہتے ہیں کہ آپ لوگ بیدار آنکھوں سے رنگین خواب بنیے اور اُن رنگین خوابوں کی تعبیر آنکھیں بند کر کے خوابوں کی تعبیر ڈھونڈ نے کا عمل عقلاً یا عادتاً ممکن ہے۔ لہٰذا بے تابؔ کی اس طلب کو طلبِ محال ہی گرادنا جاسکتا ہے۔ بے تابؔ صاحب کی نظم نگاری کا ایک اور اسلوب رنگ ''تعبیر'' عنوان سے لکھی ہوئی اس نظم میں بندھ گیا ہے۔

راتھ وُچھ میہ تہ خاب کیتھ

کومیہ روٹمت آفتاب

تام کمرُک ژۄنگ ژھۄ

تِلہٕ رۄس خوشک

ترجمہ:...... (گزشتہ) شب میں نے بھی خواب دیکھا

دیکھا کہ میں نے آفتاب کو کولی میں (بانہوں میں) بھر لیا تھا

اسی اثنا میں میرے کمرے کا چراغ بجھ گیا

خشک چراغ تیل کے بغیر

نظم میں آفتاب اور چراغ کا درجہ بند استعاری برتاؤ بیتابؔ کی شاعرانہ فنکاری کے جوہر کھولتا ہے کیونکہ آفتاب کو مجازی صورت میں ''چراغِ چرخِ چہارم'' کہا جاتا ہے۔ نظم میں آفتاب کی استعاری صورت کو شاعر کے محبوب پر بھی محمول کیا جاسکتا ہے۔ اس کے سیاق

وسباق کے آئینے میں چراغ کو شاعر کی آس سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ گویا شاعر کہنا چاہتا ہے کہ میں نے شب میں یہ سُہانا خواب دیکھا کہ میرا محبوب میری کولی (گود) میں ہے۔ اسی اثنا میں میرے کمرے کا چراغ بجھ گیا۔ یعنی میری آس کی روشنی دھیمی پڑی۔ کیونکہ اُس چراغ نما آس میں یقین اور اعتماد کا تیل تھا ہی نہیں۔ استعاروں کی صراحت سے نظم کا متن بیتابؔ کے عاشقانہ جذبات کی عکاسی کرتا ہے۔ مضمون کی ابتدائی سطور میں نے محمد ایوب بے تابؔ کی نظمیہ متن میں ایجازِ حذفیہ کی ہلکی پھلکی جھلکیاں پائے جانے کا تذکرہ کیا تھا۔ حذفیہ ایجاز کی یہ جھلکیاں بیتابؔ کے شعوری ارادے سے وارد نہیں ہوئی ہیں۔ ان کا ورود غیر ارادی ہے۔ ایجازِ حذفیہ سے مرصع بیتابؔ کی کچھ نظموں کی نشاندہی پر یہ مضمون کا اختتام کروں گا۔

حذفیہ ایجاز کا ایک انداز یہ ہے کہ عبارت یا شعر میں مسند الیہ محذوف ہو۔ اس تناظر میں بیتابؔ صاحب کی ایک نظم کا متن ملاحظہ ہو۔

لۆگ وومبرن ہُند حساب

درلیہِ خابن

وأنس ژھوٹ

ترجمہ:......عمروں (زمانوں) کا حساب شروع ہوا

خوابوں کی عمر چھوٹی (کم) ثابت ہوئی

نظم کے متن میں مسند الیہ متکلم ہے جو محذوف ہے۔ یعنی متکلم کے خوابوں کی عمر کم ثابت ہوئی۔ ایجازِ حذفیہ کی عکاس بیتاب صاحب کی (پُڈی آکھ) (نقشِ پا) عنوان سے ایک اور نظم:۔

ماوٚچھم کُنہِ

اۆمگرأندی پٔگہِ لُہم

پُڈی آکھ تٔمسندی سوزنالہِ نش

ترجمہ:......میں نے اس کو کہیں نہیں دیکھا

ہاں البتہ اس کے نقوشِ قدم قوسِ قزح کے آس پاس پائے۔

نظم کے اس متن میں مفعول یعنی وہ جس کو نہ دیکھا (محبوب) محذوف ہے۔ یہ ایجازِ حذفیہ کی مثال ہے۔ حذفیہ ایجاز کی حامل بیتابؔ صاحب کی ''سوچھ'' (فیض) عنوان سے ایک اور نظم

راتھ یِم وِیہہ کھیاؤ وُکھ

لحدِ منزاز مُری تھہندی

تو ہہ چھوکراں دوِیہ خأرُت

ترجمہ:...... کل جنہیں آپ لوگوں نے زہر کھلایا

آج اُن کے جسدی ڈھانچے

تمہیں دعائے عافیت دے رہے ہیں

اس نظم میں مضاف محذوف ہے۔ یعنی وہ مفکر جن کو آپ لوگوں نے زہر کھلایا۔ اس ایجازی محذوفیت کے جلوے محمد ایوب بیتابؔ کی کچھ اور مختصر متن کی نظموں میں بھی نمایاں ہیں۔ جن کی نشاندہی مضمون کی طوالت کا باعث بنے گی۔

محمد ایوب بیتابؔ کی تخیلی گہرائیوں اور خوش اسلوبی کا بانکپن اُن کی ادب پروری کے تئیں خاص توجہ کی مستحق تھی۔ مگر اُن کے اس استحقاق کو بھی اُسی المیے کا کچھو کا لگا جس کی زد نے کئی باصلاحیت کشمیری شاعروں کو گمنام کر دیا۔ ایسے میں ادبی اداروں کی یہ منصبی اور مقصدی ذمہ داری ہے کہ وہ محمد ایوب بیتاب اور اُن جیسے کئی دیگر گم نام یا کم نام شعرا کو ان کے استحقاق کی حد تک ادبی اور عام حلقوں میں متعارف کریں۔ بصورتِ دیگر ان اداروں کی افادیت، مقصد اور ان کی کارکردگی پر محمد ایوب بیتابؔ کی ''ڈُھرِ'' یعنی (آڑ) یا ''حجاب'' عنوان سے لکھی ہوئی یہ نظم وقتی گردش کے متوازی شکوہ سنج رہنے کا احساس دیتی رہے گی۔

دارِ برتڑ وِپرِتھ

لیہٕ تام بندٕ ٹھری آ گر بندی
گاشہِ موٚت اژِ کوراوٚت اَنہِ گٹہِ گُٹھس

ترجمہ:......دروازے اور کھڑکیاں بند......اس انداز سے کہ کوئی دراڑ بھی نہیں۔ درمیان میں ان گنت حجاب، ایسے میں روشنی کے ظلمت سے اٹے کمرے میں اُترنے کی کون سی صورت باقی رہتی ہے۔

کیا ادب سے وابستہ ادارے شاعروں کی گمنامی کے ان پردوں کو ہٹا کر کھڑکیاں اور دروازے وا کرنے کی کوشش کر کے ظلمت زدہ ادیبانہ ہفت خانوں کو روشن کرنے کے تئیں انہماک کا مظاہرہ کریں گے!؟

..........OO..........

۱ :......یعنی اے سکھی۔! میرے دوش پر پڑنے والی ذمہ داری بھاری بوجھ کی صورت میں مجھے سہارنا پڑی۔
۲ :......''بودا''، یعنی کمزور

کشمیری:......محمد ایوب بیتاب

ترجمہ:......شہناز رشید

تلاش

دن کو ملتی نہیں مجھے فرصت
کیسے ڈھونڈوں میں
اپنے سائے کو،
وہ......اُجالے میں کھو گیا جو کہیں
آج شب کو
میں ڈھونڈنے نکلوں
قریہ قریہ
اپنے ہمزاد......اس اپنے سائے کو

نیا خیال

اپنے بچپن کی اس حسیں رُت میں
کیوں نہ میں
دھوپ کے یہ ٹکڑے آج
اپنی ٹوپی میں قید کر رکھوں
کام آئیں گے یہ اماوس میں
ان ہی کے سنگ،
تب میں کھیلوں گا

انمول شے

کہتے ہیں
مر گیا وہ دوست مرا
خیر..........کچھ بھی سدا نہیں رہتا
میرے اِس کوٹ کا بٹن......
ہائے..........!!!
کھو گیا راہ چلتے جانے کہاں!
تھا بہت قیمتی
بہت انمول..........!!

لاش

راستے میں،
پڑی ہے لاوارِث لاش
دوڑ میرے وجود،
جلدی دوڑ
یہ تو تیری بھی ہو سکتی ہے......!!

کشمیری:......محمد ایوب بیتاب

ترجمہ:......شہناز رشید

○

نیا نصاب

علم و دانش پہ راج

کل یگ کا

اتنا پڑھ لکھ کے کچھ نہیں حاصل

آؤ تبدیل اب نصاب کریں

اور شامل کریں ہم

اس میں اب

جھوٹ، دھوکہ دہی،

بداخلاقی

○

اُلجھن

جانے کن اُلجھنوں میں الجھا ہوں

خوف کھاتا ہوں، راہ چلتے ہوئے

نیک سیرت سے بھی میں ڈرتا ہوں

طاری ہوتی ہے کپکپی مجھ پر

○

سوال

مسکراہٹ سے شب کی،

پوچھیں تو

کیا کبھی کھِلکھِلاتے پو پھٹے سے

وہ کہیں آج تک ملی بھی ہے......؟

○

میرا شہر

اب کہیں بھی نظر نہیں آتا

میرے اس شہر میں

کوئی انساں

اب یہاں چاروں اور گھومتے ہیں

جنگلوں کے سفاک وحشی ہی

اب وہ سارے

یہیں پہ رہتے ہیں

کشمیری:......محمد ایوب بیتاب

ترجمہ:......شہناز رشید

○

خصلت

گرچہ یہ پھولِ زعفراں کے کھِلے

آخری وقت میں خزاں کے، مگر

پھر بھی اِن سے بسنت کی گرمی

دوستو، برگ برگ پھوٹتی ہے

○

اپنا بوجھ

پھل سے بھرپور،

پیڑ کی ٹہنی

دوستو...... بوجھ سے یہ اپنے ہی

کہیں جھکی تو نہیں،

کوئی دیکھو

ٹوٹنے کی صدا

سُنی تو نہیں،

کسی نے ....؟

بتاؤ تو مجھ کو...........!!!!

○

سورج

کتنا رنگیں مزاج ہے سورج

اوڑھتا ہے طرح طرح کے رنگ

چہرہ اُس کا دکھائی دیتا ہے

برف سے بھی سفید،

جانے کیوں ....!!!

○

چہچہاہٹ

چہچہاہٹ پرندوں کی سُن کر

وا کیے اپنے ہونٹ غنچوں نے

شبنمی موتی سے بکھرنے لگے

کِتنا دِلکش ہے صبح کا منظر

کشمیری:......محمد ایوب بیتابؔ

ترجمہ:......نذیر آزادؔ

○

ایزادگی

تول کر بولو، چلو جب دیکھو
کان دیواروں میں پہلے ہی سے تھے
اب مل گئیں آنکھیں انہیں

○

وجہ

گھر شیشے کا، مجنوں یا پھر میری ذات
کوئی تو ہوگا
جو پتھر برس پڑے

○

سیرابی

قطرۂ بارش کو
یوں دل میں جُھلایا سیپ نے
سیراب ایسے ہوگئی

○

حقیقت

کاغذ پر
دیمک کا لکھا
جی ہاں یہ ہے سچ

○

پیاس

ابر، کاندھے پر لئے بھرپور میخانہ، چلا
اپنا گلا سوکھا ہے اور
تالو پہ کانٹے پڑ گئے

کشمیری:......محمد ایوب بیتابؔ

ترجمہ:......نذیر آزادؔ

○

سجاوٹ

یہ ہوا آسا قدم رکھ دے ذرا

قربان تجھ پر وقت میں

پازیب تجھ کو باندھ لوں

○

کھملانا

آئینہ سمجھا تو

صبحِ نو بہاراں کی کرن نے

اس میں اپنا عکس دیکھا

یخ نے جو بھینچا

تو دانتوں میں پسینہ آ گیا

○

یکسانی

کاگا تیرے کالے پن پر

کاہے کو پچھتائے

تو ہے کھلم کھلا اور ہم

رنگ یہ دل میں چھپائے

○

خصلت

خزاں کے سرے پر

کھلا ہے اگر

غنچۂ زعفراں

ہتھیلی پہ لے کر

بہاروں کی چنگاریاں

کشمیری:......محمد ایوب بیتابؔ

ترجمہ:......نذیر آزادؔ

○

محبت

تا کہ چن لے صبحِ کاذب

دانہ ہائے آبدار

ہر کرن سورج کی

یوں زلفِ گیا میں پھیرتی ہے انگلیاں

○

لے

قطرہ قطرہ جس جگہ پر گل چکی ہے

برفِ نوافتاد

واں گلِ خیزاں نے آنکھیں کھول دیں

چہرے پہ زردی پوت کر

○

غصہ

بادلوں کے ڈھیر کے نیچے دبا ہے آفتاب

اور نکل آئی ہے یوں اس کی زبانِ شعلہ بار

دور افق کے پار سب ہونے لگا ہے شام سے

نار اندر نار

○

احساس

آئینہ دیکھا تو بینائی گئی

جوں ہی اس نے

کھل رہا دیکھا افق پر اک گجر

کشمیری:......محمد ایوب بیتاب

ترجمہ:......نذیر آزاد

○

شب کے ساتھی

میں کہ دن بھر تھا اکیلا

بھیڑ میں

شام کو گھر ساتھ آئے ہیں مرے

رت جگا اور خوف

○

تکیہ

ہوا کے طمانچے نے کرلی زمیں بوس

انگور کی بیل

سہارے کی لکڑی نے منہ پر کہا

جو بھی تکیہ کرے حال ان کا

یہی ہے میاں

○

آگہی

گر چہ تم چاہو کہ دیکھیں

صاحبوں کا ہفت درجے کا مکاں

تھام کے رکھیو ذرا ٹوپی میاں

○

ہاروت ماروت

کتنی زیبا کتنی رعنا اور حسیں ہے یہ زمیں

شوخ، سندرا اور البیلی ہے یہ زہرہ جبیں

گوش بر آواز رہ ماروت سن میرا سخن

بے گناہی ہے یہاں عصیاں کبائر میں کبیر

............○○............

کشمیری:۔مکھن لال پنڈتا
مترجم:۔سید محمد مبشر رفاعی

جب میں کینیڈا گیا
(قسط 1)

اس سے پہلے کہ میں یہ سفرنامہ صفحۂ قرطاس پر اُتاروں، ذہن کے کینواس پر بچپن کا ایک واقعہ ابھر رہا ہے، جس کو میں قلمبند کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے اچھی طرح سے یاد نہیں ہے کہ میں کس جماعت کا طالب علم تھا۔ بچے صبح کی دعائیہ مجلس یعنی پریر کے وقت ڈاکٹر شوریدہ کاشمیری کی لکھی دعا پڑھ رہے تھے۔ جس کا ایک شعر آج بھی مجھے ازبر ہے۔

یا الٰہی شوق میرا پھولتا پھلتا رہے
دل مثالِ شمع اس کی سوز سے جلتا رہے

دعائیہ مجلس کے اختتام پر معروف استاد دینا ناتھ ہانجورہ دنیا کے حالات و واقعات پر تبصرہ کرتے تھے۔ اچانک انہوں نے مجھے کھڑا کیا اور پوچھا ''مدراس کہاں واقع ہے؟''۔ (ان دنوں چنئی کا نام مدراس تھا)۔ میں کند ذہن، بھلا مجھے کہاں معلوم کہ مدراس کا محل وقوع کیا ہے۔ نہ جانے کہاں سے میرے ذہن میں جنوبی افریقہ کا نام آیا اور میں نے اندھیرے میں تیر مارا۔ سبھی اساتذہ اور لڑکوں نے زور سے قہقہہ لگایا۔ مجھے سخت کوفت ہوئی۔ خدا جانے کیا واہیات بک گیا کہ سکول جانے میں ہی شرم محسوس کرنے لگا۔ حالانکہ بچے ہر بات پر ایک کشمیری مقولہ 'ترتھ ولدٹاس...... ساکنہ مدارس' (یعنی ایسی بات کہنا، جس کا ہونا ناممکن ہو) کہا

کرتے تھے، لیکن یہ معلوم ہی نہیں تھا کہ مدراس کہاں واقع ہے۔اگر اس بات کی خبر میری والدہ کو ملتی تو سخت ڈانٹ پلاتیں۔ بچوں کی پڑھائی کے معاملے میں وہ کافی سخت تھی۔ گھر پہنچ کر میں نے جغرافیہ کی کتاب کھنگالی۔ یاد نہیں آرہا ہے کہ وہ کتاب رام رکھامل کی تصنیف تھی یا کسی اور کی۔ میں یہ دیکھ کر حیران وششدر رہ گیا کہ مدراس ہندوستان میں ہی واقع ہے۔ جتنا ہوسکا مدراس کو برا بھلا کہا۔ پہلی بار ماسٹر جی نے مجھے لڑکوں کے مجمع میں کھڑا کر کے سوال پوچھا تھا۔ دراصل ان کا مقصد مجھے لڑکوں کے مجمع میں خجل کرنا تھا، سو کیا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میرے ذہن میں جنوبی افریقہ کا نام کہاں سے آیا۔ بہر حال تیر کمان سے نکل چکا تھا اس کا اب کچھ نہیں ہوسکتا تھا مگر اس واقعے نے مجھے پڑھائی کی جانب راغب کیا۔ دو ماہ تک میں نے جغرافیہ کی کتاب کا باریک بینی کے ساتھ مطالعہ کیا۔ اس قدر گہرائی کے ساتھ کہ دنیا کا نقشہ آنکھوں کے سامنے ابھرنے لگا۔

نقشے پر جب میری نظر براعظم شمالی امریکہ پر پڑھتی تھی تو اس کے اوپر قلمرو کنیڈا کا نام پاتا۔ یہ نام مجھے بے معنی لگتا کیونکہ میری زیادہ دلچسپی ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں ہی تھی، جہاں ہانجورہ صاحب کے بقول دودھ کی نہریں بہتی تھیں۔ زبان پر بھی یہی نام ورد تھا۔ آج بھی مجھے معلوم نہیں ''قلمرو'' کس کو کہتے ہیں۔ ایک دوست نے بتایا اس کا مطلب ریاست ہے۔ مگر امریکہ کو ریاست ہائے مُتحدہ امریکہ لکھتے ہیں، قلمرو نہیں۔ بہر حال کینیڈا کو میں 'کینڈا' پڑھتا تھا۔ ایسا نہیں کہ میں مخرج کے علم سے بے خبر تھا۔ میں یہ سب لڑکپن کی وجہ سے کرتا تھا۔ حقیقت یہی ہے کہ مجھے اس ملک کے بارے میں کوئی علمیت نہیں تھی کہ گرین لینڈ اس کا شمالی ہمسایہ ہے جہاں کافی برف پڑتی ہے اور ساحل کے نزدیک سرد لہر چلتی ہے۔ اس زمانے میں کشمیر، خاص کر ہمارے علاقے میں کافی غربت تھی۔ پیسہ نایاب تھا۔ اگر شہر جانا ہوتا تو لوگ گاڑی کا کرایہ بچانے کے لئے اکثر پیدل چلتے تھے کیونکہ پہلے پہل گاڑی کا کرایہ دو روپے تھا جو کہ مروجہ زمانے میں بہت زیادہ تھا۔ اس رقم سے ایک کنبہ ایک مہینے کا سودا سلف خرید سکتا

تھا۔(گاڑیاں اکثر شوورلٹ یاڈاج کی ہواکرتی تھیں، جن کی فرنٹ سیٹ ، بیک سیٹ اور پیچھے ایک ڈِکی ہواکرتی تھی) لہٰذا فتور سے پُر دماغ والا شخص یا بے شمار دولت کا مالک ہی دودھ کی نہروں والے امریکہ جانے کا تصوّر کرسکتا تھا۔لیکن قلمرو کینیڈا کسی شمار میں ہی نہیں تھا۔

وقت بدلتے دیر نہیں لگتی۔انسان کے وہم وگمان میں بھی یہ بات نہیں ہوتی کہ قدرت نے دنیا کے کارخانے میں کیسے کیسے اسرار پوشیدہ رکھے ہیں۔ بہر حال جو بھی ہوتا ہے اس میں انسان کے لئے حیران کن اور غیر متوقع واقعات پیش آتے رہتے ہیں اور ہم سوچتے ہیں کہ یہ کیا ہوا......! کیسے ہوا......! اور کیوں ہوا؟۔ کشمیر سے نکلنے کے بعد ہمارے بچے منتشر ہوگئے۔کچھ شمال تو کچھ جنوب پہنچ گئے۔سب سے زیادہ نقصان اُن کا ہوا جنہیں آبائی زمین سے ہاتھ دھونا پڑا۔کہتے ہیں کہ زمین ہمیں باپ دادا کی وراثت میں نہیں ملتی بلکہ ہم اس کو بچوں سے گروی لیتے ہیں۔بہر حال ان ہی بچوں میں کچھ ملک کے مختلف علاقوں میں پہنچ گئے اور کچھ سمندر پار چلے گئے۔اسے قبیل سے میرا بیٹا بھوپیش بھی تعلق رکھتا ہے۔ بھوپیش الیکٹرانکس انجینئر نگ میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری لینے کے لئے کینیڈا گیا۔پی ایچ ڈی کی ڈگری لینے کے بعد اس کو وہیں نوکری مل گئی۔وہ مجھے بار بار فون کرکے کینیڈا آنے کے لئے کہتا،لیکن مجھے وہاں جانے میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔وجہ یہ کہ جب مجھے بچپن میں جغرافیہ پڑھنے کا شوق پیدا ہوا تو میرے مطالعہ میں یہ بات آئی کہ بحر اوقیانوس میں سارگیسو سمندر (SARGASSO SEA) ہے جس کی سطح پر آٹھ میٹر گھاس نما فرش تیر تارہتا ہے۔سارگیسو سمندر ایک وسیع رقبے پر پھیلا ہے اور اس کے مغرب میں برموڈا ٹرائینگل (BERMUDA TRIANGLE) کے شمال کے کونے (VEERTEX) کے اندر تک پھیلا ہے۔ برموڈا ٹرائینگل کافی بدنام ہے اور یہاں کئی ہوائی وسمندری جہاز اچانک غائب ہوئے ہیں۔ میرے اندازہ کے مطابق یہ عرض بلد 20 سے 30 درجہ شمالی اور طول بلد 30 سے 64 درجہ مغرب میں واقع ہے۔ان دِنوں جہازوں کے غائب ہونے کا کوئی معقول وجہ نظر نہیں آتی تھی اور جغرافیہ کے ماہرین کے خیال کے مطابق اس خطے میں کوئی مقناطیسی یا

غیبی طاقت ہے اور یہ ایک معمہ بنا رہا۔لیکن ماضی قریب میں اس پر بہت تحقیق ہوئی، جس کے مطابق اس کی کئی وجوہات ہیں، مثلاً خلیجی رو (GULF STREAM) جو یہاں کافی تیزی کے ساتھ بہتی ہے اور اس کے علاوہ سرکش لہریں (ROGUE WAVE) آبنائے فلوریڈا کے اوپر والے حصہ میں طوفان اور مقناطیسی قوت وغیرہ ہونے سے ہے، بہر حال جو کچھ بھی تھا اس سے کوئی لینا دینا نہیں لیکن مجھے بچپن سے ہی پانی سے ڈر لگتا تھا یعنی میں واٹر فوبیا (water phobia) کا شکار ہوں۔اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ غالباً سات برس کی عمر میں، میں ایک بار ایک رشتے دار کے ہمراہ ہانجی پورہ ناروا و سے گھر کی طرف لوٹ رہا تھا۔ ویشو نالے کے قریب پہنچ کر اس نے میرا ہاتھ تھاما اور نالہ پار کرانے لگا۔ پانی کا تیز بہاؤ میرے پاؤں تلے ریت نکال کر بہا لے گیا اور میں لڑکھڑا کر پانی میں ڈوبنے لگا۔ میرا رشتہ دار میرے پیچھے دوڑ کر آیا اور مجھے پانی سے کھینچ کر پار لے کر گیا۔ پار پہنچ کر میرے ماموں سے کہا کہ ''آج تو یہ پانی میں ہی ڈوب گیا تھا'' مجھے ڈوبنے کا اتنا خوف نہیں ہوا جتنا اس کے کہنے سے ہوا۔اس واقعے نے میرے ذہن پر گہرا اثر ڈالا مجھے لگتا ہے کہ بچپن کے اس واقعہ اور سمندر کی بے پناہ گہرائی، جس کا مجھے تھوڑا بہت علم تھا، کا تصور میری پریشانی کا باعث بنا۔ میں بیٹے کو بتا ہی نہیں سکا کہ مجھے واٹر فوبیا ہے۔ اور اتنے بڑے سمندر کو پار کرنے یا ہوائی سفر کرنے کے بارے میں، سوچ کر ہی میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ بھوپیش ضرور کہتا کہ ہمیں جدید فلسفہ سکھاتے ہو اور خود کسی اور فلسفے میں یقین رکھتے ہو۔ بہر حال میں نے سوچا کہ ہمارا ملک معاشی بدحالی کا شکار ہے۔ یہاں سرکاری طور پر معمولی کام میں بھی عرصہ لگتا ہے دیکھتے دیکھتے عمر گزر جاتی ہے۔ بہتر ہے بیٹے کا دل رکھنے کی خاطر پاسپورٹ کے لئے درخواست دیتے ہیں۔

دو پاسپورٹ بنوانے کے لئے میں نے دو فارم پُر کیے اور اِنہیں لے کر گاندھی نگر جموں پہنچا۔ میری اہلیہ کی درخواست قبول ہوئی لیکن میری رد کی گئی کیونکہ میری میٹرک کی سٹوفکیٹ پر میری ذات (Cast) ''پنڈتا'' درج نہیں تھی۔ اپنی تاریخ پیدائش ثابت کرنے کے

لئے میں نے کچھ زیادہ عقلمندی کا مظاہرہ کرنے کی کوشش کی اور از خود یہ سرٹیفکیٹ کلرک کو دکھائی، حالانکہ کسی نے اس کا تقاضا نہیں کیا تھا۔ کلرک نے میرا فارم واپس کیا۔ میں نے الیکشن شناختی کارڈ جو الیکشن دفتر نے اِجرا کیا تھا، دکھایا مگر اس کو شک و شبہات نے گھیر لیا اس لئے اس نے ایک نہ سنی۔ مجھے افسوس ہوا کہ آج تک ملائکہ سے چوری چھپے بڑھاپے کے دِن گزار رہا تھا اور آج پچپن برس کے بعد ''ذات'' کا جن نہ جانے کہاں سے منہ کھولے نمودار ہوا۔ سب سے مشکل کام تھا اُس وقت کا ریکارڈ کھنگالنا اور سرٹیفکیٹ کی درستی کروانا۔ میں نے کلرک سے میری اہلیہ کا درخواست فارم واپس کرنے کی گزارش کی تاکہ دوبارہ ایک ساتھ دونوں فارم جمع کروا سکوں۔ لیکن کلرک موصوف دوسرے فارموں کے ساتھ اپنے کام میں مشغول رہا اور میرے کہنے کا اس نے کوئی نوٹس نہ لیا۔ اتنے میں مجھے خیال آیا کہ بڑھاپے میں مجھے ذات کو لے کر کیا کرنا ہے، بہتر ہے کہ پنڈتا لکھے بغیر نیا فارم بھروں۔ ہمارے یہاں تو بڑے بڑے شاعر حضرات ذات لکھے بغیر اپنا کام چلاتے ہیں۔ اگرچہ وہ مسکین اور غمگین جیسے تخلص اپنے ناموں کے ساتھ جوڑتے ہیں، لیکن یہ ذاتیں تو نہیں ہیں۔ حالانکہ یہ خیال بھی آیا کہ کل اگر اہلیہ کے بارے میں سوال کریں گے، کیا یہ واقعی تمہاری بیوی ہے؟ اس کے نام کے ساتھ تو پنڈتا لکھا ہے اور تمہارے نام کے ساتھ نہیں۔ اس میں ایک بات جو ہمارے حق میں جاتی تھی وہ یہ تھی کہ ہم دونوں بزرگ تھے اور کسی کے دماغ میں کوئی غلط خیال پیدا نہیں ہوتا۔ اب سوال تھا کلرک کا۔ اگر اس کو گلہری کے مصداق دوبارہ یاد آتا تو کینیڈا جانے کا پروگرام سرے سے ہی منسوخ ہو جاتا۔ لیکن جیسا کہ میں نے پہلے ہی کہا کہ قدرت کبھی کبھی کرشمے بھی دکھاتی ہے اور آپ خود سے کہتے ہو کہ ''بے شک وہ ہے''۔ بالکل ایسا ہی ہوا۔ میری یہ ترکیب کامیاب ہوئی اور میرا فارم بھی قبول ہوا۔ مجھے یقین نہیں آیا اور اطمینان کی سانس لی۔ ویری فکیشن کے لئے فارم کشمیر بھیجے گئے اور ہم سب کچھ بھول گئے۔ بیٹے کو کہنے کے لئے یہ بات کافی تھی کہ ہم نے درخواستیں دی ہیں۔

میرا بیٹا ہر سنیچر کو فون کر کے پاسپورٹ کے بارے میں پوچھتا تھا اور میں کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر ٹال رہا تھا۔ کچھ عرصہ کے بعد میرے بیٹے نے مجھ پر دباؤ بنانا شروع کیا اور میں سفارش ڈھونڈنے پر مجبور ہوا۔ چار دن کے اندر ویری فکیشن کا عمل مکمل ہوا اور ایک ہفتے بعد پاسپورٹ ہمارے گھر پہنچ گئے۔

ایک دفتر سے چھٹکارا پا کر اب دوسرے دفتر سے رجوع کرنا تھا۔ ویزا کے لئے چندی گڑھ یا جالندھر جانا تھا۔ مجھے لگا کہ یہ بھی اچھا ہی ہے کیونکہ ویزا کی اجرائی میں بھی وقت نکل جائے گا۔ میں نے جالندھر جانے کا فیصلہ کیا۔ یہ شہر شاہراہ پر ہی واقع ہے اور میں گھر سے سویرے نکل کر شام کو واپس آ سکتا تھا۔ میں صبح تین بجے گھر سے نکلا۔ بس سٹینڈ سے گاڑی ساڑھے چار بجے روانہ ہوئی اور میں صبح دس بجے جالندھر پہنچ گیا۔ یہاں لوگوں کی سہولیت کے لئے کینیڈا کمیشن کی ایک شاخ کھولی گئی ہے جہاں میں نے فقط ہندوستانی ملازمین کام پر لگے دیکھے۔ میرے دماغ میں خیال آیا کہ یہ بھی اچھا ہے۔ یہ لوگ تو نون میں نقطہ نکالنے کے ماہر ہیں۔ ضرور کسی نہ کسی خامی کی نشاندہی کریں گے اور میں فی الحال اِس بلا سے آزاد ہو جاؤں گا۔ درخواست فارموں میں کوئی کمی نہ تھی البتہ میری اہلیہ کے فوٹو کو یہ کہتے ہوئے رد کیا گیا کہ اس کا بیک گراونڈ نیلا ہے، جو قابل قبول نہیں ہے۔ مجھے کوئی ایسا شخص نہیں ملا جس سے پوچھتا کہ کینیڈا کے لوگوں کو نیلے رنگ سے کیا تکلیف ہوتی ہے۔ بعد میں مجھے احساس ہوا کہ یہ شخص دراصل ساتکی یعنی شریف آدمی ہے۔ اس نے صرف رنگ پر دھیان دیا اور پاسپورٹ یا درخواست فارم میں کوئی خامی نہیں نکالی۔ اگرچہ میرا خیال تھا کہ یہ شخص میرے دانت کھٹے کر کے میرے فارم واپس کر دے گا۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ میری اہلیہ جموں میں تھی، اس لیے مجھے واپس جموں جانا تھا، محترمہ کی تصویر بنوانی تھی اور دوبارہ فارم داخل کرنے کے لئے پھر سے علی الصبح نکل کر واپس جالندھر آنا تھا۔ میں پھر اُسی شخص کے پاس گیا جو میرے اندازہ کے مطابق کلرک تھا۔ وہ سفید لباس زیب تن کیے ہوئے تھا اور ٹائی پہنی تھی۔ ایسے آدمی لائق احترام ہوتے ہیں۔ میں نے

پوچھا'' سر! کیا اس مسئلے کا کوئی حل ہے۔'' مجھے یاد ہے کہ اس نے میری جانب دیکھے بغیر کہا ''نہیں!'' میں دوسری جانب مڑا۔ سامنے ایک سردار جی کھڑا تھا۔ اس کو بھی غالباً کینیڈا کے ویزا کے لیے درخواست دینی تھی۔ اس کے ہاتھ میں کچھ کاغذات تھے۔ میں نے حیرانگی کے عالم میں پوچھا'' جناب! آپ نے تو کافی کاغذات جمع کئے ہیں، میں تو بس فارم لے کر آیا ہوں۔ کیا آپ میری رہبری کریں گے تاکہ میں بھی ایک ہی بار سارے کاغذات لے کر آؤں۔ مجھے جموں سے آنا پڑتا ہے''۔ وہ پریشان ہوگیا۔ جیسے میں اس سے کوئی راز کی بات کہہ رہا تھا۔ مجھ سے چھٹکارا پانے کے لئے سردار جی نے مختصراً کہا'' کرنا پڑتا ہے جی۔'' میں نے کہا'' آپ صحیح فرمارہے ہیں''۔ میں کمیشن عمارت کی نچلی منزل میں آیا۔ برآمدے میں پچیس چھبیس سال کا ایک نوجوان تھا۔ اس نے مجھ سے میری پریشانی کی وجہ پوچھی۔ ڈوبتے کو تنکے کا سہارا ملا، میں نے اپنی ساری کہانی سنائی۔ مسئلہ سن کر وہ جیسے سکتے میں پڑ گیا اور اندر ہی اندر اس مسئلے کا حل ڈھونڈ رہا تھا۔ اس نے کہا'' میں اسی فوٹو سے نئی فوٹو تیار کر کے لاؤں گا، لیکن دوسو روپے لوں گا''۔ میں نے کہا'' بھیا یہ فوٹو چالیس روپے میں بنی ہے۔ تم دوسو روپے مانگ رہے ہو، کیا قیمت زیادہ تو نہیں ہے۔ اس نے سن کر کہا آپ کو معلوم نہیں کہ مہنگائی کتنی بڑھ گئی ہے یہ کہہ کر وہ دوسری جانب مُڑ کر ایک نوجوان کے ساتھ بات کرنے لگا، جیسی میری بات اس پر گراں گزری ہو۔ بے بسی کی حالت میں سوچتا رہا کہ کیا کروں۔ میرے ذہن میں جموں جانے، نئی فوٹو بنوانے اور دوبارہ جالندھر آنے کا پورا نقشہ اُبھرا۔ ایسی بیگاری سے بہتر تھا دوسو روپے خرچ کرنا اور اس جھنجھٹ سے آزاد ہونا۔ نوجوان پر نظر رکھے ہوئے تھا کہ کہیں یہ نظروں سے اوجھل نہ ہو جائے اور یہ روشنی کی کرن بھی ختم ہوئے۔ دوسری طرف نوجوان بھی مجھ پر نظر رکھے ہوئے تھا کہ کہیں اسامی کسی اور کے پاس نہ چلی جائے۔ کچھ دیر کے بعد میں خود ہی نوجوان کے پاس گیا اور کہا'' ٹھیک ہے میں دوسو روپے دینے کے لئے تیار ہوں۔ مگر ایشور کے لیے کام جلد ہونا چاہئیے۔ مجھے جموں بھی پہنچنا ہے۔'' وہ مجھے ایک دکان میں لے گیا۔

دکان کی دیوراوں پر رنگ روغن چڑھایا ہوا تھا لیکن بیچنے کے لئے وہاں کوئی چیز نہیں تھی۔ دکان میں کاونٹر پر دو لڑکیاں بیٹھی تھیں۔ دوسری جانب ایک بینچ تھا جس پر پہلے سے ہی دو لوگ بیٹھے تھے اور پنجابی زبان میں کسی موضوع پر کھسر پھسر کر رہے تھے۔ میں ان سے تھوڑا فاصلہ پر ہی بیٹھ گیا۔ لڑکے نے مجھ سے فوٹو لی۔ لڑکیوں کے ساتھ کچھ کانا پھوسی کی اور دو تین چھلانگے مار کر باہر چلا گیا۔ ایک آدھ گھنٹہ گزرنے کے بعد بھی وہ نظر نہیں آیا میں گھڑی کو دیکھ کر بے قرار ہو گیا جیسے سویوں پر کھڑا تھا۔ میری بے چینی بڑھ رہی تھی اس لیے نہیں کہ وہ بھاگ گیا، بلکہ اس لئے کہ مجھے جموں پہنچنے کی فکر تھی۔ ایک طویل انتظار کے بعد لڑکا واپس آیا۔ پرانی اور نئی فوٹو میرے ہاتھ میں تھمادی۔ راستے میں، میں نے نئے فوٹو گراف کو سرسری طور دیکھا۔ یہ اتنا صاف نہیں تھا۔ اس کام کے لئے دو سو روپے واجب نہیں تھے۔ میں دوڑتے دوڑتے کلرک کے پاس گیا جس نے مجھے اپنی باری کا انتظار کرنے کو کہا تھا۔ خوش قسمتی سے میری باری جلدی آئی۔ کلرک نے میرے پاسپورٹ اور فارم ساتھ میں بیٹھی ایک میڈم کو دیئے۔ میڈم نے حساب لگا کر مجھ سے -/6550 روپے وصول کرتے ہوئے کہا کہ جموں میں ہماری کوئی کوریئر سروس نہیں ہے۔ آپ کو ذاتی طور پر یہاں آکر ویزا حاصل کرنا ہوگا۔ جموں آتے آتے میں نے وہاں سے ملی رسید کو اچھی طرح دیکھا۔ اس میں -/400 روپے کی کوریئر فیس بھی درج تھی۔

میرے خیال سے آٹھ یا نو دن گزرنے کے بعد مجھے بلیو ڈاٹ ایکسپرس پرائیویٹ لمٹیڈ جالندھر سے فون آیا کہ آپ کا پاسپورٹ تین دنوں سے ہمارے پاس پڑا ہے اور اگر آپ اسے ایک ہفتے تک حاصل نہیں کریں گے تو ہم اسے چندی گڑھ ہیڈ آفیس بھیج دیں گے اور اس کے بعد آپ کو وہاں سے ہی حاصل کرنا ہوگا۔ یہ اطلاع فون پر ایک لڑکی دے رہی تھی۔ لڑکی نے میری بات ان سنی کر دی اور مجھے بھی اُس کی کوئی بات سمجھ میں نہیں آئی۔ نئی پود کی باتیں خاص کر لڑکیوں کی اور وہ بھی جب وہ انگریزی بول رہی ہوں میری سمجھ میں نہیں آتیں اس لیے بات کو کاٹنا ہی مناسب سمجھا۔ بہر حال دوسرے دن جالندھر جا کر وہاں سے

پاسپورٹ اور ویزا لے کر آیا۔

کینیڈین ہائی کمیشن نے درخواست ملنے کے بعد ویزا کو ہاتھوں ہاتھ منظور کیا تھا اور تب تک اسے اجرا کئے ہوئے پندرہ سولہ دن گزر چکے تھے۔اب ویزا کی معیاد کے دن کم ہو رہے تھے اس لئے ٹکٹوں کے انتظام کرنے میں جلدی کرنا پڑی۔ آج کل ٹکٹ انٹرنیٹ پر دستیاب ہوتے ہیں فقط جیب میں مال ہونا چاہیے اور وہ بھی کریڈیٹ کارڈ کی صورت میں۔ میرے بیٹے ڈاکٹر پنڈتا نے انٹرنیٹ پر ائر انڈیا والوں کی فلائیٹ سے ٹکٹیں book کیں اور اُس وقت میں ابھینو تھیٹر میں ایک پروگرام کے سلسلے میں گیا تھا۔اس نے میرا ٹکٹ مکھن لال پنڈتا کے نام سے Book کیا جب کہ پاسپورٹ اور ویزا میں میرا نام فقط مکھن لال درج تھا۔ہم نے ائر انڈیا سے رجوع کیا کہ کہیں ہم سے غلطی تو نہیں ہوئی ہے۔ کچھ لوگوں نے کہا کہ اس میں کوئی پریشانی کی بات نہیں ہے، مکھن لال یا مکھن لال پنڈتا ایک ہی بات ہے۔ کچھ اور لوگوں نے کہا کہ یہ ایک فاش غلطی ہے، خاص کر پاسپورٹ کے معاملے ہیں، جس پر ملک دشمن عناصر بھی نظر لگائے بیٹھے ہوتے ہیں اور زیادہ تر ان لوگوں کی سوچ پر منحصر ہے جنہیں آگے اس سے واسطہ ہے۔دل میں خیال آیا کہ سارا معاملہ چوپٹ ہو گیا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ میری اہلیہ جہاز میں بیٹھی ہو گی اور مجھے یہ کہہ کر اُتارا جائے کہ جناب یہ جہاز ہے کوئی ناؤ نہیں۔ اسی لئے میں نے سوچا کہ تصحیح کرانا بہتر رہے گا۔اس دوران میری نیند اڑ گئی۔ جوں ہی آنکھ لگتی تھی، جہاز اور ٹکٹ میرے سپنے میں آتے تھے۔ میں ایک دم جاگ کر سوچنے لگتا تھا کہ پیسے دے کر بھی ٹکٹ کا معاملہ ادھورا ہی رہ گیا۔ ہر رات ارادہ کرتا کہ صبح ہوتے ہی سب کام چھوڑ کر پہلے ٹکٹ میں تصحیح کرا دوں گا، لیکن جب صبح ہوتی تھی تو کوئی راستہ ہی نہیں سوجھتا تھا۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کس کو کہوں، کیوں کہ ٹکٹیں انٹرنیٹ پر Book کئے تھے۔ خیال آیا کہ کوئی نہ کوئی تو ایسا ہوگا۔ رقم بھی کوئی معمولی نہیں تھی۔ دو ٹکٹوں کے دوطرفہ سفر کے لئے ایک لاکھ روپے سے زیادہ رقم تھی۔ اس بھاری رقم کو یوں ہی ترک کرنا میرے بس کی بات نہیں تھی۔ بچپن میں بے پناہ غریبی دیکھی

جس سے آج بھی ذہن لرز اٹھتا ہے۔ اب رہی مجبوری سو تو وہ ایک الگ بات ہے۔ بہر حال ڈاکٹر صاحب نے (Air India Customer care) سے رابطہ کیا۔ کچھ دیر تک رنگ ٹون بجتا رہا۔ پھر ایک آواز آئی کی فلاں مسئلے کے لئے فلاں نمبر پر رابطہ کریں وغیرہ وغیرہ۔ ہم نے جب اس متعلقہ نمبر پر فون ملایا تو وہاں بھی پہلے رنگ ٹون بجا اور پھر وہی کہانی دہرائی گئی کہ فلاں مسئلے کے لئے فلاں نمبر ملائیں۔ ہم پریشان تھے اور یہ ٹون سننا طبیعت پر گراں گزر رہا تھا۔ ہماری سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ ٹون بجانے کا مطلب کیا ہے اور اس سے کس کا کام بنتا ہے۔ اس طرح ہمارا وقت ضائع ہو رہا تھا اور تذبذب میں اضافہ ہو رہا تھا۔ بہر حال یہ سلسلہ اسی طرح چلتا رہا۔ ہم ٹون سن کر نیا نمبر ڈائل کرتے رہے اور پریشانیوں میں اضافہ ہوتا رہا۔ صبح کے دس بجے سے ہم موبائل فون لے کر بیٹھے تھے، سورج غروب ہونے کے بعد ہی ہماری کوشش رنگ لائیں اور (Customer Care) سے بات ہو سکی۔ (Customer Care) پر تعینات شخص انتہائی دھیمی آواز میں بول رہا تھا یہاں تک کہ بات کو اگر دو دفعہ نہیں سنا جاتا تب تک بات کی ترسیل نہیں ہوتی۔ جیسے حد سے زیادہ نازک مزاجی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ اس نے کہا کہ پہلے مکھن لال کے نام سے ٹکٹ Book کرنا ہوگا اور اس کے بعد پہلے والا ٹکٹ منسوخ کرنا ہے۔ ایک اور ضروری بات جو اس نے بتائی وہ یہ کہ اس جہاز میں اب ایک ہی سیٹ خالی ہے۔ وہ بھی اگر Book ہو گئی تو پھر دونوں ٹکٹ منسوخ کروانے پڑیں گے۔ پھر کب اور کس جہاز میں نئے ٹکٹ ملیں گے، اس بارے میں کچھ کہنا محال ہوگا۔ مجھے لگا کہ اس معاملے میں غیر متوقع رکاوٹیں آ رہی ہیں کہیں یہ کسی اپ شگون کا اشارہ تو نہیں۔ شکر تھا کہ اس نے اس الجھن سے چھٹکارا پانے کا طریقہ بھی بتایا، اگر ہم چپ چاپ بیٹھے رہتے تو ہماری آواز بھی صدا بہ صحرا ثابت ہوتی۔ ہم نے یہ بات بھی جان لی کہ سفر سے جتنا پہلے ٹکٹ Book کیا جائے اتنا مالی فائدہ ہوتا ہے۔ ہم نے اس کے مشورے پر عمل کیا اور مکھن لال کے نام سے نیا ٹکٹ Book کیا۔ ہم دن بھر جیسے کسی پنجرے میں بند تھے اور اب اس سے رہائی نصیب ہوئی۔ دوسری مشکل جو پیش

آئی وہ یہ تھی کہ کریڈٹ کارڈ میں پیسے برابر نہیں تھے اور منسوخ ہونے والی ٹکٹ کے پیسے ائر انڈیا والوں کے پاس تھے مگر وہ اس رقم کو نئی ٹکٹ کے لئے Adjust نہیں کررہے تھے۔ اس کے لیے ٹکٹ منسوخ کر کے رقم کریڈٹ کارڈ میں واپس جمع کرنا الگ معاملہ تھا۔ گویا یہ دو علیحدہ علیحدہ مسئلے تھے۔ یہ مسئلہ ڈاکٹر صاحب نے حل کیا۔ پرانا ٹکٹ کو منسوخ کرنے کے لئے 4863/- روپے کا جرمانہ ادا کرنا پڑا۔ جو واجب بھی تھا کیونکہ غلطی ہماری تھی۔

15 مئی 2010ء کو ہم دوپہر ایک بجے گھر سے روانہ ہوئے۔ جموں ائر پورٹ سے ہماری فلائٹ تین بج کر پچاس منٹ پر دلی کے لئے روانہ ہونے والی تھی۔ اس کا کینیڈا کی پرواز کے ساتھ کوئی واسطہ نہیں تھا۔ ہم جموں ائر پورٹ پر ڈیڑھ بجے پہنچے گھر سے چھ لوگ ہمیں رخصت کرنے کے لئے ائر پورٹ تک ساتھ آئے۔ ہم نے انہیں گیٹ سے الوداع کیا اور اپنے دو بیگ ایک بارہ کلو اور دوسرا پندرہ کلو لے کر ائر پورٹ کے احاطے میں داخل ہوئے۔ سکیورٹی جانچ کے بعد ہم ہوائی اڈے کی مین بلڈنگ کی اور بڑھے۔ میری اہلیہ آہستہ آہستہ میرے پیچھے چل رہی تھی۔ میں اس سے کافی آگے نکل آیا۔ وہ ٹایپ 2 زیابیطس کی مریض ہے اور انسولین کے سہارے جی رہی ہے، اس لئے چلنے میں کافی سست ہے۔ مجھے اس کے لئے ہر دس قدم کے بعد رکنا پڑتا تھا۔ مجبور ہو کر میں نے اس سے کہا، ’ذرا تیز قدمی کے ساتھ چلو، کہیں تم بنا بنایا کام نہ بگاڑ دو۔ ابھی دیکھو گی کہ جہاز ہمارے سر کے اوپر سے نکل جائے گا اور تب ہم ائر پورٹ تکتے رہ جائیں گے۔ بس کا سفر ہوتا تو ڈرائیور کو زور سے آواز لگاتے کہ آہستہ کرو بھائی خاتون ہے۔ یا راستے چلتے لوگوں سے اس کو رُکواتے مگر اس معاملے میں اس کی بھی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ فلک شگاف آوازیں بھی پائلٹ تک نہیں پہنچیں گی۔ اب سب کچھ آسان ہی ہے مگر کینیڈا کی ٹکٹیں درست کراتے کراتے حلق سوکھ گئے تھے۔‘‘ بیگم صاحبہ غصے سے لال پیلی ہوگئی اور بولی ’’جہاز کو جانا ہوگا تو جائے۔ اب کیا خود کو مار ڈالوں۔ ابھی ہم جموں میں ہی ہیں اور تم نے بک بک شروع کردی۔ اتنی جلدی تھی تو گھر سے سویرے نکلتے۔

اس سے زیادہ تیز چلنا میرے بس کی بات نہیں ہے۔''

اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دے پاتا، میں نے دیکھا کہ وہ سب لوگ جو ہمیں چھوڑنے آئے تھے، ائر پورٹ کے صحن میں داخل ہوئے تھے اور اب ہماری طرف آرہے تھے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ یہاں پرندہ پر نہیں مار سکتا ہے، آخر تم لوگ اندر کیسے آئے۔ انہوں نے کہا کہ سیکورٹی اہلکار جان پہچان والے نکلے۔ میں نے بیگم صاحبہ کو ان کے حوالے کیا اور خود سامان لے کر ہال میں داخل ہوا۔

اندر داخل ہوتے ہی راحت محسوس ہوئی۔ ائر انڈیا کا کاونٹر ابھی بند ہی تھا لیکن وہاں ایک کشمیری خاتون موجود تھی۔ اتنے میں ہمارے باقی لوگ بھی آ گئے۔ کشمیری خاتون نے مجھ سے پوچھا کہ آپ کہاں جارہے ہیں۔ میں نے کہا، 'دہلی'۔ اس نے کہا کہ آپ اپنا سامان جمع کرا دیں میں اسے کارگو میں رکھوادوں گی۔ پہلے تو میں سمجھا ہی نہیں لیکن جلد ہی اس کی بات کا مطلب سمجھ گیا اور اندر ہی اندر کہنے لگا، 'تمہارے منہ میں گھی شکر'۔ ہمارے سامان کا وزن ہوا، ایر لیبلز پر چسپاں کی گئیں اور سامان جہاز کی ڈکی میں رکھوایا گیا۔ اب میں خود کو قدرے بہتر محسوس کر رہا تھا تاہم میرا لیپ ٹاپ میرے پاس تھا۔ اے، سی ہال میں اچھی خاصی ٹھنڈ تھی۔ ڈاکٹر صاحب کی اہلیہ، جس کو ہم گھر میں پیار سے بی بلاتے ہیں، نے جوس لا کر سب کے ہاتھ میں ایک ایک بوتل تھمادی۔ ذیابیطس کی وجہ سے میں نے اور میری اہلیہ نے نہیں پیا۔ سیکورٹی آفیسر نے ہمارے لئے بغیر چینی کی چائے منگوائی۔ اس کو جموں والے پھیکی چائے بولتے ہیں۔ کافی دیر تک گپ شپ چلتی رہی۔ سیکورٹی آفیسر نے بورڈنگ کے بارے میں معلوم کیا۔ بتایا گیا کہ جہاز سرینگر گیا ہے اور جہاز کی واپسی پر مسافروں کو بورڈنگ پاس دیئے جائیں گے۔ اس میں تقریباً آدھے گھنٹے کا وقت لگا۔ آخر کار جہاز ائر پورٹ پہنچ گیا۔ ہمیں بورڈنگ پاس دیئے گئے۔ ہم نے اپنے گھر والوں کو ایک بار پھر الوداع کہا۔ سیکورٹی جانچ سے گزرنے کے بعد ہم جہاز میں بیٹھ گئے۔

پانچ بجے کے قریب ہم دلی ائرپورٹ پہنچے۔ائرپورٹ سے چھ کلومیٹر دور ماہی پال پورہ ایکس ٹینشن 8 نیشنل ہائے وے نئی دہلی کے ہوٹل اوپیرا میں ہمارا کمرہ بک تھا۔ہمارے پاس ووچر میں درج تفصیلات کے مطابق یہ ایک ستارہ ہوٹل تھا۔مجھے بھی یہ دیکھنے کا اشتیاق تھا کہ ستارہ والے ہوٹل اور دوسرے ہوٹلوں میں کیا فرق ہوتا ہے۔سامان وصول کرتے ہوئے ائرپورٹ پر ہی چھ بج گئے۔مجھے ہوٹل جلدی پہنچنے کی فکر تھی کیوں کہ دلی کی راتیں بوڑھوں کے لئے ویسے بھی بدنام ہیں۔اس میں اب اور بھی اضافہ ہوا ہے اور اخباروں کے مطابق یہاں بیچ سڑک پر موٹر سائیکل سوار دن دہاڑے قتل کی واردات انجام دے کر غائب ہوجاتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ بڑے شہروں میں بڑے بڑے فتنے ہوتے ہیں اور نیویارک تو اور بھی بڑا شہر ہے۔اب دیکھئے میں بھی کس چیز کا موازنہ کرنے بیٹھ گیا، کرائم گراف کا۔پسینہ میں شرابور میں سامان کو گھسیٹتے ہوئے ٹیکسی سٹینڈ کی تلاش میں نکلا۔اس پر طرہ یہ کہ ہر دس بیس قدم کے بعد بیگم صاحبہ کا انتظار بھی کرنا پڑتا۔ٹیکسی سٹینڈ پہنچ کر معلوم ہوا کہ کوئی بھی ٹیکسی والا میرا سامان اُٹھانے کے لئے تیار نہیں۔میری سمجھ میں یہ نہیں آرہا تھا کہ ٹیکسی والے کو میرے سامان سے کیا پریشانی ہے۔اگر چہ سامان کو ٹیکسی کی ڈکی میں رکھا جاسکتا تھا۔ایک ایک ڈرائیور کی منت سماجت کرتا رہا شومئی قسمت کوئی بھی ڈرائیور ٹس سے مس نہ ہوا۔آخر طویل انتظار کے بعد ایک نوجوان ٹیکسی ڈرائیور ہمیں ہوٹل پہنچانے کے لئے تیار ہوا۔راستے میں اس نے اپنے سے چھوٹے ایک اور نوجوان کو ٹیکسی میں بٹھایا جو مجھے اچھا نہیں لگا۔میں نے اس کے ساتھ گفتگو کرنے کی بجائے اس کی حرکتوں پر نظر رکھنے کا فیصلہ کیا۔اس نے ہمیں ہوٹل پہنچایا۔سامان اُٹھانے میں مدد کی اور رخصت ہوگیا۔

اب تک مکمل اندھیرا چھا گیا تھا۔ہم سیدھے ایک کوچے میں ایک ہوٹل میں گھس گئے۔مجھے ہوٹل میں ایک ستارہ والی کوئی خاص بات نظر نہیں آئی۔میں کاونٹر پر گیا۔وہاں موجود شخص جو شاید منیجر تھا، کو میں نے انٹرنیٹ ہوٹل Booking کی پرچی دکھائی۔وہ فقط 'سر سر'

کہتا رہا۔ میں نے کہا، 'بھائی جان یہ سب تو ٹھیک ہے، ہمیں پہلے کمرہ دکھائیں'۔ اس نے پاس میں کھڑے ایک آدمی کو اشارہ کیا۔ اس آدمی نے ہمارا سامان اٹھایا حالانکہ میں نے اس کو کہا کہ میں خود اٹھاؤں گا کہیں بعد میں کوڑیوں کی قیمت اشرفیوں میں ادا نہ کرنا پڑے۔ استقبالیہ کاؤنٹر کے پاس ہی ہمارا کمرہ تھا۔

کمرہ 10x10 فٹ کا تھا اور غسل خانہ بھی منسلک تھا۔ کمرے میں دو آدمیوں کے لئے پلنگ، اے سی اور ایک ٹیلی ویژن موجود تھا۔ کمرے میں باہر کی روشنی نہیں کے برابر تھی، اس لئے بجلی آن کرنا پڑی۔ میز پر ایک خالی جگ بھی پڑا تھا۔ ہم نے جہاز میں چائے پی لی تھی، لہٰذا چائے کی طلب نہیں تھی۔ میں منیجر کے پاس گیا (اب وہاں کوئی دوسرا آدمی براجمان تھا)۔ میں نے کمرے میں پانی بھجوانے کے لئے کہا۔ اس نے جواباً پوچھا کہ رات کے کھانے میں کیا لیں گے؟ مجھے لگا کہ اس آدمی کو ہوٹل کا طور طریقہ معلوم ہے اس لئے یہ ضرور منیجر ہوگا۔ اس کی باتوں سے مجھے لگا کہ پانی سے پہلے کمرے میں رات کا کھانا بھیجے گا۔ میں نے کہا کہ ڈنر کا انتخاب کرنا میرے حدِ اختیار میں نہیں ہے۔ اس کے لئے مجھے اہلیہ سے پوچھنا ہوگا اور جب میں نے اہلیہ سے پوچھا تو وہ خوش ہوگئی اور کہا کہ اچھا ہے کہ ڈنر کمرے میں آئے گا، تھک بھی گئے ہیں رات کے وقت کہاں دربدر پھریں گے۔ میں نے کہا کہ اس ہوٹل پر 'اونچی دکان پھیکا پکوان' کا مقولہ صادق آتا ہے۔ یہ لوگ کمرے میں فقط چمچے رکابیاں وغیرہ پھیلائیں گے۔ کھانا زیادہ لذیذ نہیں ہوگا لیکن بل اچھا خاصا آئے گا۔ بیگم صاحبہ نے جواب میں کہا کہ ایک دن ایسا بھی، روز روز کیا ہمیں اس ہوٹل میں ٹھہرنا ہے۔ میں نے دو روٹیاں، ایک دال اور ایک پلیٹ چاول آرڈر کیا۔ میرا خیال صحیح ثابت ہوا۔ پانی ندارد اور بیرا ڈنر لے کر آ گیا۔ اس نے جب کھانا تپائی پر رکھا میں نے پوچھا، بیٹا اس ہوٹل میں پانی ملتا ہے کیا۔ اس نے کہا، جی بالکل ملتا ہے۔ میں نے کہا کہ کیا تم مجھے خدارا بتاؤ گے کہ کہاں ملتا ہے تاکہ میں خود لے آؤں۔ وہ کمرے سے باہر گیا اور پانی کا ایک جگ لے کر آ گیا۔

کھانا کھا کر ہمیں کل کی فکر ستانے لگی۔ فلائٹ صبح سات بج کر دس منٹ پر روانہ ہونے والی تھی۔ ہمیں تین گھنٹہ قبل ائرپورٹ پہنچنے کے لئے کہا گیا تھا۔ اس کے لئے ہمیں ہوٹل سے صبح چار بجے روانہ ہونا تھا۔ میں مینیجر کے پاس گیا۔ پہلا والا مینیجر نہیں تھا بلکہ ایک نیا لڑکا، جوان، پتلا چہرہ، قمیض پتلون اور ٹائی زیب تن کیے ہوئے اب کی بار کرسی پر براجمان تھا۔ میں نے پوچھا کہ آپ کی ڈیوٹی کتنی دیر میں بدلتی ہے۔ ہمارے آنے سے اب تک آپ تیسرے مینیجر صاحب ہیں۔ ہمیں اس سے کوئی لین دین نہیں کہ آپ کی ڈیوٹی پانچ پانچ منٹ بعد بھی بدل جائے مگر ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ ہمیں صبح چار بجے نکلنا ہے۔ ہم اگر ابھی کوئی بندوبست کر کے رکھیں تو بہتر ہوگا۔ کیا پتہ کل اس کرسی پر صبح کے وقت اور کوئی بیٹھا ہوگا اور کہے گا مجھے اس بات کا کوئی علم نہیں۔ اس نے کہا کہ 'سر' میں ڈرائیور کو یہاں ہی بلاتا ہوں، آپ خود ہی بات کیجئے۔ ڈرائیور 'سر سر' کہتے ہوئے کمرے کے اندر آیا۔ اس کے ساتھ بات ہوئی۔ اس نے کہا تین سو روپے لوں گا اور گاڑی صبح چار بجے باہر کھڑی ہوگی۔ ہم نے آتے وقت دو سو روپے دیئے تھے اور دن کا وقت تھا۔ یہ رات کے چار بجے جانا تھا اور میرے خیال سے تین سو روپے کا کرایہ واجب تھا۔ میں نے ڈرائیور سے کہا کہ کہیں ہم پر نیند کا غلبہ نہ ہو، تو اس نے کہا میں جگا دوں گا۔ میں نے کہا کہ پیشگی دینے میں کوئی حرج نہیں لیکن تم اگر صبح نہیں آئے تو ہم تمہارا کچھ بگاڑ نہیں سکتے۔ اس نے بھروسہ دلاتے ہوئے کہا کہ 'سر' آپ کیوں پریشان ہو رہے ہیں۔ میں چار بجے حاضر ہو جاؤں گا۔ برتنوں اور چمچوں اور کانٹوں کی آوازیں اور 'سر سر' سن کر میری سمجھ میں آیا کہ ایک سٹار ہوٹل کیا ہوتا ہے۔ ابھی میں نے رات کے ڈنر کا بل ادا نہیں کیا تھا۔ شاید اس سے تصویر اور بھی واضح ہو جاتی۔ ہم صبح تین بجے ہی نہا دھو کر تیار بیٹھے تھے۔ ٹھیک چار بجے ڈرائیور نے دروازے پر دستک دی۔ میں سامان لے کر باہر آیا۔ ڈرائیور نے سامان ٹیکسی میں ڈال دیا۔ تب تک میں نے مینیجر سے رات کے کھانے کا بل طلب کیا جو کہ اڑھائی سو روپے تھا۔ میں نے بل ادا کیا۔ بیرا ساتھ میں کھڑا تھا۔ اس کو دس روپے کا ٹپ دیا۔ ٹیکسی میں بیٹھے

اور ائر پورٹ کی طرف روانہ ہوئے۔ یہ بڑی گاڑی تھی کل کا کھٹارہ نہیں اور ڈرائیور نے بھی آرام سے ائیر پورٹ پہنچا دیا۔ اس نے سامان اتارا اور ہمیں ائر پورٹ کے اندر جانے کا دروازہ دکھایا۔

میں نے اندر جا کر اہلیہ کو ایک بینچ پر بٹھایا اور خود ائر انڈیا کا کاونٹر دیکھنے گیا۔ ایک کاونٹر پر دس بیس سکھ مسافر موجود تھے اور میں نے اندازہ لگایا کہ ہو نہ ہو یہی کینیڈا کا کاونٹر ہوگا۔ میں نے اہلیہ سے پوچھا، ''ویل چیئر پر بیٹھوگی۔'' اس نے حامی بھر لی اور کہا کہ میں زیادہ تیز نہیں چل سکتی اور تم بھی نہ جانے کیا کیا بولتے رہتے ہو۔ ویل چیئر پر بیٹھنا ہی ٹھیک رہے گا۔ میں نے کہا کہ تم پہلے کبھی اس پر نہیں بیٹھی ہو، کہیں شرم تو محسوس نہیں ہوگی۔ اسی اثنا میں ائر پورٹ کا ایک ملازم کاونٹر پر آیا۔ میں نے ویل چیئر کا تقاضا کیا تو اس نے کہا، کیا آپ نے اس کی بکنگ کی ہے؟ میں نے نفی میں جواب دیتے ہوئے کہا کہ ائر انڈیا کے متعلقین نے ہم سے کہا تھا کہ یہ ائر پورٹ پر ہی مانگنے سے ملتی ہے۔ اس نے مجھے گھورتے ہوئے کہا'' How can that be'' (ایسا کیسے ہوسکتا ہے) یہ جملہ سن کر مجھے غصہ آیا اور میں نے بھی کہا'' ویل چیئر دینی ہے تو دو، نہیں تو بلا مارو اس کو۔ روز ہم تھوڑے ہی ویل چیر پر پھرتے ہیں۔'' غصہ کرنے کی بجائے اس نے نرمی سے ایک جوان لڑکے کی طرف جو نک ٹائی باندھے مسافروں کی لائنوں کے ارد گرد چکر لگا رہا تھا، اشارہ کرتے ہوئے کہا،'اس آدمی سے پوچھئے۔' مجھے لگا کہ مسافروں کے مسائل سننا اور ان کا ازالہ کرنا اسی کا کام ہوگا۔ میں نے ویل چیئر مانگی تو اس نے کہا کہ ابھی تک متعلقہ ملازمین نہیں آئے ہیں۔ آئیں گے تو میں کوشش کروں گا۔

اب تک پو پھٹنے لگی تھی۔ مسافروں کی آمد جاری تھی اور ہال بھرنے لگا تھا۔ یہ ایک بڑا ہال ہے جس کے ایک طرف کاونٹر اور دوسری طرف چیکنگ کے بعد دوسرے ہال میں جانے کا راستہ۔ مجھے لگا کہ کاونٹر اور چیکنگ کا عملہ اپنی جگہوں پر ایسے بیٹھے تھے جیسے وہ بارش میں کھڑے تھے اور جب ان کو اندر آنے کو کہا گیا تو جس کو جہاں جگہ ملی وہ وہاں پر بیٹھ گیا۔ روشنی جتنی بڑھتی

گئی اتنی بھیڑ بھی بڑھتی گئی لہٰذا میں بھی قطار میں کھڑا ہو گیا اور آدھے گھنٹے بعد میری باری آئی۔ میں نے ٹکٹ اور پاسپورٹ دکھا کر سامان کے دو بیگ آگے کئے۔ ایکسرے اور وزن کر کے اسے بیلٹ پر لاد کر اندر بھیج دیا گیا۔ اس طرح اس بوجھ سے میری جان کینیڈا تک چھوٹی۔ سامان زیادہ بھاری نہیں تھا، تقریباً بارہ اور پندرہ کلو، مگر ان میں تقریباً پندرہ ہزار روپے مالیت یعنی ہم دونوں کی چھ ماہ کے لئے دوائیاں تھیں۔ مجھے یہ فکر ستا رہی تھی کہ کہیں یہ لوگ مجھ سے سوال نہ کریں کہ اتنی ادویات تم کہاں لے جا رہے ہو، تم کوئی کاروبار تو نہیں کر رہے ہو۔ ڈاکٹری نسخے ہمارے ساتھ تھے۔ اس کے علاوہ وو کھارڈ ہسپتال بنگلور (سنا ہے کہ اب اس شہر کو بنگلورو کہتے ہیں) جہاں میں نے سٹنٹ ڈلوایا تھا، کے نسخے وغیرہ بھی میرے ساتھ تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ مجھے کینیڈا کے کسٹم ادارے کا اتنا ڈر نہیں تھا جتنا کہ اپنے ملک کے کسٹم ادارے کا تھا۔ یہاں بے کار میں تنگ کیا جاتا ہے۔ بورڈنگ پاس حاصل کرنے کے بعد اب قدرے اطمینان آ گیا تھا۔ اب ہم تھے اور ایک ایک ہینڈ بیگ۔ کاونٹر سے فارغ ہونے کے بعد میرے پاس ادھیڑ عمر کا ایک آدمی آیا اور پوچھا کہ کیا آپ کو ویل چیئر چاہئے۔ میں دل ہی دل میں سوچنے لگا کہ اس کو کیسے پتہ چلا کہ ہمیں ویل چیئر چاہیئے، اس نے مجھے متوجہ ہو کر پوچھا کہ ''چاہیئے کہ نہیں؟'' میں اگر لعل ولیت سے کام لیتا تو وہ کسی اور کے پاس چلا جاتا اور ہمیں وہیل چیئر سے ہاتھ دھونا پڑتا۔ بہر حال میں نے عجلت میں حامی بھری۔ وہ ویل چیئر لینے گیا۔ ہال میں ویل چیئر اچھی تعداد میں موجود تھیں مگر اب چھینا جھپٹی شروع ہو گئی تھی۔ وہ ویل چیئر لے کر آیا، میری اہلیہ اس میں بیٹھ گئی۔ وہ میری اہلیہ کو لے کر آگے بڑھا اور میں پیچھے پیچھے اپنے ہاتھ میں بورڈنگ پاس اور پاسپورٹ تھامے چلنے لگا۔ حیرت وانبساط کا یہ معاملہ تھا کہ جہاں بورڈنگ پاس دکھانا تھا وہاں پاسپورٹ دکھاتا۔ ویل چیئر والا رہنمائی کر کے بولتا کہ 'بابو جی، یہ نہیں وہ دکھاؤ'۔ اس کی مدد سے کام آسان ہوتا گیا۔ اہلیہ بھی زندگی میں پہلی بار اس قسم کے اڑن کھٹولے میں بیٹھی تھی۔ اپنے ساتھ ساتھ دیگر کئی مسافروں کو ان ہی اڑن کھٹولوں میں بیٹھے مکڑیوں کی

مانند آگے چلتے دیکھا تو اس کا من شانت رہا۔ کچھ دیر انتظار کرنا پڑا کیونکہ جہاز کی جانب جانے والے دو دروازے ابھی تک نہیں کھلے تھے۔ اس دوران ویل چیئر چلانے والا شخص اچانک غائب ہو گیا۔ ادھر دروازے کھلے اور اعلان ہوا کہ پہلے ویل چیئر والے جائیں گے۔ میں نے ویل چیئر کو خود دھکا لگانا شروع کیا کہ وہ شخص آٹپکا اور کہا کہ یہ ویل چیئر کا آخری پڑاؤ ہے۔ مجھے چند لمحوں بعد اس کی بات کا مطلب سمجھ میں آیا۔ میں نے جیب سے تیس روپے نکال کر اس کے ہاتھ میں تھمادئے اور وہ بہت خوش ہو گیا اور دونوں ایک وسیع راہداری کی جانب بڑھے جو جہاز کی طرف جاتی تھی۔ مجھے یہ پریشانی ستاتی رہی کہ کہیں میری اہلیہ کو کوئی دقت پیش نہ آئے کیوں کہ ویل چیر والے کو وہاں سے واپس مڑنا تھا۔ آگے جا کر میری اہلیہ کو سیکورٹی اہلکاروں نے روکا اور پاسپورٹ دکھانے کے لئے کہا۔ اس نے جواب میں کہا کہ وہ میرے شوہر کے پاس ہے۔ اسی بہانے ایک آدمی میرے پاس آیا اور پوچھا، ''کیا آپ کا نام مکھن لال پنڈتا ہے۔'' مجھے معلوم نہیں تھا کہ ماجرا کیا ہے۔ اپنی جگہ سوچنے لگا کہ کاغذات میں میری ذات درج ہے ہی نہیں تو ان لوگوں کو کیسے الہام ہوا۔ میں نے پوچھا کیا بات ہے؟ ''آپ کو ڈھونڈ رہے ہیں'' وہ بولا۔ میں نے سوچا نہ جانے کون سا مسئلہ پھر پیش آیا ہے۔ میں اس کے ساتھ چل دیا۔ آگے جا کر دیکھا تو بیگم صاحبہ سیکورٹی اہلکاروں کے پاس ایک کونے میں کھڑی تھی۔ وہ گھبرائی ہوئی تھی۔ میں نے پوچھا کہ ماجرا کیا ہے۔ اس نے کہا کہ پاسپورٹ اپنے پاس رکھا اور یہ لوگ سوچتے ہوں گے میں پاسپورٹ کے بغیر سفر کر رہی ہوں۔ میں نے مذاق میں کہا کہ برابر ایسا ہی سوچیں گے۔ مگر ان کو معلوم ہو گا تم کینیڈا کے سفر پر نکلی ہو، اپنے آپ کو کوئی معمولی عورت نہ سمجھو۔ البتہ تھوڑی پڑھی لکھی ہوتی تو یہ لوگ بھی سمجھ جاتے اور تم سے پاسپورٹ کا تقاضا نہ کرتے۔ میری باتیں سن کر وہ غصے سے لال پیلی ہو گئی۔ پولیس افسر نے ہمیں بحث و تکرار کرتے دیکھا اور کہا، 'کوئی بات نہیں۔ صرف پاسپورٹ دیکھنا ہے۔' ہم نے پاسپورٹ دکھایا اور اس نے جانے کو کہا۔

ہم جیسے ہی بلڈنگ سے باہر آئے، وہاں سے سیڑھی جہاز کے ساتھ لگی تھی۔ ہم ایک راہداری سے گزر کر جہاز میں داخل ہوئے۔ میں نے سامنے ہی دو بڑے کیبن دیکھے، جن کے بیچوں بیچ دونوں اطراف سیٹیں لگی تھیں اور سیٹوں کے درمیان چلنے کی جگہ۔ جہاز کے اندر آتے ہی سامنے بزنس کلاس، اس کے بعد ایگزیکیٹیو کلاس اور اس کے بعد اکانومی کلاس تھا، جس میں ہماری سیٹیں بُک تھی۔ دوسرے اور ہمارے کیبن کے درمیان کچن تھا جس میں ائرہوسٹس دو دو منٹ کے بعد داخل ہو کر پردہ پھیلاتی تھیں۔ انہیں پردہ پھیلانے کی جیسے بیماری لگی تھی۔ میں نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا تو نظر آیا کہ اس طرف کے جہاز کا بازو زمین کے ایک عریض رقبے تک پھیلا ہے۔ دل میں خیال آیا کہ کیا اتنی بڑی بلا بھی زمین سے اٹھ کر سمندر کے اوپر سے اڑان بھرتی ہے اور خیر سے منزل مقصود پر پہنچتی ہے۔ اس جہاز کا نام بوئینگ 777 ہے۔ اس سے قبل میں پانچ چھ بار بوئینگ 737 اور 747 میں سفر کر چکا ہوں۔ لیکن صرف جموں اور دلی یا جموں اور بنگلور کے درمیان۔ یعنی ان جہازوں نے سمندر کے اوپر سے پرواز نہیں کی تھی۔ 777 اُن جہازوں سے بہت بڑا اور شاندار ہے۔ اس کی کچھ خصوصیات یوں ہیں:۔

1:......سیٹوں کی تعداد 440　　2......لمبائی 209 فٹ

3:......بازوؤں کی وسعت 200 فٹ　　4:......فیوزلیج 20 فٹ

(فیوزلیج جہاز کا وہ حصہ ہوتا ہے جس میں جہاز کا عملہ، مسافر اور سامان ہوتا ہے)

جہاز کے کیبن مجھے کافی پسند آئے۔ خاص کر سامنے والا، جو بہت اچھا اور شاندار تھا۔ ہمارے کیبن میں ہم تین نشستوں والی سیٹ پر بیٹھے تھے۔ کھڑکی کی جانب ایک سردار جی بیٹھا تھا جو آٹوا کینیڈا کا رہنے والا تھا۔ ان کا نام ڈاکٹر ہرپال سنگھ تھا۔ سینئر سائینسدان کی حیثیت سے ریٹائیر ہو گئے تھے۔ کافی دلچسپ شخص تھے۔ بے تکلف اور اونچی آواز سے باتیں کرتے تھے۔ میرے دل نے کہا کہ یہ ہے اصلی سردار اور بے غم آدمی۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ آپ کہاں جا رہے ہیں اور کہاں سے آئے ہیں؟ میں نے جواب دیا کہ ہم جموں سے آئے

ہیں اور ٹورنٹو جانا ہے۔

''ٹورسٹ ہو؟'' اس نے پوچھا۔

''جی ایسا ہی کچھ سمجھیں۔''

''میں کچھ سمجھا نہیں، ہاہاہا!''

''کیا نہیں سمجھے؟'' میں نے پوچھا۔

''کب تک رہنا ہے؟''

''کل ملا کر تقریباً چھ مہینے۔''

''چھ مہینے ٹورنٹو میں ہی گزاریں گے؟''

''ہاں جی۔ کیوں کوئی مسئلہ ہے؟''

''پھر امریکہ بھی گھوم کے آنا تھا، ہاہاہاہا''

''ٹورنٹو میں بیٹا رہتا ہے۔ اس نے آنے کی ضد کی، ورنہ کہاں ہم اور کہاں ٹورنٹو۔ بڑھاپے میں انسان اپنے گھر میں ہی رہنے کو ترجیح دیتا ہے''۔ میں نے پوری تفصیل بتا دی۔ وہ میری بات دھیان سے سنتے رہے۔

''جواباً انہوں نے کہا۔ ''میں بوڑھا نہیں ہوں کیا؟ ہاہاہا''

''کہتے ہیں کہ یہاں کے لوگ بوڑھے نہیں ہوتے ہیں۔ یہ بیماری بھی ہم لوگوں کے حصّے میں آتی ہے، ہاہاہا۔' میں نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔

''میں دو یا تین سال میں ایک بار پنجاب آتا ہوں۔''

''وہاں کون ہے آپ کا؟'' میں نے برجستہ کہا۔

''سبھی رشتے دار۔''

''وہاں ہی کیوں نہیں رہتے؟''

''میرے بچے آٹوا کینیڈا میں رہتے ہیں''۔ اُس نے کہا۔ ''وہ ادھر ہی جنمے۔ ادھر ہی

پلے بڑھے اور ادھر ہی شادی بھی ہوئی۔''

''اپنی برادری میں یا پھر؟''

''اپنی برادری میں۔''

''اوٹاوا کتنا دور ہے ٹورنٹو سے۔''

''اوٹاوا نہیں۔ آٹوا۔ کینڈا کا دار الخلافہ، ہاہاہا''۔

''پنجاب کس کام سے آئے تھے؟''

''پرکھوں کی کچھ زمین ہے، اسی کے لئے۔''

اس کے بعد وہ خاموش ہوگئے۔ مجھے لگا کہ زمین کا مسئلہ ابھی حل نہیں ہوا ہے۔
برجستہ میں نے کہا۔

''پنجاب آتے جاتے وقت کسی خوف یا پریشانی کا سامنا تو نہیں رہتا ہے؟''

''کیوں؟'' اس نے پوچھا۔

اسی اثنا میں جہاز کا انجن چالو ہوگیا۔ کیبن میں قمقمے جل اٹھے اور پورا جہاز روشنی سے بھر گیا۔ جہاز اڑان بھرنے کی تیاری کر رہا تھا۔ جہاز میں بیشتر خواتین اور بچے تھے۔ عورتیں بچوں کو بسکٹ کھلا رہی تھیں اور اپنے پاس پکڑ کر رکھنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ جہاز بڑی دیر تک چالو حالت میں رہا، جب تک کہ مائیک پر اعلان ہوا کہ 'جہاز اڑان بھرنے کے لئے تیار ہے۔ آپ اپنے بیلٹ کس لیں'۔ اسی دوران ایک ائر ہوسٹس کاک پٹ کے پیچھے سے سامنے آئی۔ وہ اپنے ہاتھ میں ایک چھوٹی سی پائپ لئے سمجھا رہی تھی کہ دم گھٹنے کی صورت میں آکسیجن پائپ کس طرح استعمال کی جاسکتی ہے اور اگر ایمرجنسی کا موقع آگیا، تو دروازوں پر اکزٹ (EXIT) لکھا ہوا ہے تو کس طرح آپ اس صورت میں باہر نکل سکتے ہیں۔ اگر جہاز کو پانی پر اترنا پڑا تو آپ سیٹ کے نیچے پڑے سیفٹی جیکٹ کا کس طرح استعمال کر سکتے ہیں، وغیرہ وغیرہ۔ میں نے جہاز میں سفر کے دوران پہلے بھی یہ باتیں سنی تھیں، لیکن آج یہ باتیں پُر اثر لگ رہی تھیں اور

میں نے سنجیدگی کے ساتھ ان باتوں پر دھیان دیا۔ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ مشین آخر مشین ہی ہے۔ کبھی بھی بے قابو ہو سکتی ہے اور ہمیں ایمرجنسی سے نپٹنے کے لئے بھی تیار رہنا چاہئے۔ اچانک سردار جی کے منہ سے نکلا ''پھٹے منہ''! جو بات میرے ذہن میں گردش کر رہی تھی، اس بات کی اس سے تائید ہوئی۔

کچھ دیر میں سمجھ نہیں پایا کہ میں سردار جی کو کیا جواب دوں۔ میں اندر ہی اندر خوف زدہ تھا۔ سمندر کا خیال میرے ذہن پر چھایا تھا مگر اب اس جانب میری توجہ کچھ زیادہ ہی مبذول ہوئی۔ ''اب تک قحط سالی، سردی اور زمینی بلاؤں سے بچ نکلا، آج کہیں سمندر نہ پکڑ لے'' میں سوچتا رہا۔ بیگم صاحبہ کو اس بات کی بھنک تک نہ لگنے دی۔ اُس کے ہر سوال کا جواب دے رہا تھا۔ میری ایک ہی خواہش تھی کہ اگر کوئی بلا آ بھی جائے تو زمین پر آئے نہ کہ سمندر میں۔

''سمندر نظر آتا ہے کیا؟'' میں نے سردار جی سے پوچھا۔

''کہاں نظر آئے گا، ہاہاہا''۔ اس نے کہا۔ ''جہاز 35 ہزار فٹ کی اونچائی پر اڑتا ہے۔ سارا سمندر بادلوں کی اوٹ میں آتا ہے۔ کہاں نظر آئے گا''۔

بچے ایک دوسرے کے ساتھ مستی اور شرارت کرنے میں مشغول تھے۔ ان کے والدین انہیں سیٹ بیلٹ سے باندھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ انہیں نہ مسافروں سے کوئی مطلب تھا نہ سمندر سے اور نہ جہاز سے۔ وہ اپنی خوشی اور سفر کا بھرپور لطف لے رہے تھے۔ جہاز میں ایک ہٹا کٹا لمبے قد کا آدمی بھی تھا، وہ کرتہ پاجامہ زیب تن کیا ہوئے تھا اور ماتھے پر ٹیکہ۔ کچھ لوگ گاہے گاہے اس کے پاس آ کر بات چیت کرتے اور اس کا آشرواد لیتے تھے۔ اگرچہ اس نے کوئی خاص لباس نہیں پہنا تھا، تاہم مجھے لگا کہ یہ کوئی خدا دوست آدمی ہوگا۔

اب تک ہم نے کافی نوش کی تھی۔ کشمیری کو صرف چاول کی خوراک راس آتی ہے۔ دوپہر کے کھانے کا وقت ہو چکا تھا اور بھوک بھی محسوس ہو رہی تھی۔ ہم نے Caspian Sea پیچھے چھوڑ دیا تھا اور اب جہاز جارجیا کے پہاڑوں کے اوپر سے پرواز کر رہا تھا۔ جہاز کے کاری ڈور

میں ایک ٹرالی آئی جس میں بوتلیں رکھی تھیں۔ مجھے لگا کہ بوتلوں میں پانی اور شربت ہوگی۔ اس سے قبل کہ ائر ہوسٹس کچھ کہتی، سردار جی نے وسکی مانگی۔ اس کو تین پیک دیئے گئے اور وہ مطمئن ہوگیا۔ میں سوچ رہا تھا کہ کیا مانگوں۔ میں نے ائر ہوسٹس سے پوچھا کہ اس کے علاوہ کیا ہے۔ اس نے کہا بیئر اور وائین۔ مجھے الکوہل راس نہیں آتی اور پیٹ خراب ہو جاتا ہے مگر دائیں جانب بیٹھے سردار صاحب کو ایک ایک گھونٹ حلق سے اتارتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ ان کو دیکھ کر میرا بھی جی للچایا اور میں نے بھی وائین کا آرڈر دیا۔ کہتے ہیں کہ یہ جگر کے لئے کافی مفید ہے۔ کچھ دیر بعد سردار صاحب کھڑے ہوگئے اور ان کو جگہ دینے کے لئے ہمیں اٹھنا پڑا۔ وہ واپس آئے تو ہمیں پھر سے اٹھنا پڑا۔ وہ اپنی سیٹ پر بیٹھتے ہی سوم رس کا لطف لینے لگے۔ چند گھونٹ پینے کے بعد میرے ساتھ گپ شپ شروع کر دی۔ میں بھی وقت گزارنا چاہتا تھا اور اس کے لئے سردار جی سے بہتر ساتھی اور کون ہوسکتا تھا۔ وہ پڑھا لکھا تھا اور کینیڈا کا شہری بھی اور اس توسل سے اس کی جان پہچان آگے چل کر مددگار ثابت ہوسکتی تھی۔

'ہندوستان میں ابھی بھی کافی غریبی ہے۔' سردار جی نے کہا۔ 'مگر کینیڈا میں لگتا ہے کہ یہ کوئی مسئلہ ہے ہی نہیں۔ ہر ایک چیز اپنے ہی قرینے سے چل رہی ہے۔ میں چالیس سال قبل ہندوستان سے نکلا ہوں۔ ہم کینیڈا کے شہری ہیں۔ بچوں کی شادی کی ہے اور وہ اپنا کاروبار کر رہے ہیں۔''

''آج کس کام سے آئے تھے؟'' میں نے دوبارہ پوچھا۔

''پشتینی زمین ہے۔ وہی بیچنے کے لئے۔''

'مطلب یہ کہ آپ نے خود کو مکمل طور آزاد کر لیا۔' میں نے کہا۔ 'ہندوستان ایک بہت بڑا ملک ہے۔ لوگ محنت کش ہیں، لیکن آبادی کا کیا کریں۔ آبادی اب حد سے زیادہ بڑھ گئی ہے اور جب ایسا ہوتا ہے تو سب کام بگڑ جاتے ہیں۔ قدریں بدل جاتی ہیں اور ایسے میں خود کو محفوظ رکھنا ایک مسئلہ بن جاتا ہے۔ اس سال دلی میں کہیں کہیں پانی کے مسئلے پر نوک جھونک

ہوئی۔ یہ مسئلہ طول پکڑ رہا ہے اور کسی دن خوفناک صورت اختیار نہ کرے۔'

اسے ان باتوں میں کوئی دلچسپی نہیں تھی اور اپنے خیالوں میں ڈوبا تھا۔ کچھ لمحوں بعد اس نے جیب سے بیئر کی ایک بوتل نکالی اور مجھے پینے کی پیشکش کی۔ میں نے منع کیا تو کہا کہ آدھا آدھا پی لیں گے۔ میں نے کہا کہ مجھے راس نہیں آتی ہے۔

'کسی روز پرہیز توڑنا بھی چاہیئے، ہاہاہا!۔اس سے انسان فٹ بھی رہتا ہے اور فضول خیالات بھی نہیں آتے ہیں۔'

میں نے آدھی بیئر پی لی۔اس کے بعد کھانا آیا اور اس نے نان ویج کھانا مانگا۔ہم نے ویجیٹیرین کھانا مانگا۔ کھانا کھانے کے بعد ہم پھر بات چیت میں مشغول ہو گئے۔ سردار جی نے کہا کہ کینیڈا شاندار جگہ ہے۔ ''آپ کشمیر کو بھول جائیں گے اور چھ مہینے کے بعد واپس جانے کا من ہی نہیں کرے گا'۔ وہ کبھی کبھی قہقہے بھی لگا رہا تھا۔ مجھے معدے میں درد محسوس ہونے لگا اور درد کی وجہ سے باتوں میں کوئی دلچسپی نہیں رہی۔ جہاز لندن کے ہیتھرو ائر پورٹ پر اترا۔ سارے مسافر جہاز سے باہر گئے۔ میں نے بیگم سے کہا کہ ہمیں بھی لندن ائر پورٹ کا نظارہ دیکھنا چاہیئے، کیا پتہ دوبارہ یہاں سے گزر ہو گا کہ نہیں اور چلنے پھرنے سے شاید میرے معدے کا درد بھی ٹھیک ہو جائے۔ جہاز کے ساتھ سیڑھی لگی تھی اور ہم ایک راہداری سے گزر کر ایک عظیم عمارت میں داخل ہوئے۔ ہم وہاں ایک بینچ پر بیٹھ گئے، لیکن عمارت سے باہر نہ جا سکے۔ کچھ دیر بعد مجھے خیال آیا کہ ہمیں باہر کی روشنی دیکھنی بھی نصیب نہ ہوئی، لندن دیکھنے کی آرزو باقی رہی۔ پھر جہاز میں آکر اپنی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ لیکن سردار جی کا انتظار کیا مگر وہ نہیں آئے۔ خدا جانتا ہے کہ وہ لندن میں ہی رہ گئے یا پھر انہوں نے اپنا پروگرام بدل دیا۔ جہاز کے عملے نے بھی کوئی باز پرس نہیں کی۔ میں خوشی منا رہا تھا کہ ہم وقت پر واپس آگئے۔ پانچ منٹ کی دیر ہو جاتی تو شاید ہم بھی رہ جاتے۔ بعد میں پتہ چلا کہ سردار جی نے اپنا پروگرام تبدیل کیا ہے۔ ایسا قطعاً نہیں ہو سکتا کہ اس کے بارے میں باز پُرس نہ ہوتی۔

جہاز کی کھڑکیاں ائر ہوسٹس نے پکے طور بند کیں اور وہ پولیس والوں کی طرح کھڑکیوں کی نگرانی کر رہی تھیں۔ میں اب کھڑکی کی جانب سردار جی کی سیٹ پر بیٹھا تھا۔ میں اب بھی بے چینی محسوس کر رہا تھا جیسے کسی قید خانے میں ڈالا گیا ہوں۔ جب ہم بحرِ اوقیانوس کے اوپر اڑان بھر رہے تھے تو میں نے ائر ہوسٹس کی نظریں بچا کر کھڑکی کا شیشہ اوپر کی جانب کر لیا۔ نیچے کی طرف دیکھا تو دور دور تک بادل پھیلے تھے۔ سمندر کا کوئی نام ونشان ہی نہیں تھا۔ صرف اس سمت میں جہاز کی ونگ جو دور تک پھیلی ہوئی تھی دھوپ میں چمکتی دکھائی دے رہی تھی۔ جہاز میں کچھ مسافر ایف ایم ریڈیو سن رہے تھے، کچھ محوِ خواب تھے اور کچھ بچوں کے ساتھ کھیل رہے تھے۔

میں نے شام کا کھانا نہیں کھایا۔ کچھ دیر سویا رہا۔ جہاز کے اندر ائر ہوسٹز کے تیور بدل گئے تھے۔ ان کے مزاج میں روکھاپن لگ رہا تھا۔ یہاں تک کہ وہ صرف پانی پلانے تک ہی محدود رہیں۔

اس دوران زمین نے کروٹ بدل لی تھی۔ کینیڈا نے رات کی تاریکی کو الوداع کہہ دیا تھا۔ جبکہ ہمارے ملک میں یہ رات کا وقت تھا۔ ہم صبح سات بجے دلی سے روانہ ہوئے تھے اور رات کب ہوئی، اس کا ہمیں کوئی احساس ہی نہیں ہوا۔ اس دائرے سے باہر نکلتے ہی ہمیں احساس ہوا کہ کینیڈا میں دن کا وقت ہے۔ اگر دیکھا جائے تو ایک روشنی سے نکل کر ہم دوسری روشنی میں داخل ہوئے، یعنی ہمارے لئے دن طویل تر ہو گیا تھا۔ مجھے ابھی بھی یہ جاننے کی خواہش تھی۔ آیا سمندر پار ہوا یا نہیں۔ میں نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا تو دور زمین نظر آئی، جس میں کہیں کہیں اوپر سے کچھ آبی ذخائر نظر آ رہے تھے جو دوپہر کی دھوپ میں چمک رہے تھے۔ فی الحال کہیں کوئی بستی نظر نہیں آ رہی تھی، تاہم آدھے گھنٹے کے مزید سفر کے بعد سڑکیں نظر آنے لگیں اور دھیان دینے پر بستیاں بھی دکھائی دیں۔ میں ایک دم سمجھ گیا کہ یہ کینیڈا کی سرزمین ہے کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ اس کے شمال میں آبی ذخائر ہیں اور آبادی بھی بہت کم

ہے۔ یہ نظارہ دیکھ کر مجھے خوشی محسوس ہوئی۔ اس کے تقریباً دو گھنٹے بعد ہمارا جہاز ٹورنٹو کے پیئرسن ائرپورٹ پر اترا۔

جہاز سے باہر آتے ہی خیال آیا کہ اپنے ملک سے باہر کسی دوسرے ملک کی سرزمین پر قدم رکھنے کا موقعہ مل رہا ہے۔ پہلی بار یہ محسوس ہو رہا تھا کہ گھر سے لے کر کینیڈا تک کا سفر کن مراحل و مسائل سے طے ہوا تو حیرت وانبساط کے ملے جلے تاثرات میرے چہرے پر صاف دکھائی دے رہے تھے۔ زندگی میں کبھی نہیں سوچا تھا کہ کینیڈا دیکھنے کا موقعہ بھی میسر ہوگا۔ لیکن خواب کو حقیقت میں دیکھ کر کچھ اطمینان سا ہوگیا۔ اب میں کینیڈا کی سرزمین پر کھڑا تھا۔ اسے دیکھ بھی سکتا تھا اور اپنے قدموں تلے محسوس بھی کر رہا تھا۔ اوپر آسمان پر نظر پڑی، سورج اپنی پوری آب وتاب کے ساتھ چمک رہا تھا، لیکن ہوا میں ذرا بھی تپش نہیں تھی۔ یہ مئی کا دوسرا ہی روپ تھا، جموں کے مئی سے قدرے مختلف، جسے میں نے بچپن اور جوانی میں دیکھا تھا۔ جہاز اپنے بازو پھیلائے زمین کے بڑے رقبے کو اپنی باہوں میں لئے کھڑا لمبی مسافت طے کر کے جیسے اپنی تھکان دور کر رہا تھا۔ میں نے جہاز کو آخری بار دیکھا اور ائرپورٹ عمارت کی جانب قدم بڑھائے۔ ہم پیئرسن (PEARSON) انٹرنیشنل ائرپورٹ پر پہنچ گئے تھے۔ تین بج چکے تھے۔ میرا خیال تھا کہ گھنٹے بھر میں سامان وغیرہ لے کر پانچ بجے تک ہم گھر پہنچ جائیں گے۔ لیکن Exit تک پہنچنے میں بہت وقت لگا۔ ائرپورٹ کافی وسیع وعریض ہے اور جہاز سے باہر آنے کے بعد Exit تک کی مسافت قریباً ایک کلومیٹر تھی۔ میں نے ایک سفید فام جوان سے ویل چیئر کا تقاضا کیا تو اس نے کہا کہ انتظار کرنا پڑے گا۔ ’ابھی جمائیکا کی ایک پرواز کا بیک لاگ (BACK LOG) ہے جس کو کلئیر کرنے کے بعد ائرانڈیا کے مسافروں کی باری آئے گی‘۔ یہ جوان موٹا، صحت مند، لال رخسار، سنہری بال اور وردی زیب تن کئے اپنے فرائض انجام دینے میں مصروف تھا۔ میں نے کہا کہ انتظار کرنے کی تو ہمیں عادت ہے۔ ہم طویل راہداری کی ایک طرف انتظار کرنے لگے اور ہمارے ساتھ چند ایک اور مسافر بھی تھے جنہیں ویل چیئر

کی ضرورت تھی۔اس دوران دیکھا کہ اس راہداری میں بغیر چھت کی چھوٹی چھوٹی گاڑیاں ایک طرف سے دوسری طرف جارہی ہیں۔ڈرائیور کی سیٹ چھوڑ کر ان گاڑیوں کے پچھلے حصے کو دو لمبی سیٹوں میں بانٹا گیا ہے جن پر سواریاں دو قطاروں میں ایک دوسرے کی طرف پشت کر کے بیٹھتی ہیں۔ٹیمپو کی طرز پر بڑی دو تین گاڑیاں بھی نظر سے گزریں۔میں یہ دیکھ کر خوش ہوا کہ یہاں بلڈنگ کے اندر بھی گاڑیاں چلتی ہیں۔کچھ عرصے کے بعد وہ جوان ایک چھوٹی کار لے کر آیا جس میں ہمارے علاوہ کچھ اور مسافر بھی بیٹھ گئے۔اور وہ ایک ڈالان کو پار کرتے ہوئے Exit کی جانب بڑھا۔مجھے یہ دیکھ کر حیرانی ہوئی کہ یا تو افریقی سیاہ فام ان گاڑیوں کے انتظار میں تھے یا ہم ہندوستانی۔شاید اُس وقت یہی دو جہاز وہاں پہنچے تھے۔بہر حال ڈالان کے بیرونی حصے میں ساتھ ساتھ ایک بیلٹ بھی گھوم رہا تھا، جس پر کچھ مسافر کھڑے ہو کر ہمارے شانہ بشانہ Exit کی جانب جارہے تھے۔ہمیں ایک دو جگہ رکنا پڑا اور منزل پر پہنچ کر جوان نے Have a Nice Day کہا۔یہاں سے ہم لفٹ کے ذریعے دو منزل نیچے اترے۔ یہاں Conveyer Belt پر ہمارا سامان آنے والا تھا۔

سامان آنے میں ذرا دیر لگی۔میرے دماغ میں خیال آیا کہ یہ ائر انڈیا عملے کے ماتحت ہوگا اور ممکن ہے کہ وہ ہمارے ہی بھائی بندھے ہوں گے، لہٰذا برداشت کرنا پڑے گا۔ہمارے دو بیگ تھے۔ایک کنوئیر بیلٹ پر آگیا اور دوسرے کا اتہ پتہ ہی نہیں تھا۔سامان آنے کا عمل دھیرے دھیرے ختم ہونے لگا لیکن ہمارا دوسرا بیگ نہیں آیا۔میں نے کہا گئے کام سے۔کہیں ان لوگوں نے ہمارا دوسرا بیگ جہاز میں ہی تو نہیں چھوڑا اور اگر ایسا ہوا ہو تو معاملہ بگڑ جائے گا اور خاص کر ہمارے عملے سے یہ جلد حل ہونے والا نہیں۔آس پاس کوئی نہیں تھا جس کو میں اس بارے میں پوچھتا۔آخر کار ایک شخص وہاں سے گزرا۔میرے پوچھنے پر اس نے ایک کونے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ وہاں دیکھو۔بہت سارا سامان وہاں پڑا ہے، جس کو ان لوگوں نے کنوئیر بیلٹ پر نہیں چڑھایا تھا۔میں اس طرف دوڑا اور وہاں پڑا اپنا

دوسرا بیگ اٹھایا۔ میں نے اوپر والے کا شکر ادا کیا کہ کینیڈا داخل ہوتے ہی زیادہ دقت پیش نہیں آئی۔

اب امیگریشن عملے کو ویزا اور پاسپورٹ وغیرہ دکھانا تھا۔ وہ اگر سامان کھولنے کے لئے کہتے تو میں اس کے لئے بھی تیار تھا۔ ادویات کے بارے میں جواب دینے کے لئے میں نے ڈاکٹری نسخے ساتھ رکھے تھے۔ جہاز میں ہمیں ایک فارم بھرنے کے لئے کہا گیا تھا جس میں ایک دو باتوں کی تفصیل دینے پر زیادہ زور دیا گیا تھا کہ ہم کہیں کوئی جانور یا بیج (Seeds) ساتھ تو نہیں لائے ہیں، شکر ہے ہمارے ساتھ ایسی کوئی چیز نہیں تھی۔ جموں میں خیال آیا تھا کہ دو تین کلو سوکھے راجماش ساتھ میں لے کر جائیں گے، لیکن بھوپیش جی نے یہ کہہ کر منع کیا تھا، کہ کینیڈا میں بہترین قسم کے راجماش ملتے ہیں۔ البتہ ہم نمکین چائے پتی کا آدھا کلو لے کر گئے تھے۔ بیگم صاحبہ کو ایک بینچ پر بٹھا کر میں امیگریشن کاؤنٹر پر گیا۔ یہ لوگ اپنے اپنے کیبن میں بیٹھے تھے۔ خیال آیا کہ یہ لوگ تو اپنی نشستوں سے اٹھتے ہی نہیں ہیں اور پھر کچھ لوگ ان کی نظروں سے بچ کر نکل جاتے ہوں گے۔ مگر ان کے سامنے الیکٹرانک ساز وسامان اور کچھ آلات بھی تھے اور تعجب نہیں کہ ان ہی آلات کی مدد سے وہ سب لوگوں پر نگاہ رکھتے ہوں۔ زیادہ بھیڑ بھاڑ نہیں تھی۔ ان میں سے کچھ لوگ باہر کی طرف نظریں جمائے ہوئے تھے جہاں سے مسافر اندر کی طرف آرہے تھے۔ ایک جسیم آدمی نے مجھے کاونٹر پر آنے کا اشارہ کیا۔ میں وہاں گیا اور اپنے پاسپورٹ اس کو دیئے۔

'کہاں جارہے ہو؟' اس نے پوچھا۔

'کنیڈا۔' میں نے جواب دیا۔

'کنیڈا میں کہاں؟'

میں نے جہاز سے باہر آتے ہی ایڈریس ذہن نشین کرلیا تھا۔ میں ایک دم سے بولا 79 مل وے ٹورنٹو۔ میں نے مزید کہا کہ پورا پتہ زبانی یاد نہیں رہتا ہے۔ آپ کو لکھنا ہے تو میں

اپنی ڈائری سے پڑھ کر بتاؤں گا۔

'یہاں کس کام سے آئے ہو؟'

'سیاحت کی غرض سے،' میں نے کہا۔

'Enjoy Your self' اس نے کہا۔ ویزا پر طائرانہ نظر ڈالی۔ امیگریشن مہر ثبت کی اور واپس تھما دیئے۔ میں نے تشکر کا اظہار کرتے ہوئے پاسپورٹ لئے اور سامان لے کر اہلیہ کے پاس پہنچا۔ اسی اثنا میں وہاں ایک سیاہ فام آدمی آیا اور پوچھا، 'کُلی (قُلی) چھاہیے۔' میں نے نفی میں اپنا سر ہلایا۔ ہم سامان لے کر باہر آئے اور بھوپیش جی کی راہ تکنے لگے۔

پانچ بج چکے تھے۔ لوگ ائرپورٹ سے باہر آتے اور ٹیکسی لے کر اپنی منزل کی جانب روانہ ہو رہے تھے۔ ٹیکسی سٹینڈ آہستہ آہستہ خالی ہو رہا تھا۔ ہم نے ہر طرف دیکھا لیکن بھوپیش کہیں نظر نہیں آیا۔ 'کہیں وہ بھول تو نہیں گیا اور ہمیں سر راہ چھوڑ دیا،' میری اہلیہ نے کہا۔ 'مجھے نہیں لگتا ہے کہ بھول جائے گا،' میں نے کہا۔ 'وہ ہر دوسرے دن فون کر کے بتاتا تھا کون سی چیز ساتھ لانی ہے، کس چیز کی ضرورت نہیں ہے۔ آج کیسے بھول سکتا ہے۔'

ہمارے بزرگ کہا کرتے تھے کہ جو پربت یعنی پیر پنچال کے پار گیا اس کو گھر یاد نہیں رہتا ہے اور پھر بھوپیش سمندر پار آیا ہے، اس نے کہا۔ 'اگر اس نے ایرپورٹ آنے کی بات نہیں کی ہوتی تو ہم ٹیکسی لے کر نکل پڑتے۔'

'کیا پتہ ٹریفک جام میں پھنس گیا ہو، جموں یاد نہیں ہے۔ یا پھر گاڑی پر بھی کہاں بھروسہ کیا جا سکتا ہے۔ راستے میں خراب ہو جائے۔ پھر کوئی بھی تدبیر کارگر نہیں ہوتی ورنہ وہ بھولنے والوں میں نہیں ہے۔ آدھا گھنٹہ اور انتظار سہی،' میں نے کہا۔

چھ بجنے والے تھے۔ میری بے چینی میں اضافہ ہو رہا تھا کہ سات بجے تک مکمل اندھیرا چھا جائے گا اور پھر زیادہ مشکل ہوگی۔ میرا موبائل فون بند ہو گیا تھا۔ لہذا پبلک بوتھ سے بھوپیش کو فون کرنے کا خیال آیا کہ ہم یہاں درماندہ ہیں ہماری خبر لو۔ اس کے لئے ایک

ڈالر کا سکہ درکار تھا جو میرے پاس نہیں تھا۔ پاس میں ہی ایک دکان پر ایک لڑکی ہماری جانب دیکھ رہی تھی۔ میں نے اس سے کہا کہ 'مجھے فون کرنا ہے، جس کے لئے ایک ڈالر سکے کی ضرورت ہے۔ کیا آپ مجھے بیس ڈالر کے نوٹ کا چینج دے سکتی ہیں'۔ اس نے کہا کہ 'ہم بیرونی ممالک کی کرنسی تبدیل کرتے ہیں اور اس کے لئے پانچ فیصد کمیشن لیتے ہیں'۔ میں نے سوچا کہ اب ٹیکسی لے کر گھر پہنچنا ہی بہتر رہے گا۔ لیکن کوئی ٹیکسی دستیاب نہیں تھی، تاہم ایک شخص نے کہا کہ ابھی آئیں گی، آپ یہیں انتظار کریں۔ یہ ٹیکسیاں بڑی، خوبصورت اور ریشمی رنگ کی ہیں، جیسے ابھی فیکٹری سے لائی گئی ہوں۔ کہاں وہ دلی ائرپورٹ کے کھٹارے۔ 'لیکن اچھا خاصا کرایہ وصول کرتی ہوں گی'، میرے ذہن میں خیال آیا۔

میرا دھیان ٹیکسی کی طرف تھا کہ پیچھے سے کوئی جانی پہچانی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔ میں مڑا تو دیکھا کہ میری بہو جیوتی ہماری طرف آ رہی ہے۔ اس نے کہا کہ ہم ایک گھنٹے سے آپ لوگوں کو ڈھونڈ رہے ہیں، ہر جگہ دیکھا، اندر بھی، باہر بھی، لیکن آپ کہیں نہیں ملے۔ بہو اصل میں وچارناگ کی رہنے والی تھی، ٹوٹی پھوٹی کشمیری بولتی ہے اور میرے بارے میں جانتی ہے کہ میں کبھی کبھی مذاق بھی کر لیتا ہوں۔ میں نے کہا کہ اس عمارت کی بھول بھلیوں کو ہم سمجھنے سے قاصر رہے۔ نہ اندر آنے کا راستہ سمجھ آتا ہے نہ باہر جانے کا۔ اس پر طرہ یہ کہ ہم کشمیری اور وہ بھی دیہات کے، یہاں کوئی دوست ہے نہ دشمن، ہم جاتے تو کہاں جاتے۔ دو بیگ اندر سے لے لیے اور یہاں آپ لوگوں کی راہ دیکھنے لگے۔

'آپ کو اندر ہی رکنا چاہئے تھا'، اس نے کہا۔

'اندر ہی' کا کیا مطلب ہے؟' میں نے پوچھا۔

بہرحال انہوں نے گاڑی عمارت کے عقب میں رکھی تھی جس طرف جہاز نے land کیا تھا۔ ہم عمارت کی دوسری جانب تھے۔ لہٰذا دوبارہ اندر جا کر واپس جانا پڑا۔ عمارت کی دوسری منزل پر ایک طرف ریل کے ڈبے جیسا شٹل چل رہا تھا۔ یہ مخصوص جگہوں پر رکتا ہے،

اس کے دروازے خود کار ہیں، مسافر خود چڑھتے اور اترتے ہیں۔ اس کی سواری مفت ہے۔ ہم اسی شٹل میں سوار ہوئے اور بلڈنگ میں گھومنے لگے۔ بیچ میں شٹل بلڈنگ سے باہر نکل کر ایک برآمدے سے دوسرے برآمدے تک گیا۔ اُس وقت لگتا تھا کہ ہم ہوا میں گھوم رہے ہیں۔ اس میں مسافروں کی کوئی بھیڑ نہیں تھی اور اس کے سفر میں لطف آرہا تھا۔

گاڑی میں بیٹھ کر وقت کا کوئی دھیان نہیں رہا کیونکہ سورج ابھی بھی روشن تھا۔ یہاں سے نکل کر ہم 401 ہائی وے پر پہنچے اور شہر کی گہما گہمی میں کھو گئے۔ سڑک پر صرف گاڑیاں دوڑتی نظر آرہی تھیں۔ شاذ و نادر ہی کوئی آدمی پیدل چل رہا تھا۔ پیدل چلتا کوئی آدمی دِکھا۔ ہماری گاڑی ساٹھ کلومیٹر فی گھنٹہ سے زیادہ رفتار سے جارہی تھی، لہٰذا اس سفر کا بھی ہم نے لطف اٹھایا۔

آدھے گھنٹے بعد ہم دوسری سڑک پر پہنچے، جو ہماری منزل کی طرف جاتی تھی۔ یہ ایک طویل سڑک ہے، بیس فُٹ سے زیادہ چوڑی، لیکن اس وقت سنسان تھی، جیسے کرفیو لگا ہو۔ سڑک کے دونوں اطراف میں یکساں طرز کے مکانوں کی قطار دِکھ رہی تھی، جن کی دوسری منزل کا اوپری حصہ لکڑی سے ڈکا ہوا تھا۔ ہر مکان کے ساتھ ایک گیراج ہونے کے باوجود بہت ساری گاڑیاں مکانوں کے باہر کھڑی تھیں۔ مکان کا کوئی صحن ہے اور نہ کوئی دیوار بندی، آگے پیچھے سارا کھُلا۔ خالص خوبصورت پھولوں سے سجایا ہوا۔ گاڑی سے اترتے ہی ٹھنڈی ہوا محسوس ہوئی۔ ہم گھر کے اندر داخل ہوئے اور جس چیز نے مجھے پہلے متاثر کیا وہ گھر کا طرزِ تعمیر تھا۔ ہم نے آتے ہی چائے پی اور پھر نہا دھو کر باتوں میں مشغول ہو گئے۔ جیوتی نے کہا کہ پہلے کھانا کھائیں پھر بھلے ہی رات بھر گپیں لڑانے کیلئے بیٹھ جائیں۔ میں نے کہا کہ ابھی سورج غروب نہیں ہوا ہے، اندھیرا چھا جائے، پھر کھاتے ہیں۔ اس نے کہا کہ رات کے نو بج چکے ہیں، پھر کب کھائیں گے۔ میں یہ سن کر حیران ہوا کہ رات کے نو بج چکے ہیں اور باہر ابھی روشنی ہے۔ حقیقت یہی ہے کہ اس وقت میں سمجھ ہی نہیں پایا کہ یہاں رات کے نو بجے بھی اتنی

روشنی کیسے رہتی ہے، جب کہ جموں جو کہ کینیڈا کے مقابلے میں خط سرطان کے زیادہ نزدیک ہے، میں مئی کے مہینے میں شام سات بجے ہی اندھیرا چھا جاتا ہے۔(21 جون کو زمین کا شمالی نصف کرہ سورج کی طرف زیادہ جھک جاتا ہے، خط سرطان پر سورج کی کرنیں عموداً پڑتی ہیں، روشنی اور اندھیرے کا دائرہ قطب شمالی سے ساڑھے 23 درجہ پیچھے چلا جاتا ہے اور کرۂ شمالی میں سب سے بڑا دن اور سب سے بڑی رات ہوتی ہے۔) میری معلومات کے مطابق کینیڈا میں دن اگر چھوٹا نہیں تو کم سے کم جموں کے دن کے برابر ہونا چاہیئے تھا۔ یعنی وہاں بھی سات بجے اندھیرا چھا جانا چاہیے تھا۔ بعد میں مجھے خیال آیا کہ یہ ساڑھے 23 درجے کے دائرے، جہاں قطبین میں چھے چھے مہینے کے دن اور رات ہوتے ہیں، کے جنوب میں واقع ہوگا، اسی لئے یہاں دیر تک روشنی رہتی ہے۔۔ اس لیے ہم اندھیرا ہونے کا انتظار کرنے لگے تھے۔ جب تک ہم نے کھانا کھایا تب تک رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ ہم کافی دنوں تک روشنی اور اندھیرے کے اس بھنور میں پھنسے رہے، جب تک کہ اس کی عادت پڑ گئی۔ ٹیلی ویژن دیکھنے میں بھی کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ البتہ بھوپیش کی اچھی خاصی لائبریری تھی۔ میں نے الفرڈ گِزن کی ''امریکہ'' محفوظ کی ''ماڈرن قیرو'' اور یان مارٹن کی ''لائف آف پائی'' نامی کتابوں کا انتخاب کیا۔ 'امریکہ' میں نے دو بار وقفہ وقفہ کر کے پڑھی۔ انہیں پڑھنے میں ایک ماہ سے زیادہ وقت لگا۔ تینوں کتابیں ادبی دنیا میں ایک منفرد مقام رکھتی ہیں۔ محفوظ نوبل انعام یافتہ مصنف ہے۔ یان مارٹن کی کتاب ''لائف آف پائی'' کو مین بُکر پرائز (Main Booker Prize) سے نوازا گیا ہے اور اس کتاب پر ایک فلم بھی بن رہی ہے۔ کچھ دنوں بعد ہم ''بے وِو بُک شاپ'' (Bay viev Book Shop) پر گئے وہاں محفوظ کی The cairo Trilogy نامی کتاب جس میں اس کی تین تصانیف شامل ہیں خریدی۔ اس کی قیمت 42 ڈالر تھی۔ جب میں نے اس رقم کو روپیوں میں تبدیل کیا تو پایا کہ یہ 1890 روپے بنتے ہیں۔ میں خریدنے کی ہمت نہیں جٹا پایا۔ لیکن بیٹے کے اصرار پر میں نے یہ کتاب خریدی۔ لگ بھگ 1300 صفحات پر مشتمل ہے اور

میرے لئے اسے پڑھنے کے لیے کافی وقت تھا۔

اس کے علاوہ میں نے وی۔ ایس نیپال 'India a Million Minu' کا مطالعہ بھی کیا۔ نیپال کے بارے میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ وہ بہت ہی بلند پایہ کے نوبل انعام یافتہ ناول نگار اور سفرنامے لکھنے والا ہے۔ وہ بھی ہندوستان کی گندگی سے متنفر ہے۔ کتاب میں ایک جگہ لکھا ہے کہ:

''میرے دھلے ہوئے کپڑے سے صابن کی بو آرہی تھی۔ وہ بھی اس کپڑے سے جو کسی اور نے دھویا تھا'۔ مجھے لگا کہ اس کی سونگھنے کی حس کافی تیز ہے۔

(جاری)

............○○............

مترجم......شاداب ارشد

ترجمۂ غزلیّات حبیب اللہ نوشہری المتخلص بہ حبیؔ

(1)

ای پاك ، حمدِ پاك تو پاك از اداىِ ما
عاجز زبانِ ما ز ادا همچو راىِ ما

ترجمہ:......اے پاک ذات، تمہاری حمدِ پاک ہمارے اظہار و بیان سے پاک ہے۔ ہماری زبان ہمارے عقیدے ورائے کی طرح اس کے تظاہر سے عاجز ہے۔

عزّو بقاىِ تست ، سزاوارِ ذاتِ تو
فقر و فناىِ ماست مهیّا براىِ ما

ترجمہ:......تیری ابدیت وعزّت تیری ہی ذات مقدّس کے شایانِ شان ہے۔ ہمارا فقروفنا ہماری ذات کے لئے بنا ہے۔

از جلوه ىِ جلال وجمالِ تو ظاهر است
ناز و نیاز جمله شاه و گداىِ ما

ترجمہ:......تمہارے جلال و جمال کے جلوؤں سے یہ بات ظاہر ہے کہ چاہے وہ بادشاہ ہو یا فقیر، التماس کرنا اور محتاج ہونا تو ہمارے لئے ہے۔

یک موز کہنہ تو نتوانست کرد حل
عقل و خرد کہ آمدہ مشکل کشایِ ما

ترجمہ:......عقل وخرد جو ہمیں مشکلوں کو حل کرنے کے لیے عطا ہوئی ہے، ذرا بھر بھی تمہاری ذاتِ قدیم کی حقیقت کے راز تک رسائی نہ پا سکی۔

عرفانت ار نباشد، زینت چسان دھد
دستار و ریش و فش و ردا و عصایِ ما

ترجمہ:......تمہارا عرفان و معرفت اگر موجود ہی نہ ہو، تو ہماری دستار، ریش، طرہ، چادر اور عصا ہم کو کیسے زینت بخشیں گے۔

گرچہ ملایکہ بُد مقرّب بہ در گھت
گفتند عاجز است ازین پایہ پایِ ما

ترجمہ:......اگر فرشتہ (حضرت جبریل امینؑ) تمہاری بارگاہ عالی کے قریب تھا، پھر بھی اس نے کہا کہ اس مقام سے آگے جانے سے میرے پاؤں عاجز ہیں۔

گرچشم عارفی است ازین نکتہ وا ولی
گفتا زبان کجاست؟ باین چشم وایِ ما

ترجمہ:......ایک عارف کی آنکھ اگرچہ اس نکتے سے آگے ناظر ہے، پھر بھی اس نے کہا، افسوس ہماری مشاہدہ کرنے والی آنکھوں پر، ان کے پاس وہ قوتِ اظہار کہاں ہے؟ (یعنی عارف کی آنکھ جن عرفانی اسرار کا مشاہدہ کرتی ہے، وہ ملائکہ بھی نہیں کر سکتے۔ لیکن ان آنکھوں کے پاس وہ ذریعہ نہیں جس سے وہ ان اسرار کو بیان کر سکیں)

شاھا بلند قدر ذکر و بیان شوم
گوید گدای کوی تو، گدای گدایِ ما

ترجمہ:......اے بادشاہ! ہمارا ذکر و بیان عالی مقام ہو جائے گا، اگر تمہاری گلی کا بھکاری کہے گا کہ یہ تو ہمارا بھکاری ہے۔

حبّی کجا و مدح و ثنای تو هم کجا؟
لا احصا است گفته چو از مصطفایِؐ ما

ترجمہ:......حبّی کہاں اور تمہاری حمد وثنا کہاں؟ (یعنی حبی کی وہ اوقات کہاں جو آپ کی مدح و ثنا بیان کر سکے) یہ خارج از بیان وشمار ہے، جیسا کہ ہمارے آقا حضرت محمد مصطفٰےؐ نے فرمایا ہے۔

(2)

ای اسمِ تو اعظما ز اسما
تخم همه نامهای عظما

ترجمہ:......تیرا اسمِ اعظم سب اسماء سے عظیم ترین ہے۔ سب عظمت والے ناموں کی بنیاد یہی ہے۔

تخمی که نموده است نخلی
نخلی که فزوده است خرما

ترجمہ:......ایسا بیج جو کھجور کا پیڑ بن کر اُگا، اُس کھجور کے پیڑ سے کھجوروں کی بہتات پیدا ہوئی۔

خرمای که هست عین تخمی
جز تخم دگر چه هست فرما؟

ترجمہ:...... کھجور جو عینِ بیج ہی ہے۔ آپ ہی فرمایئے بیج کے بغیر اور کچھ ہے کیا؟

مقصود ز بود نخلِ خرما ست
یعنی که رسول ماه سیما

ترجمہ:...... کھجور کے پیڑ کے وجود سے مراد کھجور ہے یعنی کہ چاند جیسا روئے مبارک رکھنے والے جناب حضرت رسول نازنینؐ۔

لولاك لما خلقت الافلاك
کرد است بریں نکات ایما

ترجمہ:...... ''اگر آپؐ نہ ہوتے، تو میں نے افلاک کو تخلیق نہیں کیا ہوتا'' (حدیثِ

قدوسی ہے) سے ان نکات کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔

آن اسمِ تو عینِ تست بیشک
غیرِ تو نہ اسم و نی مسمّا

ترجمہ:......آپ کا اسم مبارک بے شک عین آپ کی ذات ہے۔ نہ تو نام اور نہ ہی وہ جس کا نام آپ کے نام پر رکھا گیا، آپ سے الگ ہے۔ (یعنی نبی پاکؐ کی ذاتِ مبارک آپ کی ذاتِ گرامی سے الگ نہیں ہے۔)

عین تو مہر و علم پرتو
از علم بہ عین راہ بنما

ترجمہ:......تیرا عین (یعنی جناب نبی پاکؐ) مہر و معرفت کا پرتو ہے، اپنے عین کے علم و معرفت سے ہماری راہنمائی فرمایئے۔

عینی کہ بر واست نقطۂ غین
غینی کہ ازوست بندہ اعما

ترجمہ:......عین (ع۔یعنی نبی پاکؐ جو عین تمہاری معرفت کا پرتو ہیں اور بہ صورت غ جلوہ افروز ہوئے ہیں یعنی تیری (اللہ کی) اور آپؐ کی معرفت میں بس غ کے نقطے کا فرق ہے) جس پر غین (غ) کا نقطہ ہے۔ غین جس کی وجہ سے جہالت و گمراہی بند و مسدود ہوگئی۔ (مراد آپؐ کے طفیل ہی جہاں سے جہالت و گمراہی دور ہوگئی)

حبّی و بدست دامنِ رحم
دامن مکش ای رحیم بر ما

ترجمہ:......حبّی تمہارا دامنِ رحمت تھامے ہوئے ہے۔ اے رحیم ہم پر سے اپنا دامنِ رحمت مت ہٹائے۔

(3)

یا من صفاء وجھک فی غایة الصفا
من وصفک صفاء لک الاسم مصطفا

ترجمہ:......اے وہ ذات جن کا روئے مبارک انتہائی صاف ہے۔آپ کے پاکیزہ اوصاف کی وجہ سے آپ کے لیے نامِ مصطفےؐ چن لیا گیا ہے۔

در راہ دین گرچہ بسی وادیِ خطاست
چون توجفا کشی بہ کجا صاحبِ وفا

ترجمہ:......دین کے راستے میں اگر چہ بہت سے سہو وخطا کے بیابان ہیں۔آپؐ کے جیسا صاحبِ وفا اور جفا کش کوئی کہاں ہے۔

کبکی چو تو کجا ست دریں راہ اھتدا
سروی چو تو نخاست درین باغِ اصطفا

ترجمہ:......اس ہدایت کے راستے میں آپؐ کے جیسا حسین وجمیل سبک رفتار کہاں ہے۔اس برگزیدہ باغ میں آپؐ کے جیسا سرو (یعنی بلند قامت) کوئی پیدا نہیں ہوا۔

یا ایھا الحبیب ویا ایھا الطبیب
فی حُبک الدواء وفی طبک الشفا

ترجمہ:......اے پیارے حبیبؐ اور اے پیارے طبیبؐ، آپ کی محبت دوا ہے اور آپ کی دوا میں شفا ہے۔

شد از ظھور نور خدا چون حضور تو
من شدة الظھور علی العینِ اختفا

ترجمہ:......نورِ خدا کے ظہور سے آپؐ کا ظہور ہوا ہے۔ جو ظہور کی شدّت سے آنکھوں پر پوشیدہ ہے۔

ھر دیدہ نیست لایق دیدار تو ولی
چشم صفا سزد بہ تماشای آن صفا

ترجمہ:......ہر آنکھ آپ ؐ کے دیدار کے لائق نہیں ہوتی۔صرف پاکیزہ آنکھیں اس پاکی وتابداری کے دیدار کے لائق ہیں۔

حبّی نظر چو کرد بہ دریایِ نعتِ تو
من موجہ المھیب علی ذاك اکتفا

ترجمہ:......حبّی نے جب نعتِ پاک ؐ کے سمندر کی طرف نگاہ کی، اس کی خوفناک لہروں سے بس اشارے پر ہی اکتفا کر دیا۔

غزل نمبر(4)

ای آمدہ صفات تو چون سایۂ ذات را
این کاینات سایہ شدہ آن صفات را

ترجمہ:......اے آپ ؐ کی صفات، ذاتِ پاک کا سایہ بن کے آئی ہیں۔ یہ کائنات آپ ؐ کی اُن صفات کا سایہ بن گئی ہے۔

صد کارِ نوبہ نو قلم از امرِ کاف و نون
یک مُو مداد کم نشود این دوات را

ترجمہ:......سینکڑوں نئے نئے کام کاف اور نون (یعنی کن فیکون) کے حکم سے قلم بند ہو رہے ہیں۔لیکن ذرا بھر بھی اس دوات کی سیاہی میں کمی واقع نہیں ہوتی۔

امرت کدام و آمر و مامور ھم کدام
در وحدتت چہ فایدہ نفی و ثبات را

ترجمہ:......آپ کا کون سا حکم، کس پر صادر فرمایا گیا اور حکم دینے والا کون ہے؟

آپ کی وحدت میں نفی اور اثبات کا کیا فائدہ؟

یک بندۂ جمال و دگر بندۂ جلال
آن یک گرفته کعبه، دگر سومنات را

ترجمہ:......کوئی ایک جمال کی بندگی کرنے والا اور دوسرا جلال کی بندگی کرنے والا ہے۔ کسی نے کعبہ کو چُنا اور کسی نے بت خانے کا انتخاب کیا۔

رندی که اور مقیّد این کفر و دین نماند
نی سنگ "لا" زند سر لات و منات را

ترجمہ:......وہ رند جو کفر و دین کے اس قید و بند میں مقید ہو کر نہیں رہا، وہ لات و منات (کعبہ شریف میں رکھے گئے بتوں کے نام) کے سر پر "لا" کا پتھر نہیں مارتا۔

حضرت ز قرب جمع مگر آمده به فرق
از کعبه بر کشیده چو عزّ او لات را

ترجمہ:......حضرتِ حق کے مشاہدے سے قریب ہو کر اور لوگوں سے حجاب کرتے ہوئے آپؐ نے اللہ کے حکم سے لات نامی بُت سے کعبہ کو پاک کیا۔

حبّی عَلم ز عِلم فرازد به اوج عین
یا رب اگر تو رخنه کنی این جهات را

ترجمہ:......یارب اگر تم ان اطراف میں شگاف ڈال دو تو حبّی علم کے توسط سے عین وہاں تک علم بلند کرے گا۔

(5)

ای چشم تست آفت درس و کتاب ما
کرده اشارتی سُوِی چنگ و ربابِ ما

ترجمہ:......اے! آپ کی آنکھیں ہماری کتابوں اور درس کے لئے آفت ہیں۔ وہ

چنگ ورباب (آلاتِ موسیقی) کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔

یک نغمه است کاشفِ سرِّ هزار فصل
یک پرده است فاتح صد قفل بابِ ما

ترجمہ:......ایک نغمہ کتاب کے ہزاروں ابواب کے رازوں کو آشکار کرنے والا ہے۔ ایک ترانہ باب میں موجود سینکڑوں تالوں کو کھولنے والا ہے۔ (گھتیوں کو سلجھانے والا ہے)

آری تن خمیده رگها شود رباب
زان شد که دیده جام می ودل کبابِ ما

ترجمہ:......ہاں! خمیدہ جسم اور رگوں سے رباب بنتا ہے، جس سے میری آنکھیں جامِ شراب یعنی پُر اشک اور دل جل بھن کر کباب بن گیا۔

مستِ ابد شدیم به یک جرعهٔ شراب
فرقی بسی است از می رز تا شرابِ ما

ترجمہ:......شراب کے ایک گھونٹ سے ہم ابدی مست و مدہوش ہو گئے۔ ہماری شراب (یعنی شرابِ معرفت) اور انگور کی شراب میں بہت بڑا فرق ہے۔

باشد که لاله رسته ببیند ازین سراب
فردا گذر کسی که کند بر ترابِ ما

ترجمہ:......کل اگر کسی کا گزر میری مٹی (قبر) سے ہوا۔ کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ اس سراب (جھلسی ہوئی زمین جو آفتاب کی روشنی میں چمکتی ہے اور دور سے پانی کے مانند دکھائی دیتی ہے) میں کھلے ہوئے لالہ کے پھولوں کو وہ دیکھ لے۔

ساقی و ساغر وی میخواره شد یکی
در عکس آب کاسهٔ چشم پُر آب ما

ترجمہ:......وہ ساقی وساغر ہے اور کوئی شرابی بن گیا۔ عکسِ آب میں (تجلّیاتِ معرفت) ہماری آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئی ہیں۔

صحرای حسن جملهٔ خوبان شود سراب
گر شعله افتدش ز رخِ آفتابِ ما

ترجمہ:......تمام حسینوں کے حسن کا صحرا سراب بن جائے گا۔ اگر ہمارے آفتاب (یعنی محبوب) کے چہرے کا ایک شعلہ اس پر پڑے۔

زاهد مکن تو وسوسهٔ ترك می که گاه
از آسمانِ سینه درخشند شهابِ ما

ترجمہ:......اے زاہد! تو شراب کو ترک کرنے کا وسوسہ پیدا مت کر (یعنی شرابِ معرفت کو چھوڑنے پر آمادہ مت کر)، کیونکہ سینے کے آسمان سے کبھی ہمارا درخشان ستارہ چمکے گا۔ (یعنی محبوب ازلی کبھی دل کے آسمان پر درخشاں ستارے کی مانند جلوہ افروز ہوگا جب شرابِ معرفت سے آئینہ دل صاف و پاک ہوگا)

جام میِ محبت او چون کشاد لب
گفتا سراسر آمده حبّی حبّابِ ما

ترجمہ:......اس کی محبت کے جامِ شراب نے جب لب کھولے تو کہا: حبّی سراسر ہمارا دوست بن کے آیا ہے۔

(6)

شکر خدا که پُر شده از باده جام ما
از جام ما رسیده دمادم به کامِ ما

ترجمہ:......خدا کا شکر! ہمارا جام شراب سے بھر گیا (یعنی جامِ دل شرابِ معرفت سے بھر گیا)۔ ہم اپنے اس جام سے ہر دم اپنے مقصود کو پاتے ہیں۔

این دولتِ ابد چه میسّر شد از ازل
کاین آستانِ پیر مغان شد مقامِ ما

ترجمہ:......یہ ہمیشہ رہنے والی دولت ازل سے ہمیں کیا میسّر ہوئی کہ ساقی (مرشدِ پاک)

کی دہلیز ہمارا مقام بن گیا۔

ساقی تو دور کن به تسلسل که دور ماست

مانع اگرچه آمده علام عامِ ما

ترجمہ:......اے ساقی! آپ تسلسل کے ساتھ شراب کا دور چلائیے، کیوں کہ اب ہماری باری ہے۔ اگرچہ تمام اکابر علماء نے ہمیں ایسا کرنے سے روکا ہے۔

ازخود گذشته ایم، چون این می چشیده ایم

امّا تفاوتی نشده در کلامِ ما

ترجمہ:......جب سے یہ شراب ہم نے چکھی ہے، ہم اپنے آپ سے بے خبر ہو گئے ہیں۔ لیکن ہمارے کلام میں اس سے کوئی فرق واقع نہیں ہوا۔

زاهد مکن تو جنگ باین قسمتِ ازل

زهدی به نامت آمده رندی به نامِ ما

ترجمہ:......اے زاہد! تو ازل کی اس تقدیر و تقسیم کے ساتھ مت لڑ کہ زہد تمہارے حصے میں آیا اور رندی ہمارے نام ہوئی۔

بی باده عمر نیست چو محسوبِ عاقلان

یا رب مباد خالی ازین صبح و شامِ ما

ترجمہ:......جب عاقلوں کے یہاں بغیر شراب کے عمر، عمر شمار نہیں ہوتی۔ یا رب! ہماری صبح و شام اس سے (شرابِ معرفت سے) خالی مت رکھ۔

آن باده ای که قطره نگنجد به نُه فلک

حبّی چه قدر تست که گنجد به جامِ ما

ترجمہ:......وہ شرابِ معرفت کہ جس کا ایک قطرہ آسمانوں میں نہیں سماتا۔ حبّی تیری قدر و منزلت کیا کہ تمہارے جام میں سما جائے

(7)

ای دردمندانِ ترا، دردِ تو داروی شفا
وی مستمندانِ ترا، آرام در جایِ جفا

ترجمہ:.....اے پیغمبرؐ! آپؐ کے دردمندوں کے لئے آپ کا درد شفا بخشنے والی دوا ہے۔ آپؐ کے محتاجوں کے لئے سختی کی جگہ میں بھی آرام وسکون ہے۔

گر تو به چوگانِ قضا زخمم رسانی صد چوگو
سر بر ندارم از جفا یکدم ز میدانِ وفا

ترجمہ:.....اگر آپؐ حکم کی لاٹھی (Polo Stick of decree) سے سو بار بھی گیند کی طرح مجھے ماریں گے۔ پھر بھی میں میدانِ وفا سے لمحہ بھر بھی بے وفائی کے ساتھ اپنا سر نہیں اُٹھاؤں گا۔

گر خوبرویانِ جهان آیینهٔ روی تو اند
لیکن ندارند آن صفا کاندر رخِ آن مصطفا

ترجمہ:.....دنیا کے تمام حسین وخوب رو محمد مصطفیٰؐ کے روئے مبارک کا آئینہ ہیں۔ لیکن اُن میں وہ پاکیزگی نہیں ہے جو آپؐ کے روئے مبارک میں ہے۔

پاك آمد از زنگ جفا آیینهٔ چار عنصرت
آیینهٔ آیینه ات آن چار یار با صفا

ترجمہ:.....آپؐ کے چار عناصر کا آئینہ جفا کے زنگ سے پاک ہے۔ وہ چار یار باصفا آپؐ کے آئینے کا آئینہ ہیں۔

اوّل ازان صدیقؓ بین آخر ازان حیدرؓ نگر
فاروقؓ و عثمانؓ درمیان اینست ترکیب شفا

ترجمہ:.....دیکھ لے! اس کی ابتدا حضرت صدیقؓ اور انتہا حضرت حیدرؓ ہیں۔ حضرت عمر فاروقؓ اور حضرت عثمانؓ درمیان میں ہیں۔ یہی شفا کی ترکیب ہے۔

یا مصطفاؐ قبضِ کفاف اعداء نا من رهبک
یا مجتبا من سیفک ضرب کفا ضرب کفا

ترجمہ:......یا مصطفےؐ ! آپ کے ڈر سے ہمارے دشمنوں کے ہاتھ رکے رہے۔ یا مجتبیٰؐ ! آپ کی تلوار مبارک کا ضرب کافی ہے، کافی ہے۔

چون این حصارِ نفسِ من سخت از حصار خیبراست
یا من لہٗ سیف الهدا ےقم این انت اتفا

ترجمہ:......چونکہ میرے نفس امارہ کا قلعہ، خیبر کے قلعہ سے زیادہ سخت ہے۔ اے وہ جن کے پاس ہدایت کی تلوار ہے، میری امداد فرمائیں۔

چون نیست حبّی را گنه جز از خودی بر ترنگر
گر از خودی فارغ شود، دانم که اللہ اعفا

ترجمہ:......چونکہ حبّی کا اور کوئی قصور احساسِ خودی کے سوا نہیں ہے۔ اگر خودی سے فارغ ہو جاتا ہوں تو جان لوں گا، اللہ پاک ومبرّا کرنے والا ہے۔

(8)

ای هر گدای کویِ گدایِ تو شاه ما
فقر است تا به شهر بقا شاهراه ما

ترجمہ:......تمہارے کوچے کے بھکاری کا ہر بھکاری ہمارا بادشاہ ہے۔ بقا کے شہر تک پہنچنے کے لئے فقر ہماری شاہراہ ہے۔

چون از عمومِ رحمتِ خود یک صدا زنی
شیرین کنی تو تلخِ عذاب گناه ما

ترجمہ:......جب آپؐ اپنی رحمتِ عام سے آواز دیں گے تو ہمارے گناہوں کے عذاب کی تلخی کو بھی شیریں کر دیں گے۔

احرام بہرہ قبلۂ کوئِ تو بستہ ایم
شاید حریم کعبہ شود صید گاہ ما

ترجمہ:......تیرے کوچے کے قبلے کے لئے ہم نے احرام باندھ لیا ہے۔ شاید کعبہ کا صحن ہمارے شکار ہونے کی جگہ بن جائے۔

در خرمنِ گناہ ننهی آتش ار ز مهر
یکجو هزار شعلۂ آتش ز آہ ما

ترجمہ:......اگر گناہوں کے خرمن کو محبت کی آگ سے نہیں جلائیں گے تو ہماری آہوں سے آگ کے ہزاروں شعلے اٹھیں گے۔

وز کیدِ دشمن از تو دهی در خودم پناہ
گردد مو گلان ستارہ سپاہ ما

ترجمہ:......دشمن (شیطان) کے مکروفریب سے اگر آپ ہمیں اپنی پناہ میں لے لیں گے تو ستارے سپاہی بن کر ہماری حفاظت کریں گے۔

گر از سگان کوی شماری و می رسد
بالای چرخ دبدبۂ عزّ و جاہ ما

ترجمہ:......اگر آپ اپنے کوچے کے کتوں میں ہمیں شمار کریں گے تو ہماری شان وعزت کا دبدبہ آسمان کی بلندیوں کو چھولے گا۔

حبّی تو پاسِ این نفس رفتہ رفتہ دار
چون هفتہ هفتہ می رود این سال وماہ ما

ترجمہ:......حبّی رفتہ رفتہ گزرنے والی اپنی سانسوں کی حفاظت کر، کیوں کہ ہفتہ ہفتہ کرکے ہمارے یہ سال اور مہینے گزرتے جارہے ہیں۔

(9)

اگر روزی ببینم روی آن شاہ خراسان را
بہ خطّ وی بخشم بہ لعل وی بدخشان را

ترجمہ:......کسی دن اگر میں اُس شاہِ خراسان کا چہرہ دیکھ لوں تو اس کے خط (یعنی چہرہ) پر خطا (مملکت چین میں دریائے ہوانگھو کے جنوب میں واقع علاقہ) اور اس کے ہونٹوں پر بدخشاں کو قربان دوں۔

بہ زلفِ وی چہ می بخشم؟ کہ خود صاحب چین است
بہ خالِ وی چہ می بخشم ؟ کہ روم آمد مقام آن را

ترجمہ:......میں اس کی زلفوں پر کیا قربان کروں کی ملکِ چین پر اس کی سلطنت قائم ہے۔اس کے تِل پر کیا نثار کروں کہ روم اس کا مقام ہے۔

زعرضِ حالِ من رنجدچرا آن شاہ خوبانیم؟
گھی مورِ ضعیفی می کند عرض سلیمان را

ترجمہ:......وہ میرا شاہِ خوباں میرے عرض حال پر کیوں رنجیدہ ہو جاتا ہے؟ کبھی کبھار ایک ضعیف وکمزور چیونٹی حضرت سلیمانؑ سے درخواست واستدعا کرتی ہے،یا شرحِ حال بیان کرتی ہے۔

مرا در عشقِ او رجانہا چنین بسیار بایستی
کہ تاہردم فدا جانِ دگر می کردم آن جان را

ترجمہ:......میں اس کے عشق میں بہت ساری جانیں چاہتا ہوں،تا کہ ہر دم اُس معشوق پر میں اپنی ایک نئی جان فدا کروں۔

ز بطحا یک بُتی دیدم ، پرستارش شدم از جان
کہ آمد آن پرستاری مسلمانی مسلمان را

ترجمہ:......میں نے بطحا سے ایک صنم کو دیکھا اور دل وجان سے اس کا پرستار بن گیا، کیوں کہ اس پرستاری سے ایک مسلمان میں مسلمانی آ گئی۔

زھی شاھی ، زھی شاھی کہ شھنشاہ عالم شد
کہ بخشد تاج وتخت از خود گدایانِ گدایان را

ترجمہ:......مرحبا! کیا خوش وخوب بادشاہ ہے، جو سارے عالم کا شہنشاہ بن گیا جس نے خود سے تاج وتخت محتاجوں کے محتاجوں کو بخش دیا۔

زھی حبّی، زھی حبّی کہ بختت شد بلند از عشق
کہ افزاید ترا ھر دم بر ایمانِ تو ایمان را

ترجمہ:......مرحبا! اے حبّی کہ تمہاری تقدیر عشق کی وجہ سے بلند ہوگئی، عشق تمہارے ایمان میں ہر دم مزید ایمان کی افزائش کر رہا ہے۔

(10)

ای دل ھوایِ کشورِ عشق است اگر ترا
اوّل بر آزِ ھر دو جھان ونگھی در آ

ترجمہ:......اے دل! اگر تجھے ملکِ عشق کی آرزو ہے، تو پہلے دونوں جہاں کے طمع، لالچ اور امید سے باہر نکل۔

دانی کہ عشق چیست ؟ بہ نزدیک اھل عشق
میلی است بی نہایت و دردیست بی دوا

ترجمہ:......کیا تو جانتا ہے کہ اہلِ عشق کے نزدیک عشق کیا ہے؟ یہ تو وہ شوق وآرزو ہے جس کی کوئی حد نہیں اور ایسا درد ہے جس کی کوئی دوا نہیں۔

کردن گذر بہ عالم معنی ز صورت است
رفتن ازیں بہ سوی فنایست در فنا

ترجمہ:......صورت کے توسط سے عالمِ معنی میں گزر کرلے اور اس سے نکل کر فناء کی طرف چل اور فنا ہو جا۔

ہم پای باز آمدن از خود شکستن است
پیوستن است خویش بہ آن عالم بقا

ترجمہ:......پھر توقّف کر کے اپنے ساتھ رشتہ توڑ کر اُس عالم بقا سے اپنے آپ کو منسلک کر دے۔

از بندِ دام خوف و رجا آمدن برون
این بال و پر شادی و غم کردنست وا

ترجمہ:......امید و آرزو اور خوف و ہراس کے قید و بند کی زنجیروں سے باہر نکل اور آزاد ہو کر اور خوشی و غم کے بال و پر کو جڑ سے اُکھاڑ دے۔

از خیر و شر و مدح و ذم خلق رستن است
دایم ز دین و کفر برون کردنست جا

ترجمہ:......لوگوں کی بدگوئی، تعریف اور خیر و شر سے آزاد ہو کر ہمیشہ کفر و دین سے باہر اپنا مقام بنالے کہ یہی عشق ہے۔

جُز ذکر عشق چون نشنیدیم یک سخن
دانستہ شد کہ عاشق عشقی توحبّیا

ترجمہ:......چونکہ تمہارے لب سے ہم نے ذکرِ عشق کے بغیر کوئی بات نہیں سُنی ہے۔ پتہ چلا کہ اے حبّی تو اُسی عشق کا عاشق ہے۔

..........○○..........

ﷺ......عبدالصمد

تحلیل

نیند کے عالم میں ان کے کانوں میں کسی نے سرگوشی کی۔ اس سرگوشی میں ایسی موسیقیت اور دلنوازی تھی کہ نیند ٹھہر ہی نہیں سکتی تھی۔

وہ اُٹھ کر بیٹھ گئیں۔ لیمپ روشن کیا، کمرے میں کوئی نہیں تھا، وہ دوڑتی ہوئی کھڑکی کے پاس گئیں۔ پائیں باغ میں ہلکی چاندنی چھٹکی ہوئی تھی اور کھلتے ہوئے پھولوں اور ہرے بھرے پودوں پر واری نیاری ہو رہی تھی۔ ہری گھاس کے مخملیں فرش پر ہوا دھیمے سروں میں سرسرا رہی تھی۔ کسی ذی روح کا دور دور پتہ نہیں تھا لیکن کوئی تھا ضرور جوان کے کانوں میں سرگوشی کر گیا تھا۔ انہوں نے صاف محسوس کیا تھا، ان کے کانوں میں ابھی تک گدگدی سی ہو رہی تھی۔ انہوں نے صراحی سے ایک گلاس پانی انڈیل کر اپنے حلق بلکہ سارے جسم کو تر کرنے کی کوشش کی اور بستر پر پھر لیٹ گئیں، مگر نیند تو شاید سرگوشی کے ڈر سے دور ہی چھپی رہی۔

یہ آج ہی نہیں ہوا تھا، اکثر ہوتا تھا، خاص طور پر اس وقت جب وہ تنہا ہوتیں۔ مصروفیت تھک ہار کے انہیں کچھ دیر کے لیے خود ہی چھوڑ جاتی اور وہ ذہنی، نیز جسمانی سکون کی خاطر اپنی آنکھیں بند کر لیتیں، ذہن کو ہر فکر سے آزاد چھوڑ دیتیں اور اپنے آپ کو مکمل طور پر ایک خواب نا کی

کے حوالہ کر دینے کی کوشش کرتیں، بس اسی وقت ان کے کانوں میں کوئی بہت دھیمے سے کہتا:

''تم بہت خوبصورت ہو..........''

''تمہاری آواز میں بے پناہ موسیقیت ہے..........''

''تمہاری آنکھوں میں جو گہرائی ہے، وہ دنیا کی کسی جھیل کو میسر نہیں..........''

ان کا سارا سکون، آرام غارت ہو جاتا، اس لیے نہیں کہ ان سرگوشیوں سے ان کے جسم میں بے چینی اور بے اطمینانی کی لہریں دوڑ جاتیں بلکہ وہ بار بار اسی سرگوشی کو سننا چاہتیں اور تجسس کی اس دنیا میں پہنچ جاتیں جہاں صرف اپنی ہی تلاش سب سے بڑا مقصد ہو جاتی ہے ....اپنی ہی کھوج کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوتا۔

مسز بنرجی عمر کی اس منزل پر تھیں جہاں بہت سی ضروری اور غیر ضروری باتیں از خود غیر متعلق ہو جاتی ہیں۔ وہ تو یوں بھی شروع ہی سے بے حد عملی رہی تھیں۔ وہ زندگی کو دو دونی چار کے میزان پر تولتیں۔ ان کا دو دونی چار، پانچ میں کبھی تبدیل نہیں ہوا۔ کبھی وہ بہت خوبصورت ہوا کرتیں، یوں اب بھی کم نہیں تھیں، وہ خود ہی اپنی خوبصورتی کو خاطر میں نہیں لاتی تھیں۔ وہ خوب جانتی تھیں کہ بہت سے نوجوان ان کے دیوانے ہیں، ان کی ایک نگاہ غلط انداز کے منتظر ......ان کی راہوں میں اپنی آنکھیں بچھانے والے......ان کے لئے کچھ بھی کرنے کو تیار وغیرہ وغیرہ۔ مگر وہ انہیں حقارت سے دیکھتیں، ان سے مخاطب ہونا بھی انہیں گوارہ نہیں تھا۔ دلیپ سین سے ان کی دوستی کی بنیاد رومان ہرگز نہیں تھا بلکہ سین کی باوقار شخصیت، قابلیت، سحر البیانی اور حسِ مزاح کی بے پناہ قوت نے انہیں ان کے قریب لایا تھا۔ دلیپ سین سے باتیں کرنے میں انہیں مزہ آتا۔ وہ مسز بنرجی سے ہر اس موضوع پر گفتگو کر سکتے تھے جو انہیں پسند تھا بلکہ وہ اس کا خیال رکھتے کہ وہ ان سے ان کی پسندیدہ موضوعات ہی پر باتیں کریں۔ اس طرح مسز بنرجی کو بھی اپنی قابلیت دکھانے کا موقع مل جاتا۔ ان کے درمیان نظریاتی اختلاف بھی خوب رونما ہوتے مگر رشتے میں کبھی تلخی نہیں آتی۔ دلیپ سین ان کے صرف دوست تھے، محبوب نہیں، گو عورت اور

مرد کی دوستی کا اور کوئی روپ لوگوں کی سمجھ سے بالاتر تھا۔ مسز بنرجی جس طرح سین کے ساتھ ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر باہر نکلتیں، دونوں ہوٹلوں میں اکٹھے لنچ لیتے، تھیٹروں میں نظر آتے، اس سے اس یقین نے جڑ پکڑ لیا تھا کہ چڑیا جال میں پھنس چکی ہے اور اس کا انتظار تھا کہ انہیں جلد ہی ایک جوڑے کی شکل میں دیکھا جائے گا۔ حقیقت میں ان کے رشتے میں وہ رومان تھا ہی نہیں جو لوگوں کے ذہن میں بسا تھا۔ کبھی کبھار مسز بنرجی کی قابلیت اور اپنے نکتے پر جم جانے کے سبب سین ان کی تعریف پر اتر آتے تو برسبیل تذکرہ ان کے منہ سے بے ساختہ نکل جاتا۔

''آپ بہت خوبصورت ہیں..........''

اس بے ساختگی پر مسز بنرجی ایک آدھے لمحے کے لئے چونکتیں ضرور اور دلیپ سین کے چہرے پر اپنی نگاہیں گاڑ دیتیں، مگر وہاں دور دور تک کچھ نظر نہیں آتا تھا بلکہ ایسا معلوم ہوتا کہ یہ جملہ اس چہرے پر بنے منہ سے ادا ہی نہیں کیا گیا۔ مسز بنرجی کو بھی اطمینان ہو جاتا کہ یہ جملہ ان کے لئے کہا ہی نہیں گیا یا کہا بھی گیا تو ایک دم غیر ارادی طور پر۔ اس دن کسی مسئلے پر وہ دھواں دھار بول رہی تھیں، دلیلوں کی بھرمار تھی ان کے پاس اور وہ بہت سلیقے سے انہیں استعمال بھی کرتی تھیں۔ دلیپ سین مبہوت سے، بس انہیں تکے جا رہے تھے حالانکہ وہ بھی خاموشی سے کچھ سننے والے بندے ہرگز نہیں تھے، ان کے پاس بھی تقریباً ہر معاملے میں دلیلوں کی کوئی کمی نہیں ہوتی تھی مگر اس دن......وہ خوش ہوئیں تو وہ بے ساختہ بول اُٹھے۔

''اُف، آپ کی آواز میں کس قدر موسیقیت ہے، جی چاہتا ہے آپ یوں ہی بولتی رہیں اور میں سنتا رہوں..........''

اپنی تعریف سن کر اس وقت تو وہ خوش ہوگئیں، گو بعد میں انہیں خیال آیا کہ یہ کیا تعریف ہوئی۔ ان کی بحث اور دلائل کے بارے میں تو دلیپ سین کچھ بولے ہی نہیں، کم سے کم وہ ان دلیلوں کو کاٹ ہی دیتے۔ سین سے اس بابت پوچھنے کی بات انہیں جچی نہیں اور بات آئی گئی ہوگئی۔

ایک اور موقع پر وہ شہر کی خوبصورت جھیل کی سیر کو گئے ہوئے تھے، ایک تو جھیل ہی بہت خوبصورت تھی، دوسرے اس کو سنوارنے میں انسانی کاریگری اس قدر خوبصورتی سے استعمال ہوئی تھی کہ جھیل کا حسن دوبالا بلکہ سہ بالا ہو گیا تھا۔ مسز بنرجی تو اس خوبصورتی میں بالکل مبہوت ہو گئیں اور ریلنگ سے ٹک کر، اس کے نیلے پانیوں پر نگاہیں ڈالے اس وقت تک کھڑی رہیں جب تک دلیپ سین کی آواز اُن کے کانوں میں نہیں آئی۔

''آپ کی آنکھوں میں جو گہرائی ہے وہ اس جھیل کو تو کیا، دنیا کی کسی جھیل کو نصیب نہیں''

وہ جیسے اپنے آپ میں واپس آ کر کھل کھلا کے ہنس پڑیں۔

انہیں دلیپ سین کی صاف گوئی بہت اچھی لگتی تھی۔ انہیں یقین تھا کہ ان میں کوئی کمی ہوگی تو سین اس کا اظہار کرنے میں بھی ہرگز نہیں جھجکیں گے۔ ان میں ضرور کوئی کمی نہیں، تب ہی تو سین اس طرف کبھی نشاندہی نہیں کرتے۔ سین نے اپنے محتاط سلوک اور اچٹتے ہوئے جملوں سے ان کے اندر یہ یقین بٹھا دیا کہ وہ کبھی جھوٹ نہیں بولتے، صرف سچ بولتے ہیں، سین اس کا برملا اظہار کرنے سے نہیں جھجکتے۔ بہرکیف، ایک طرف دلیپ سین سے ان کی دوستی پروان چڑھتی رہی دوسری طرف ان کے والدین نے جب ان کی شادی اپنی مرضی سے ایک جگہ طے کردی تو خوشی خوشی راضی ہو گئیں اور مٹھائی کے ایک بڑے ڈبے کے ساتھ دلیپ سین کو یہ خوشخبری دی۔ دلیپ سین بھونچکے ہو کر انہیں دیکھنے لگے، منہ سے ان کے ایک لفظ بھی نہیں نکلا۔

مسز بنرجی ان کی یہ حالت دیکھ کر گھبرا گئیں۔

''کیا ہوا............؟ طبیعت تو ٹھیک ہے......؟''

''کچھ نہیں، طبیعت صبح ہی سے ٹھیک نہیں......''

دلیپ سین نے فوراً اپنے آپ کو سنبھالا اور ایک لمحے میں فیصلہ کیا کہ ابھی انہیں کیا کرنا چاہئیے......''

''سگائی بہت بہت مبارک ہو، بھگوان زندگی کی ساری خوشیاں آپ کی جھولی میں بھر

دے، حالانکہ افسوس ہے، میں شادی میں شریک نہیں ہوسکوں گا............''

''کیوں......؟''

دلیپ سین کو نارمل دیکھ کر مسز بنرجی کو کسی حد تک سکون ہوا۔

''اگلے ہفتے باہر جا رہا ہوں۔ یہاں کی نوکری سے جی نہیں بھرتا، دنیا بہت بڑی ہے، اس میں کوئی اور راستہ ڈھونڈوں گا............''

اب دلیپ سین مکمل طور پر اپنے آپ پر قابو پا چکے تھے، دیکھتے ہی دیکھتے انہوں نے اپنی آئندہ زندگی کے سارے پروگرام بھی مرتب کر لئے۔

مسز بنرجی کے شریکِ زندگی بھی انہیں کی طرح ایک قابل ڈاکٹر تھے۔ کم عمری ہی میں انہوں نے اپنے میدان میں کئی کارہائے نمایاں انجام دے ڈالے تھے۔ کئی قومی اور عالمی رسالوں میں ان کے ریسرچ پیپر چھپے تھے اور ان کا بے انتہا روشن مستقبل سب کی آنکھوں کو چندھیا رہا تھا۔ مسز بنرجی بھی ایک قابل رشک لائف پارٹنر کو پا کر اپنی قسمت پر نازاں تھیں۔ ان کی جوڑی ہر اعتبار سے آئیڈیل تھی۔ دونوں نے نہایت خوشی خوشی زندگی کی کامیاب سیڑھیاں طے کرنا شروع کر دیں۔ اپنے قوت بازو پر بھروسہ کرتے ہوئے سرکاری نوکری سے استعفیٰ دے کر انہوں نے ایک نجی اسپتال کی بنیاد رکھی۔ دونوں کی ملی جلی کاوشوں سے اسپتال نہ صرف مضبوط بنیادوں پر قائم ہو گیا بلکہ اس نے دن دونی رات چوگنی ترقی کر کے نہ صرف شہر بلکہ ریاست کے ایک بے حد قابل اعتبار شفاخانہ کا درجہ حاصل کر لیا۔

مسز بنرجی گھریلو اور ازدواجی زندگی کے محاذ پر بے حد کامیاب رہیں۔ دونوں بیٹے بھی اپنے والدین کے پیشے میں داخل ہوئے اور تیزی سے ترقی کے منازل طے کرتے ہوئے اعلیٰ تعلیم کے لئے غیر ممالک چلے گئے۔ بیٹی سب سے چھوٹی تھی، اس کی تعلیم انہوں نے شہر ہی کے اعلیٰ تعلیمی اداروں میں، اپنی نگرانی ہی میں دلانے کا فیصلہ کیا۔ مسز بنرجی کی صحت اور جوانی کو دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ تین بچوں کی ماں ہیں۔ ان کا جسم اب بھی شاداب تھا، بالوں میں

دور دور تک چاندی دکھائی نہیں دیتی تھی۔ آواز میں بقول دلیپ سین کے اب بھی وہی موسیقیت اور آنکھوں میں کسی جھیل سے زیادہ گہرائیاں موجود تھیں۔ ایک بے حد مصروف اور پرشور زندگی کے درمیان کبھی کبھی انہیں تنہائی کا احساس ہوتا۔ تنہائی تو بڑے اطمینان سے چوکڑی مار کے بیٹھی رہتی۔ البتہ احساس کو وہ اپنے سے دور رکھنے کی پوری کوشش کرتیں۔ اس کوشش میں وہ کبھی کامیاب بھی ہو جاتیں، مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس احساس پر ان کی گرفت اب کمزور ہوتی جا رہی تھی۔ ڈاکٹر بنرجی نے اپنی پسند کی جس دنیا کی تخلیق کی تھی، اس میں وہ بہت مگن تھے، مصروفیات بڑھتی جا رہی تھیں۔ دولت چھپر پھاڑ کے برس رہی تھی۔ اسپتال روز افزوں ترقی پر تھا۔ اس کی کئی شاخیں قائم ہو گئی تھیں، درجنوں ڈاکٹر کام کر رہے تھے۔ ڈاکٹر بنرجی پیچیدہ اور مشکل آپریشن خود ہی کرتے۔ مریضوں کو ان پر بہت اعتماد تھا۔ اگر چہ وقت اور فیس کے لحاظ سے وہ ہر کسی کی پہنچ سے باہر تھے۔ جو آپریشن ڈاکٹر بنرجی سے بچ جاتے، انہیں مسز بنرجی انجام دیتیں۔ ان کے کئے ہوئے آپریشن بھی شوہر ہی کی طرح اکثر ناکام نہیں ہوتے تھے۔ وہ دونوں اب اتنے مشہور ہو گئے تھے کہ دور دراز کے شہروں سے بھی منہ مانگی فیس پر ان کی مانگ ہوتی، یہاں تک کہ کچھ ترقی پذیر ملکوں میں بھی انہیں بلایا جانے لگا تھا۔ اس مصروفیت اور شہرت نے دونوں کو اس قابل نہیں رکھا کہ ایک دوسرے سے جی بھر کے باتیں بھی کر سکیں۔ وہ شب گزاری بھی کرتے تو اتنے تھکے ہوتے کہ نیند کے سوا ان پر کچھ اور طاری نہیں رہتا تھا۔ کبھی کبھار باتیں کرنے کا موقع بھی ملتا تو اپنے پیشے اور علمِ طب سے متعلق بہت سے رموز و نکات جو تنہا کسی سے حل نہیں ہو پاتے تھے، دونوں مل جل کر حل کرنے کی کوشش کرتے۔ یہ آپس کی کوششیں بھی ان کی ترقی کے زینوں میں سے ایک زینہ ہی تھا جو انہیں مزید اوپر لے جاتا۔ ڈاکٹر بنرجی کبھی اتنے تھکے ہوتے کہ آرام دہ بستر، سکون اور بیوی کی رفاقت سے انہیں چین نہ ملتا تو وہ دو چار کھونٹ مے ناب کا بھی سہارا لے لیتے۔ مسز بنرجی کو اس سے کوئی شغف نہیں تھا۔ شوہر کے اصرار پر بھی وہ اسے منہ نہ لگاتیں اور تب وہ رات ان پر بھاری ہو جاتی۔ ڈاکٹر بنرجی تو دنیا و مافیہا سے بے خبر،

نیند کی آغوش میں کھو جاتے اور وہ کروٹ پر کروٹ بدلتی رہتیں۔ اس وقت طرح طرح کے خیالات ان کے ذہن کو اپنی آماجگاہ بنا لیتے۔ ان کے اندر بیٹھا ہوا کوئی ان کے ہاتھوں میں ایک رجسٹر تھما دیتا...... کیا کھویا، کیا پایا......؟

پایا تو انہوں نے بہت کچھ تھا، ایک خوشحال گھر، ایک آئیڈیل شوہر، آنکھوں کی ٹھنڈک بخشنے والے بچے، دولت کی فراوانی، جس سے دنیا کی ہر چیز خریدی جا سکتی تھی، اگر چہ اس دولت سے لطف اُٹھانے والے لمحات کو بخشنے میں خاص کنجوسی برتی گئی تھی، قدموں کو چومتی ہوئی شہرت، پیشے کی آسودگی وغیرہ وغیرہ۔

کھونے کی فہرست مرتب کرنا آسان نہیں تھا۔ انہیں احساس تو تھا کہ انہوں نے کچھ کھویا بھی ہے مگر اس احساس کو کوئی معنی پہنانا اور عنوان دینا ان کے بس میں نہیں تھا۔ یہ ان کی کہانی کا وہ علامتی حصہ تھا جس کی تفہیم و ترسیل کی کوشش میں ان کا سارا وقت گزر جاتا، ہاتھ کچھ نہ آتا۔

شوہر نے کبھی انہیں کوئی شکایت کا موقع دیا..........؟

ہر گز نہیں..........ان کی یادوں کی ٹوکری میں پھول ہی پھول بھرے تھے، ایک چھوٹا، بہت ہی چھوٹا سا کانٹا بھی ڈھونڈنے سے نہیں ملتا۔ پچیس چھبیس سالہ ازدواجی زندگی کا یہ حیرت انگیز واقعہ تھا۔ ڈاکٹر بنرجی نے نہ صرف پھولوں کی ٹوکری میں بھولے سے بھی کوئی کانٹا نہیں رکھا بلکہ ان کی تعریف میں ہمیشہ رطب اللسان رہے۔ تعریف ان کی قابلیت کی، پیشے کے تئیں ان کے لگن کی، بہترین انتظامی صلاحیت کی، ان کی بے پناہ ذہانت کی، حالات کو فوراً سمجھ لینے اور ان کا سامنا کرنے کی..........اور بھی بہت کچھ..........

مسز بنرجی کو محسوس ہوتا کہ دینے والے نے نہ صرف انہیں بہت کچھ دینے میں بے پناہ فراخ دلی سے کام لیا بلکہ شاید اپنی عنایات کی تکمیل بھی کر دی ہے۔ جس کا لائف پارٹنر ہی، وہ بھی اپنے میدان کا مردِ خاص، اس کا اس قدر معترف ہو، اسے پھر اور کیا چاہیئے؟ کچھ بھی نہیں۔

لیکن نہیں..........شاید انہیں کچھ اور بھی چاہیئے تھا۔ بیچ بیچ کے فرصت کے لمحات میں

وہ اس راز تک پہنچنے کی کوشش کرتیں۔ لیکن فرصت کے لمحات بھی ٹکڑوں ٹکڑوں میں انہیں نصیب ہوتے تھے، اس لئے راز بھی ٹکڑوں ہی میں ان کی دست رُس میں آتا۔ جس سے کسی واضح معنی تک پہنچنے میں انہیں ناکامی ہوتی۔

کبھی کبھی مسز بنر جی کو افسردہ دیکھ کر اور کوئی وجہ نہیں جاننے پر ڈاکٹر بنر جی نے انہیں نہایت سادہ لوحی سے مشورہ دیا کہ فرصت کے اوقات میں وہ کچھ سماجی سرگرمیوں میں حصہ لیں بلکہ اس کے لئے الگ سے وقت نکالیں۔ مشورہ انہیں پسند آیا اور وہ کبھی کبھار ان تقریبوں میں شریک ہونے لگیں جن کے دروازے انہوں نے برسوں سے اپنے آپ پر خود ہی بند کر رکھے تھے۔ رشتہ داروں، دوستوں، پڑوسیوں، ملنے جلنے والوں سے ان کا رابطہ تقریباً ختم ہو چکا تھا اور صرف ڈاکٹر ہو کے رہ گئی تھی...... بے حد مصروف، قابل ڈاکٹر۔

سماج میں آنے کے بعد مسز بنر جی کو ایسا لگا جیسے وہ بند کمرے سے نکل کر کھلی فضا میں آ گئی ہوں۔ یوں بند کمرے میں انہیں کوئی تکلیف نہیں تھی۔ دنیا کے سارے عیش و آرام موجود تھے، بس کمرہ بند تھا جب کہ کھلی فضا میں وسعت ہی وسعت تھی، گرم اور ٹھنڈی ہوائیں تھیں اور فطرت سے لطف اندوز ہونے کے سارے مواقع مہیا تھے۔

ایک سماجی اور ثقافتی تنظیم حسن کے مقابلے کا اہتمام کر رہی تھی۔ انہوں نے انہیں ایک جج کی حیثیت سے مدعو کیا۔ کئی ججوں کے ساتھ وہ بھی بیٹھیں، مگر ایک عجیب بات یہ ہوئی کہ کوئی لڑکی بھی انہیں اس معیار کی حسین نظر نہیں آئی جس کے سر پر حسین ترین کا تاج رکھا جاتا، جب کہ دوسرے ججوں کے سامنے حسن کو جانچنے کے کچھ اپنے پیمانے تھے، اس پیمانے پر جو لڑکی پوری اترتی، اس کے سر پر تاج رکھ دینا تھا۔ پیمانے پر ایک نمبر، دو نمبر اور تین نمبر کی لڑکیاں اتر آئیں اور ان کا انتخاب بھی ہو گیا، لیکن مسز بنر جی کو پیمانے ہی پسند نہیں آئے شاید پہلی بار انہیں اپنے بارے میں یہ جانکاری ہوئی کہ ان کے پاس بھی حسن کا ایک معیار ہے...... جو طے شدہ پیمانے تھے، ان سے بالکل مختلف، انتخاب اکثریت کی رائے سے ہونا تھا۔ سو ہوا، مسز بنر جی کی رائے

کی کوئی اہمیت نہیں رہی۔ واپس آ کر اتفاق سے قد آدم آئینے پر ان کی نگاہیں پڑ گئیں تو وہ چونک اٹھیں۔ اچانک انہیں پتہ چلا کہ ڈھلتی عمر میں بھی وہ بہت حسین ہیں اور ان کا اپنا جو حسن کا معیار ہے، اس پر پوری اترتی ہیں۔ وہ جوانی میں ایسے مقابلوں میں حصہ لیتیں تو یقیناً پہلے نمبر کا تاج انہیں کے سر پر رکھا جاتا۔ مگر مشکل یہ تھی کہ جب جوانی تھی تب وہ ان چیزوں سے بہت دور تھیں۔ یہ ساری چیزیں انہیں احمقانہ لگتیں بلکہ وہ اس قسم کی گفتگو کرنے والوں کو حقارت سے دیکھتی تھیں۔

انہیں محسوس ہوا کہ وہ ایک ایسی دلکش کتاب ہیں جس کے اوراق کھولے ہی نہیں گئے، کتاب بند کی بند رہ گئی۔ یہ بند کتاب ان کے والدین کے ہاتھوں سے منتقل ہو کے ان کے شوہر کے ہاتھوں میں چلی گئی، وہاں اس کتاب کو بھرپور محبت اور بہت احترام ملا اور وہ گھر کے سب سے اونچی طاق پر رکھی گئی۔

یہی وہ موقع تھا جب انہیں دلیپ سین بہت یاد آئے اور آتے چلے گئے۔ ان کے اڑتے ہوئے جملے کیا کہتے تھے..........؟ انہوں نے اس وقت ان جملوں کو پکڑا ہی نہیں، ایک کان سے سن کر دوسرے سے اڑا دیا، ان کا مضحکہ اڑایا۔ اب یہی جملے انہیں کتنے اچھے لگ رہے تھے۔ انہوں نے ان کے ٹکڑوں کو جوڑ کر ایک بڑا جملہ بنایا۔ تب انہیں محسوس ہوا کہ بند کتاب کو کھولنے کا یہ کتنا پر اثر منتر ہے۔ وہ برسوں پہلے ادا کئے گئے ان جملوں کی سرسراہٹ اپنے کانوں کے پردے پر محسوس کرتیں تو ان پر ایک عجیب کیفیت طاری ہو جاتی۔

اپنے پیشے سے ان کا دل اچاٹ ہونے لگا، وہ زیادہ وقت اپنے آپ کو دینے لگیں، گھنٹوں آئینے کے سامنے کھڑا رہنا، بناؤ سنگار، طرح طرح سے اپنے آپ کو سنوارنے کی کوشش، شوخ اور بھڑک دار کپڑوں کا انتخاب......ڈاکٹر بنرجی نے انہیں تشویش بھری نگاہوں سے دیکھا، اسپتال کا بڑا حرج ہو رہا تھا، مریضوں کو صرف ان پر اور مسز بنرجی پر اعتماد تھا، وہ دوسرے ڈاکٹروں سے اپنا علاج نہیں کروانا چاہتے تھے وہ انہیں منہ مانگی فیس دینے کو تیار رہتے، مسز بنرجی ایک

بہترین منتظم کار بھی تھیں۔ ان کی بے توجہی سے انتظام پر بھی اثر پڑا۔ ان کی عدم دلچسپی سے ڈاکٹر بنرجی پر بھی کام کاج کا بوجھ بہت بڑھ گیا۔ وہ دیگر امور کی طرف توجہ نہیں دے رہے تھے۔ مسز بنرجی میں تبدیلی کی وجہ ان کی سمجھ میں نہیں آتی تھی ۔ وہ بیمار بھی نہیں تھیں، پھر وہ اچانک الگ الگ سی کیوں ہوگئی تھیں............؟

ان کی پوری زندگی تو جیسے اندھادھند طوفان میں گھرے ہوئے ایک سفر میں گزری تھی۔ اس وقت ایک لمحہ کے لئے بھی یہ خیال نہیں آیا کہ بے حد کسی ہوئی زندگی میں سے کچھ لمحے بھی ایسے کشید کئے جائیں جو بالکل اپنے ہوں، ان میں کسی کا دخل نہیں ہو، ان لمحوں سے جو رس نچوڑے جائیں، ان کی مٹھاس زندگی کو جاوداں کردے، اس عالم میں موت بھی آجائے تو وہ بھی بہت پیاری لگے۔

اچانک مسز بنرجی کو خیال آیا۔

''کیوں نہ ہم لوگ کچھ دنوں کے لئے لمبی چھٹی پر چلے جائیں............؟''

ڈاکٹر بنرجی بھونچکے رہ گئے۔ بے ساختگی کے عالم میں ان کے منہ سے بس یہی نکل سکا:

''چھٹی پر............؟ کہاں............؟''

''کہیں بھی .... کسی پہاڑ پر، کہیں دور دراز شہر میں، سمندر کے کنارے، برف سے ڈھکے ہوئے مرغ زاروں میں............''

مسز بنرجی یوں بول رہی تھیں جیسے خواب میں ہوں۔ ڈاکٹر بنرجی کی تشویش بڑھ گئی۔ انہوں نے کچھ سوچا، پھر بولے۔

''آپ جانتی ہیں، آپ کیا کہہ رہی ہیں ....؟ مہینوں قبل سے آپریشن کی تاریخیں طے ہوجاتی ہیں۔ پیشگی ادائیگی کردی جاتی ہے، سینکڑوں مریض لائن میں لگے رہتے ہیں، آپ کا بوجھ بھی میرے اوپر آپڑا ہے، ایسے میں............''

انہوں نے جان بوجھ کو جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ وہ جانتے تھے، وہ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں،

اس کی ترسیل ہوگئی ہے۔ مسز بنرجی فوراً بولیں۔

''مان لیجئے، ہم اچانک مرجائیں...........؟''

''تو......تو......اتفاق پر تو کسی کا اختیار نہیں ہوتا......''

ڈاکٹر بنرجی کو شاید زندگی دینے والے کے منہ سے یہ بات اچھی نہیں لگی۔ مگر جواب تو دینا ہی تھا۔

''پھر ہمارا چھٹی پر جانا اتفاق کیوں نہیں سمجھا جائے گا...........؟''

مسز بنرجی نے تیکھی نگاہوں سے انہیں دیکھا۔ ڈاکٹر بنرجی ان نگاہوں کی تاب نہیں لا سکے اور اُٹھ کر چلے گئے۔ یوں بھی انہیں یہ موضوع بہت اٹ پٹا لگ رہا تھا، وہ احساس ذمہ داری کے بوجھ سے دبے ہوئے تھے، ایسے میں اپنی تفریح کے لئے چھٹی پر جانا انہیں خود غرضی کی بات لگ رہی تھی۔ اب وہ مسز بنرجی سے کیا کہتے۔ تنہا چلے جانے کو تو کہہ نہیں سکتے تھے۔ شاید یہ فیصلہ مسز بنرجی خود کرتیں تو انہیں اعتراض بھی نہیں ہوتا۔

مسز بنرجی نے اپنے شوہر کے بارے میں سوچا، انہیں افسوس ہوا۔ اتنے ذہین اور قابل ہونے کے باوجود ابھی تک وہ زندگی کے معنی نہیں سمجھ سکے۔ زندگی صرف دوسروں کی تو نہیں ہوتی اس میں کچھ حصہ اپنا بھی تو ہوتا ہے، اپنے حصّے کو چھوڑ دینے کا مطلب ہے اپنے ہی ساتھ حق تلفی......ڈاکٹر بنرجی دنیا بھر کے مریضوں کا علاج کرتے ہیں، ان کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ شکل دیکھتے ہی مریض کی تشخیص کر لیتے ہیں بلکہ اس کی تہہ تک پہنچ جاتے ہیں، مگر یہ کیسی قابلیت ہے کہ وہ اپنے ہی مرض کو نہیں جانتے۔ ویسے مسز بنرجی خود بھی اپنے مرض کے بارے میں نہیں جانتی تھیں۔ مگر ڈاکٹر بنرجی کو اپنے سے بڑا ڈاکٹر مانتی تھیں اور ڈاکٹر بنرجی۔

ایسے میں انہیں دلیپ سین کے ساتھ گزارے لمحات بہت یاد آئے۔ وہ ایسے تاریخی لمحے نہیں تھے جنہیں یادگار کا درجہ دیا جاتا۔ انہیں اپنی مصروف اور بظاہر بے حد کامیاب زندگی میں وہ لمحے کبھی یاد بھی نہیں آئے۔ دلیپ سین کبھی کبھی ضرور یاد آجاتے، ایک مہربان دوست کی

صورت۔ مگر اب جو دلیپ سین یاد آئے تو ایک بڑی ضرورت بن کر۔ انہیں محسوس ہوا کہ کسی طرح وہ لمحے پھر سے حاصل ہو جائیں تو ان میں بسے ہوئے دلیپ سین کے چند بے ضرر سے جملے انہیں کتنا سکون پہنچائیں۔ مگر دلیپ سین کو کہاں ڈھونڈا جا سکتا تھا۔ ان سے تو برسوں سے کوئی رابطہ ہی نہیں تھا۔ صرف یہ پتہ تھا کہ وہ کہیں چلے گئے تھے۔ کہاں؟ کچھ پتہ نہیں۔ انہیں اپنے آپ پر بہت غصّہ آیا۔ یہ کیسی دوستی اور کیسا تعلق کہ انہوں نے ان کے بارے میں کوئی جانکاری نہیں رکھی۔ اتنے دنوں ان کی یاد بھی نہیں آئی۔ اب یاد بھی آئی تو اپنی غرض سے۔ دلیپ سین سے ان کا کوئی تعلق نہیں رہا تو شاید یہ ان کے لئے واجب تھا کہ ایک شادی شدہ عورت کا کسی غیر مرد سے تعلق بنائے رکھنے کا جواز............؟

دلیپ سین کے منہ سے ان کے لئے جو چند اڑتے ہوئے جملے نکلے تھے تو وہ تو جیسے اسی وقت ان کے سر سے پھسلتے ہوئے کہیں گم ہو گئے تھے۔ اتنے دنوں ان کا کبھی خیال ہی نہیں آیا۔ مگر انہیں کیا پتہ تھا کہ وہ اڑتے ہوئے جملے کہیں گم نہیں ہوئے تھے، کہیں محفوظ ہو گئے تھے اور اب انہیں کتنا سہارا دے رہے تھے۔ کبھی کبھی انہیں محسوس ہوتا کہ دلیپ سین کے آدھے ادھورے جملے ہواؤں، فضاؤں اور پرندوں کی بولیوں میں بس گئے ہیں اور ان کی زبانی ان کے اندر پہنچ رہے ہیں اور ان کے جسم میں گدگدی کر رہے ہیں۔ انہیں یہ جملے اپنے چاروں طرف ناچتے ہوئے محسوس ہوتے۔ تنہائی کے لمحوں میں تو یہ بے حد پریشان کرتے۔ ان کا سکون غارت ہو جاتا اور وہ سب چھوڑ چھاڑ کر بس اس تگ و دو میں لگ جاتیں کہ ان کے کانوں میں یہ جملے کیسے آ گئے ہیں، کون انہیں ڈال گیا۔ وہ بھاگم بھاگ اس کا پتہ لگانے کی کوشش کرتیں کہ وہ ہے کون جو......

سماجی سرگرمیوں میں سرگرم ہونے کا انہیں بے سان وگمان فائدہ یہ پہنچا کہ ایک محفل میں اچانک ایک اجنبی ان کے روبرو آ کھڑا ہوا۔

"دلیپ سین.........؟"

وہ اتنے زور سے اچھلیں کہ یہ کیفیت اندرونی نہ ہوتی تو وہ یقیناً گر جاتیں۔

دلیپ سین .... وہ دلیپ سین کے بارے میں سوچتی تو رہی تھی، ان کے آدھے ادھورے اڑتے ہوئے جملے ان کے کانوں اور حواس پر پڑ کر انہیں کتنا سہارا دیتے رہے تھے، مگر یہ انہوں نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ ان سے کبھی ملاقات بھی ہو جائے گی۔

انہوں نے غور سے دلیپ سین کو دیکھا۔ پہلی نظر میں انہیں پہچان پانا تقریباً ناممکن تھا۔ انہوں نے داڑھی بڑھالی تھی، سر کے بال بھی بڑھ آگئے تھے، اس پر ستم یہ کہ سارے بال سفید، آنکھوں میں غیر معمولی موٹے فریم کا چشمہ تھا، وہ یوروپ کی کسی یونیورسٹی میں پروفیسر تھے۔ خدوخال تو ان کے سارے کے سارے دلیپ سین ہی کے تھے مگر وہ دلیپ سین جو انہیں یاد تھے وہ کہیں دکھائی نہیں دیئے۔ مگر وہ کیا کر سکتی تھیں، اس دلیپ سین کو کہاں ڈھونڈنے جاتیں۔ چند رسمی باتوں کے بعد انہیں اور کچھ نہیں سوجھا تو انہوں نے انہیں اپنے ساتھ چائے پینے کی دعوت دی۔

ریستوراں میں اتفاق سے ایک خالی کیبن بھی مل گیا۔ انہوں نے چائے کے ساتھ کافی لوازمات کے آرڈر بھی دیئے، آخر ایک دیرینہ دوست کی ضیافت جو کرنا تھی، ان کے ساتھ کچھ وقت گزارنا بھی مقصود تھا۔

دلیپ سین دنیا بھر کی باتیں کرتے رہے۔ کئی ممالک میں اپنا بہترین وقت گزارنے کی، زندگی میں پیش آئے دلچسپ لطیفوں کی، طرح طرح کے آدمیوں سے پڑنے والے تجربات کی، اپنی ایک شادی کی، پھر دوسری شادی کی، پھر تیسری .... تینوں شادیوں سے پیدا ہوئے بچوں کی، تمام بچوں کی تعلیم و تربیت، ان کی شرارتیں، ان کے دلچسپ واقعات......

دلیپ سین اس طرح بول رہے تھے جیسے ٹیپ ریکارڈ لگا دیا گیا ہو، کہیں پر کوئی کوما فل اسٹاپ وغیرہ نہیں۔ وہ بالکل مبہوت ہو کر انہیں سُن رہی تھی، انہیں بولنے کا موقع ہی نہیں مل رہا تھا۔ دلیپ سین کو اس کی بالکل پرواہ نہیں تھی، شاید انہیں اس کا احساس ہی نہیں تھا کہ وہ مسز بنرجی ان کے سامنے بیٹھی ہیں جن کے ساتھ ان کے کچھ خوبصورت لمحات گزرے ہیں۔ جن

کے ساتھ وقت گزارنے کے وہ ہمیشہ متمنی رہتے تھے۔ وہ مسز بنرجی ....جن کے رعب حسن سے ان کی زبان گنگ ہو جاتی تھی اور ان کے منہ سے بے رابطہ آدھے ادھورے جملے ادا ہونے لگتے تھے۔ انہیں اس کی فکر بھی نہیں تھی کہ سامنے کی میز پر چائے اور اس سے قیمتی لوازمات سجے ہوئے ہیں۔ گرم گرم چائے کا پاٹ دوبار واپس جا چکا ہے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ شاید انہیں بہت دنوں سے کچھ بولنے کا موقع نہیں ملا تھا، یا شاید انہیں مسز بنرجی جیسا سننے والا نصیب نہیں ہوا۔ وہ اپنے اندر کے سارے غبار کو ایک بار ہی نکال دینا چاہتے تھے۔

وہ ان کے لمحہ بھر کو رکنے کا انتظار کرتی رہیں۔ یہ بھی سوچتی رہیں کہ اگر انہیں کچھ کہنا پڑا تو کیا کہیں گی..........؟ غیر ممالک میں کچھ وقت انہوں نے بھی گزارا تھا۔ لیکن وہ کوئی قابلِ ذکر وقت نہیں تھا۔ ان کی زندگی میں ایسے واقعات پیش ہی نہیں آئے تھے جنہیں وہ لطیفے کے طور پر یاد رکھتیں اور بیان کرتیں۔ طرح طرح کے آدمیوں سے ان کا واسطہ بھی پڑا تھا۔ مگر اس سے ان کے تجربات میں کوئی خاص اضافہ نہیں ہوا تھا۔ ان کی بس ایک ہی شادی ہوئی تھی اور یہ کوئی ایسی بات نہیں تھی کہ اسے کوئی رنگ دے کر بیان کیا جا سکے۔ تعلیم و تربیت ان کے بچوں نے بھی حاصل کی تھی مگر یہ عمل بالکل نارمل تھا۔ شرارتیں ان کے بچوں نے بھی کی تھیں لیکن وہ صرف ان کی یادوں میں محفوظ تھیں اور وہ اس کو کسی دوست کے ساتھ شیئر نہیں کرنا چاہتی تھیں۔ حقیقت یہ تھی کہ ان کے پاس کہنے کو کچھ تھا ہی نہیں، وہ بس سننا چاہتی تھیں۔ وہ سب نہیں جو دلیپ سین سنا رہے تھے بلکہ وہ ان سے کچھ اور سننے کی متمنی تھیں۔ مگر یا تو دلیپ سین وہ سب سنانا نہیں چاہتے تھے یا وہ باتیں بھول گئے یا پتہ نہیں کیا بات تھی۔

آخر دو گھنٹوں کی یہ صحبت کسی طرح ختم ہوئی۔ مسز بنرجی نے محسوس کیا کہ انہوں نے دلیپ سین کی صحبت سے کوئی خاص لطف نہیں اٹھایا، کسی حد تک وہ بور ہی ہوئیں، پھر بھی وہ انہیں آسانی سے ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہتی تھیں۔ انہوں نے دلیپ سین کو اپنے گھر چائے پر مدعو کیا، جسے انہوں نے بخوشی قبول کر لیا۔ اسی وقت مسز بنرجی کا لگا کہ دلیپ سین کے پاس کہنے کو

ابھی کچھ باقی ہے۔ وہ جی جان سے اس وقت کی تیاری میں لگ گئیں۔ پکوان جو دلیپ سین کو پسند تھے، یاد کر کر کے انہوں نے تیار کرائے، ان کا گھر خاص طور پر ڈرائنگ روم یوں بھی سجا سجایا رہتا تھا پھر بھی انہوں نے اس کو کچھ خاص ٹچ دینے کی کوشش کی۔ رسمی طور پر انہوں نے ڈاکٹر بنرجی کو اس موقع پر موجود رہنے کو بھی کہا۔ گو وہ دل سے نہیں چاہتی تھیں کہ وہ موجود رہیں۔ اس موقع پر کبھی کبھی بھگوان کو یاد کرنا انہیں بہت کام آیا۔ ڈاکٹر بنرجی کو شہر کے ایک بڑے اسپتال نے ایک نہایت پیچیدہ آپریشن کے لئے قبل سے ہی بک کر رکھا تھا۔ ڈاکٹر بنرجی سے انہیں کوئی اندیشہ تو نہیں تھا پھر بھی وہ اپنی ہی دنیا کے آدمی تھے۔ انہیں مرض، مریض اور ان کے علاج کے آگے کچھ سوجھتا ہی نہیں تھا۔ وہ یہاں بور ہی ہوتے۔

مسز بنرجی نے بناؤ سنگار پر عام دنوں سے کچھ زیادہ ہی دھیان دیا۔ انہیں یاد تھا کہ دلیپ سین کو کون سا رنگ پسند ہے اور کون سی خوشبوئیں۔ وہ اہتمام میں اتنا مشغول ہوئیں کہ اس وقت تک ان کی تیاری مکمل نہیں ہو سکی کہ دلیپ سین آ گئے۔ انہیں کچھ دیر انتظار میں بیٹھنا پڑا۔ مسز بنرجی نے اپنے تئیں مطمئن ہو کر قد آدم آئینہ پر آخری نگاہ ڈالی۔ دلیپ سین تو کیا، کوئی ذی ہوش اب ان سے بھاگ نہیں سکتا تھا اور تقریباً یہی ہوا بھی، وہ ڈرائنگ روم میں داخل ہوئیں تو دلیپ سین کی آنکھیں چمک اُٹھیں، ہونٹ کچھ بولنے کے لئے کپکپا اُٹھے، ان پر جب بھی کبھی جذباتی یلغار ہوتا، ان کی یہی کیفیت ہوتی تھی۔ اتفاق سے اسی وقت مسز بنرجی کی جواں سال بیٹی کالج سے لوٹی اور بے دھڑک ڈرائنگ روم میں داخل ہو گئی۔ دلیپ سین کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

''اوہ، ونڈر فُل بیوٹی.........وہاٹ آ ایم سیئنگ.........!''

مسز بنرجی نے بیٹی کو دیکھا، بیٹی نے ماں کو۔ بیٹی کے چہرے پر ایک سرخی سی دوڑ گئی۔ مسز بنرجی کو محسوس ہوا کہ ان کی ساری نامعلوم بے چینی اور سارا ٹینشن اندر ہی اندر تحلیل ہوتے جا رہے ہیں۔

............OO............

بکسا

امی ہمیشہ بکس کو بکسا کہا کرتی تھیں۔

بچے جب کم عمر تھے اور اسکول کی ابتدائی کلاسوں میں جایا کرتے تھے تو ایک بار بڑے بھیا نے انہیں ٹوکا تھا ''امی بوکس (Box) کہا کرو، یہ بکسا کیا ہوا بھلا؟''

امی نے کہا ''بکس کہنے سے کیا فرق پڑتا ہے۔ چلو کہہ لیا بکس۔ اب خوش!''

چھوٹی بڑی دونوں بیٹیوں نے بیک زبان کہا ''امی تم تو وہی کہا کرو 'بکسا' اب یہ 'بکس' تو اور بھی ....'' شاید وہ کہنا چاہتی تھی دیہاتی، گنوار نامانوس............'' لیکن رک گئی تھیں اس لئے کہ اب سے کوئی پچیس چالیس سال پہلے والدین اور بچوں کے درمیان حد ادب کچھ حد تک برقرار تھی۔

امی ہنسنے لگی تھیں ''ارے بھائی ہم تو بکسا ہی جانتے ہیں۔ وہ تو تمہیں خوش کرنے کو کہہ دیا تھا۔ اب یہ تمہاری طرح منہ پھیلا کے پھر اسے گول کر کے کون بولے بو...... او...... کس۔''

وہ سب کے سب خوشگوار جاڑوں میں انگیٹھی کے گرد بیٹھ کر مونگ پھلیاں کھاتے، بھوبل میں شکرقندیاں بھننے کا انتظار کرتے، خوش دلی سے ہنسنے لگے تھے ''امی ذرا پھر سے تو کہنا بو......او......کس۔''

اور آج وہ سب امی کے بکسے کے گرد دائرہ بنائے اسی طرح بیٹھے تھے جیسے کبھی جاڑوں میں انگیٹھی یا تسلے میں جلتی آگ کے گرد بیٹھا کرتے تھے یا باورچی خانے میں بچھی پیڑھیوں پر امی کی جھپا جھپ اترتی، باریک پھولی چپاتیوں کا اپنی اپنی رکابی میں باری باری تھپ سے رکھے جانے کا انتظار کرتے۔ پھر کوئی بچہ بیچ سے روٹی کی دو پرتیں الگ کر کے باریک پرت کو آنکھوں سے لگا کر دیکھتا کہ باہر دکھائی دے رہا ہے یا نہیں اور امی سے ڈانٹ سنتا............! ''کھانا کھا رہے ہو یا کھیل کر رہے ہو۔ چلو جلدی چھٹی کرو۔''

ابا کی کپڑوں کی دکان تھی۔ وہ دوپہر کے کھانے کے لئے ذرا دیر سے آتے۔ امی بچوں کو کھلا لیتیں اور خود ان کا انتظار کرتیں۔ ان کے ہاتھ دھلاتیں، کھانے کے دوران دست بستہ کھڑی رہتیں۔ پھر دوبارہ ابا کے ہاتھ دھلا کر انہیں خلال دے کر برتن سمیٹتیں اور خود کھانے بیٹھتیں۔ اکثر ساڑھے چار بج جایا کرتے تھے۔ اکثر وہ رات کا کھانا برائے نام کھاتیں اس لئے کہ بقول ان کے دوپہر کا کھانا ابھی چھاتی پر دھرا ہوتا تھا۔

اس وقت وہ پانچوں ساتھ ساتھ تھے۔ اب دسوں دشاؤں سے گھوم کر آئے تھے۔ کوئی قریب سے کوئی دور سے۔ بڑی آپا نے بکس کھول رکھا تھا۔ اوسط سے بڑا پیتل کے قبضوں والا، امی کے جہیز میں ساتھ آیا بکس جسے وہ بکسا کہنے پر مصر رہا کرتی تھیں اور اب وہ گھر کی وہ واحد شے تھا جو بلا شراکت غیرے امی کی کہی جا سکتی تھی ورنہ وہ اپنا سارا کچھ بانٹ چکی تھیں یہاں تک کہ اپنا وجود بھی۔ اس کی ظاہری صورت بڑی پراسرار تھی یا زمانے سے گزرنے کی وجہ سے ایسی ہو گئی تھی جیسے الف لیلہ کی کہانیوں سے نکل کر آیا ہو۔ پرانی چیزوں کا کوئی رسیا اس کے اچھے دام لگا سکتا تھا۔ نہ جانے پرانی ہو کر چیزیں زیادہ قیمتی کیوں ہو جاتی ہیں۔ بڑی آپا نے کہا تھا۔

''آؤ بھائی سب لوگ بیٹھ جاؤ، پھر کوئی کچھ کہے نہیں۔''

''کیا کہے گا کوئی آپا؟'' چھوٹا بھائی قدرے جھنجھلا کر بولا تھا۔

''بلاوجہ کی بات۔''

''آج کل کسی کا کوئی ٹھکانہ نہیں۔کوئی کیا سوچ لے، پھرتم دونوں کی بیویاں نہیں آئی ہیں۔اس لئے دونوں بھائی تو ضرور بیٹھیں۔'' منجھلی بہن نے بڑی کی طرفداری کی۔

''آپا ٹھیک کہہ رہی ہے۔''

بڑی آپا کی آنسوؤں سے لبریز بڑی بڑی آنکھیں جھپکیں۔بسم اللہ کہہ کر انہوں نے کپڑوں کی پہلی تہہ اُٹھائی۔روزمرہ پہنے جانے والے پانچ چھ جوڑے تھے۔کثرتِ استعمال سے قدرے پھیکے پڑے ہوئے۔درمیان میں سلیقے سے تہہ کئے ہوئے سفید دوپٹے رکھے ہوئے تھے۔ابا کے انتقال کے بعد سے امی نے رنگین دوپٹے اوڑھنا بند کردئے تھے گرچہ کپڑے ہلکے رنگوں والے پہن لیا کرتی تھیں لیکن دوپٹہ سفید ہی رہتا تھا۔اب چونکہ رنگتی نہیں تھیں اس لیے کلف ڈال کر انہیں چننا بھی تقریباً بند ہو گیا تھا۔

کپڑوں کی ایک اور تہہ برآمد ہوئی۔

یہ سارے کے سارے بغیر سلے جوڑے تھے۔کبھی کوئی بیٹی دے گئی تھی، کبھی کوئی بیٹا۔ دو جوڑے آپا نے پہچانے یہ دونوں بھائیوں کی شادی پر ان کے سسرال والوں سے آئے تھے۔

آپا نے ایک ایک کر کے انہیں الگ رکھا۔کل سات جوڑے تھے۔جب بھی بیٹا، بیٹی، بہو کوئی آتا ان سے مطالبہ کرتا کہ وہ کچھ نئے کپڑے بنوالیں لیکن وہ کنی کاٹ جاتیں گرچہ اب کسی کفالت کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔

''اب میرا کسی چیز کو جی نہیں چاہتا۔'' جب جواب میں یہ کہتیں تو ان کے لہجے میں ایسا کرب ہوتا تھا جو کہنے والے کے آس پاس دیر تک ٹھہرا رہتا۔

آپا نے پھر ڈبکی لگائی اور چوڑیوں کا کیس برآمد کیا جو بکسے کے کونے میں حفاظت کے خیال سے ایک پرانی چادر میں لپیٹ کر رکھا گیا تھا۔خاصا بڑا سا تھا۔

چوڑیاں امی کا واحد سنگار تھیں۔شاید وہ واحد خرچ بھی جو وہ دو وقت کی روٹی اور سال

میں دو جوڑے معمولی کپڑوں کے علاوہ اپنی ذات کے لئے روا رکھتی تھیں اپنے وقت سے جو سارا کا سارا دوسروں کے لئے تھا۔ وہ کبھی کبھی تھوڑا سا اپنے لیے چرا کر ململ کے باریک سفید دوپٹے گھر پر خود رنگتیں ابرک اور کلف ڈال کر انہیں چنتیں اور ہم رنگ چوڑیاں ڈبے سے نکال کر پہنتیں۔ دن بھر کے سارے کاموں کے باوجود جن میں موسم کے مطابق ہاون دستے میں اچار کے مسالے کوٹنا بھی شامل تھا ان کی چوڑیاں جلدی ٹوٹتی نہیں تھیں۔ چوڑی ٹوٹنے کے لیے وہ ٹوٹنا لفظ کبھی استعمال بھی نہ کرتیں۔ کہتیں: ''چوڑی مول گئی'' ابا کے انتقال کے بعد امی کا چوڑی کا کیس نہ جانے کہاں غائب ہو گیا تھا۔ اس وقت تک تینوں لڑکیاں بیاہ کر کب کی جا چکی تھیں۔ اپنی اپنی زندگی میں مصروف۔ کسی کو زیادہ خیال تک نہ آیا۔ آج برآمد ہوا تو پتہ چلا کہاں تھا۔ آپا نے ذرا ڈھکن اٹھایا تو جیسے پورے کمرے میں روشنی پھیل گئی۔ ایک عورت کے سہاگ کی روشنی۔ جگ مگ جگ مگ کرتی فیروز آباد کے شیشہ گروں کے خون پسینے کی روشنی۔

''ارے جلدی کرو نہ آپا، کیا بیٹھی چوڑیوں کو تک رہی ہو۔'' چھوٹا بھائی قدرے بے صبر ہو اُٹھا تھا۔

آپا نے بھائی کو گھور کر دیکھا اور تین کتابیں اُٹھائیں۔ رضیہ کا شاہی دسترخوان، گھریلو نسخے اور ایک پنج سورہ۔ خاص خاص مواقع پر امی شاہی دسترخوان کی ترکیبیں آزماتیں۔ لڑکیوں کے بڑے ہونے پر ان کے لیے لڑکے والوں کا آنا اور شادی ہو جانے کے بعد دامادوں کی آمد و رفت خاص ہی نہیں، خاص الخاص موقعوں میں شامل تھے۔ بڑے جتن سے ان مواقع کے لیے رقم پس انداز کر کے رکھا کرتی تھیں۔ ان کے بچت کرنے کے طریقوں میں گھروں کے سارے کام خود کرنے حتی کہ بچوں کے کپڑے اور شوہر کے کرتے پاجامے سینے، فصل پر سال بھر کا غلہ گاؤں سے منگا کر رکھنے کے علاوہ خود اپنی ذات پر کوئی خرچ روا نہ رکھنا ایک بڑا طریقہ تھا۔ کتنی بھی تکلیف ہو وہ خاموشی سے جھیل جاتیں۔ بس اُٹھائی گھریلو نسخوں والی کتاب، باورچی خانے کے ڈبے ٹٹولے اور ہلدی، اجوائن، ادرک، پودینہ اور جانے کیا کیا، کوٹا چھانا یا پکایا اور اسی سے

بقول ابالوٹ پوٹ کے ٹھیک، بال بچوں والا ہو جانے کے بعد ایک بار بڑے بیٹے نے ہنس کر کہا تھا۔ امی کے وقت میں بچوں کی طرح مرض بھی کم ڈھیٹ ہوا کرتے تھے۔ جلدی مان جاتے، وہ بھی معمولی چیزوں سے۔ اب مرض اینٹی بایوٹکس کے بغیر نہیں سنتے اور بچے موبائل فون اور لیپ ٹاپ سے کم پر راضی نہیں ہوتے۔ اس طریقِ علاج اور دفعیاتِ بلا میں ان کا پنج سورہ بھی تھا جو امی کے جہیز میں شامل تھا۔ اس کے غلاف پر کڑھائی کا کام تھا جو انہوں نے خود بُنا تھا جب وہ کنواری لڑکی تھیں۔ سلمیٰ ستارے اب سیاہی مائل ہو گئے تھے اور جاپانی ساٹن جگہ جگہ سے مسکنے لگا تھا۔

''ہمارے وقت میں گھرانہ کتنا بھی دولت مند کیوں نہ ہو لڑکیوں کو کھانا پکانا اور سوئی سلائی کا کام ضرور سکھاتے تھے اس لیے کہ ہر ماں اپنی بیٹی کے لیے تشویش زدہ رہا کرتی تھی۔ جانے کیسا گھر کیسا بر ملے۔''

گھر بر کے بارے میں تو والدین آج بھی تشویش میں مبتلا رہتے ہیں۔ لڑکیاں دستکاری سیکھیں یا نہ سیکھیں۔

امی کی شادی کے دو چار روز بعد ان کا چھوٹا بھائی پہلے پھیرے کی رخصتی کرانے آیا تھا۔ اس نے کچے آنگن والے کھپر پوش گھر پر کچھ کچھ پریشان نظریں ڈالیں، تنہائی میں بہن سے بولا'' آپا ایسے گھروں میں ہمارے یہاں مویشی باندھے جاتے ہیں۔ میاں نے کیا دیکھ کے..........''

امی نے اسے جملہ پورا نہیں کرنے دیا کس کر ہاتھ سے اس کا منہ دبا دیا'' خبردار'' آگے ایک لفظ منہ سے نہ نکلے اور اگر گھر جا کر میاں سے کچھ کہا تو میرا مرا منہ دیکھو گے۔''

''وہ کمینہ وسیم'' بھائی نے دانت پیس کر پہلے وقتوں کی حدِ ادب کا لحاظ کر کے کوئی گندی گالی نہیں بکی تھی پھر بھی شبنم جیسی امی نے شعلہ برساتی آنکھوں سے بھائی کو دیکھا۔

گالیاں منہ سے نکالنا شریفوں کا شیوہ نہیں ہے اور وہ تمہارے سگے پھوپھی زاد بھائی

ہیں۔ آگے نہ سنوں۔

''ان کے لہجے میں کچھ ایسا تھا کہ بھائی پر ایک چپ لگ گئی اور وہ ہمیشہ چپ ہی رہا۔ امی کو کیسا گھر ملا تھا اور کیسا بر ان کے میکے میں کسی کو نہیں معلوم ہو سکا۔ یوں بھی لوگ بیٹی بیاہ کر اس کی قسمت پر شاکر ہو جایا کرتے تھے۔ شاید بہت سے تو اب بھی ہو جاتے ہیں۔ امی کی شادی بچپن میں ہی ان کے پھوپھی زاد سے طے کر دی گئی تھی۔ پھوپھی ٹکر کے گھرانے میں بیاہی تھیں۔ صاحبزادے اعلیٰ تعلیم کے لیے علی گڑھ بھیجے گئے تھے۔ بزرگوں نے شادی کی تاریخ طے کرنے کی بات کی تو ساری ہمت یکجا کر کے انکار کر دیا۔ کسی لڑکی سے دل لگا بیٹھے تھے۔ امی کے والد نے جو میاں کہلاتے تھے چپ چپاتے دوسرے رشتے منگوائے ''اچھا لڑکا'' دیکھ کر لپ جھپ شادی طے کی اور جس مدت میں امی کی شادی متوقع تھی اسی مدت میں انہیں رخصت کر دیا۔

ابا یوں تو شریف تھے اور شریف صورت بھی لیکن نہایت گھنّے۔ سوائے غصے کے اور کسی جذبے کا اظہار ان کے پاس نہیں تھا۔ ان پر غصّے کا دورہ پڑتا تو امی سامنے سے ہٹ جایا کرتیں۔ چیخ چلا چکتے تو ایک گلاس پانی پیش کرتیں، گرمیاں ہوتیں تو شربت لے آتیں۔ ایک مرتبے اچھے موڈ میں تھے تو موقع غنیمت جان کر امی نے پنج سورہ کھول کر اُن کی گود میں ڈال دیا۔ ''یہ دعا یاد کر لیجئے۔ غصہ آئے تو پڑھ لیا کیجئے۔ طبیعت کو سکون مل جائے گا۔'' ابا بڑی زور سے بھڑک گئے۔ بیوی یہ کہنے کی جرأت کر رہی تھی کہ وہ غصہ ور ہیں اور انہیں غصّے پر قابو پانے کی نصیحت بھی کر رہی تھی۔ ایک ہاتھ مارا تو پنج سورہ دور جا پڑا۔ امی اس دن بہت روئیں۔ کلام اللہ کی بے حرمتی کے نتیجے میں ابا پر آنے والی متوقع آفت کے خوف نے انہیں دہشت زدہ کر دیا تھا۔ نفل نماز پڑھ کر اللہ سے انہیں معاف کر دینے کی دعائیں مانگیں۔

آپا کی آنکھوں سے آنسو دوبارہ رواں ہو گئے۔ وہ اس واقعہ کے وقت سمجھ دار تھیں اور چشم دید گواہ۔ انہوں نے پنج سورہ پر محبت واحترام سے ہاتھ پھیرا پھر چوم کر الگ رکھ دیا۔

''وہ ادھر کیا ہے آپا۔ سبز رنگ کا؟ منجھلی نے بکسے میں جھانکا۔

''امی کا اندوختہ۔'' آپا نے ایک خوبصورت تھیلی برآمد کی۔ اس میں مڑے تڑے نوٹ اور کچھ ریزگاری تھی۔ آپا نے تھیلی گود میں الٹ لی۔ پانچ سو اسی روپے آٹھ آنے۔ اور ایک چھوٹی، چاندی کی بدرنگ ڈبیہ، اس کے اندر چار عدد چھوٹے چھوٹے زیور دو انگوٹھیاں اور ایک جوڑی ٹاپس۔ امی کو میکے سے بھاری بھاری زیور خاصی تعداد میں ملے تھے۔ بچوں کی تعلیم پھر لڑکیوں کی شادی میں کام آئے۔ یہ باقی الصالحات میں تھے۔ شاید ایک سواں حصہ۔ ایک چھوٹے پرزے پر لکھا ہوا تھا۔ ''میرے بعد انہیں بیچ کر جو روپے بکسے میں ہے اسے ملا کر گھر کی مرمت کر دی جائے۔ آنسوؤں کی چلمن کے پیچھے سے دونوں بھائی ہنس پڑے۔ امی اس اندوختے سے تو تمہارے باورچی خانے کی چھت بھی نہ ڈھلے گی۔ کیوں تم نے سارے زیور بہو، بیٹیوں میں بانٹ دیے۔ کوئی بڑا زیور رکھ لیا ہوتا۔

''چلو بھائی اُٹھو، آپا ہو گیا نا سب ختم۔''

تھوڑا بہت باقی تھا۔ کچھ بانس کی تیلیوں اور خوش رنگ کپڑوں سے ہاتھ سے بنائے گئے پنکھے تھے۔ جو ان دنوں کی یاد دلاتے تھے جب گھر میں بجلی نہیں تھی چھوٹے بچے گرمی سے بے چین ہوتے تو امی رات بھر اُٹھ اُٹھ کر انہیں پنکھا جھل کر سلاتیں۔ لگے ہاتھ ابا کو بھی جھل دیتیں۔ صبح نیند سے بوجھل آنکھیں لئے پھر گھر گرہستی میں جٹ جاتیں۔ تین چار ادھوری کشیدہ کاری کیے ہوئے میز پوش اور تکیے کے غلاف۔ ایک ادھورا بنا چکن کا کرتا، ایک مخملی جائے نماز جو ان کے جہیز کی تھی۔ کثرتِ استعمال سے جگہ جگہ سے روئیں جھڑ گئے تھے۔ ڈر سے رکھ دی ہو گی کہ بالکل ہی جھیر جھیر نہ ہو جائے۔ لونگ، الائچی کی کچھ پڑیاں شاید خوشبو کے لیے کپڑوں کو دور رکھنے کے لیے۔ ان سب کے نیچے کچھ کاغذ تھے۔ آپا قدرے متعجب ہوئیں۔ ٹٹولا تو دیکھا یہ ان سب کے اسکول کے ابتدائی دنوں کی کاپیوں سے پھاڑے گئے تھے۔ پانچوں بچوں کے الگ الگ۔ جب انہوں نے اردو اور انگریزی کے حروفِ تہجی لکھنا سیکھے تھے۔

گنتیاں اور بالکل ابتدائی ریاضی کے ننھے منھے سوال ٹیڑھی میڑھی تحریریں بورڈز کے پہلے امتحان کے ایڈمٹ کارڈ اوراسی طرح کی ان گنت یادیں۔

سب اُٹھ چکے تھے۔کون سا امی کے بکس سے قارون کا خزانہ برآمد ہونا تھا۔

نئے کپڑوں میں سے کوئی چیز نشانی کے طور پر رکھنا چاہو تو تم لوگ رکھ لو باقی سب یتیم خانے میں بھجوادو..........رقم بھی.......... بھائی نے اُٹھتے اُٹھتے پکار کر کہا۔

آپا اب بھی وہیں بیٹھی رہ گئی تھیں۔

تہہ میں ایک دلائی تھی۔آخری چیز۔آپا کو اچھی طرح یاد تھی۔یہ دلائی۔امی جاڑوں میں اوڑ کر کام کاج کرتی رہتی تھیں۔نہایت نفیس، باریک ریشم کا کامدانی کیا ہوا دوپٹہ اوپر تھا اور پٹاپٹی کی گوٹ جو باریک پچی دھنک سے مزین تھی۔امی کا صاف، گندمی رنگت کا چہرہ اس میں دمک اُٹھتا تھا۔پھر دوپٹہ مسکنے لگا تھا۔اندر سے روئی کی باریک ٹوٹی ٹوٹی تہہ جھلکنے لگی تھی۔ دھنک جگہ جگہ سے کھسک گئی تھی۔امی نے اسے جہیز کی چند باقی بچی یادگاروں میں سے ایک سمجھ کر رکھ لیا ہوگا۔وہی بکسے کی تہہ میں استر کی طرح بچھی ہوئی تھی۔باقی ساری چیزیں اس کے اوپر تھیں۔آپا نے دلائی نکال کر اسے جھاڑا۔تہوں میں سے نیم کی خشک پتیاں اڑ کر فرش پر بکھر گئیں۔کسی خزاں زدہ درخت کے پیلے پتوں کی طرح ایک زرد پڑتی، چرمراتی، پرانی، تصویر بھی نکل کر اڑی اور پھڑ پھڑاتی ہوئی نیچے آگری۔یہ ایک نوجوان کی تصویر تھی۔دھندلے پڑ جانے کے باوجود نقوش امی کی نوجوانی کی صورت سے کافی مشابہ تھے۔(پھوپھی زاد، ماموں زاد کے درمیان مشابہت کوئی حیرت کی بات تو نہیں) تصویر کے پیچھے لکھے گئے نام پر وقت سے اڑی گرد کی ایک موٹی تہہ جم گئی تھی۔لیکن غور سے دیکھا جائے تو 'وسیم' پڑھ لینے میں ایسی زیادہ دقت بھی نہیں تھی۔

..........○○..........

خالد حسین ......✍

جوتی قصوری

نمرتا اور میں آرمی سکول نینی تال میں اکٹھے پڑھے۔ بعد ازاں اُس نے دہلی یونیورسٹی سے اور میں نے کشمیر یونیورسٹی سے انگریزی ادب میں ایم، اے کی ڈگری حاصل کی۔ اس بیچ ٹیلی فون پر ہمارا رابطہ لگاتار رہتا۔ پھر ہم دونوں انڈین ایڈمنسٹریٹو سروس کے امتحان کی تیاری کے سلسلے میں کوچنگ لینے کے لئے دوبارہ دہلی میں اکٹھا ہوئے۔ ہم دونوں نے پہلے ہی Attempt میں آئی، اے، ایس کا امتحان پاس کرلیا۔ مجھے جموں و کشمیر کیڈر ملا اور نمرتا کو مہاراشٹر کیڈر۔ نمرتا کی شادی ممبئ کے ایک بڑے صنعتی گھرانے میں ہوئی اور اپنے سُسر کے کہنے پر اُس نے ایڈمنسٹریٹو سروس سے استعفیٰ دے کے اپنی ٹیلی کام کمپنی کا چیف ایگزیکٹیو بننا قبول کرلیا اور بڑے سلیقے سے کاروبار کو وسعت دی۔ اب ہماری بات چیت کبھی کبھار ہوتی اور وہ بھی ہیلو...... ہائے تک۔

میں جموں صوبہ کا ڈویژنل کمشنر تھا، ایک دِن مجھے نمرتا کا فون آیا۔:

''اقبال! میں جموں آرہی ہوں اپنے دونوں بچوں اور سہیلی کے ساتھ۔ میں تمہارے پاس ٹھہروں گی۔ میرے ساتھ کمپنی کی ایک سروے ٹیم بھی آرہی ہے تم اُن کے ٹھہرنے کا

انتظام کسی بڑھیا ہوٹل میں کرا دینا۔ سارا خرچہ کمپنی برداشت کرے گی۔ تم پر کوئی بوجھ نہیں پڑے گا۔ اس لئے فِکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ہم جموں میں ٹیلی کام یونٹ لگانا چاہتے ہیں۔''

تین چار دنوں بعد نمرتا اپنی ٹیم لے کر جموں پہنچ گئی۔ میں نے اُن کے لئے ایشیا ہوٹل میں انتظام کیا تھا اور نمرتا اپنے بچوں اور جرنلسٹ سہیلی کے ساتھ میری سرکاری کوٹھی میں رُکی۔ اُس کا میرے پاس ٹھہرنا مجھے بہت اچھا لگا تھا۔ ہم بڑی دلچسپی سے زندگی کی کتاب کے ورق پلٹتے رہے۔ بچپن، کم سنی اور جوانی کے قصّے یاد کرتے رہے اور آج کی ذمہ داریوں کا رونا بھی روتے رہے۔ سروے ٹیم نے اپنا کام ختم کرلیا تھا اور رپورٹ نمرتا کو پیش کردی تھی۔ ٹیم نے میراں صاحب میں بنجر قدیم زمین کا ایک تیس ایکڑ کا ٹکڑا پسند کیا تھا۔ میں نے ڈپٹی کمشنر جموں اور متعلقہ تحصیلدار کو ہدایت کی کہ وہ جلد از جلد کاغذات بنائے تاکہ زمین کی رجسٹری کرائی جاسکے۔

ایک دن شام کو کوٹھی کی چھت پر بیٹھے ہم سیالکوٹ شہر کی جگمگاتی بتیاں دیکھ رہے تھے کہ نمرتا اور اُس کی پتر کار سہیلی نے بارڈر دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ میں نے رنبیر سنگھ پورہ کے تحصیلدار کو فون کیا اور ہند، پاک سرحد دیکھنے کے لئے بندوبست کرنے کے لئے کہا۔

دوسرے دن ہم سب سچیت گڑھ بارڈر پہنچے۔ سرحدی حفاظتی پولیس کے افسروں نے ظہرانے کا انتظام کیا تھا۔ تحصیلدار، اُس کا عملہ اور بی، ایس، ایف کے اہلکار خدمت کے لئے حاضر تھے۔ ہم سب نے اُسی ہال میں لنچ کیا، جہاں ۱۹۷۳ء میں بھارت اور پاکستان کے ملٹری کمانڈروں نے جنگ بندی لائن کو حقیقی کنٹرول لائن میں بدلا تھا اور اس سے متعلق نقشوں کا تبادلہ کیا تھا۔

ظہرانے کے بعد نمرتا، اُس کے بچوں اور صحافی سہیلی کو لے کر میں اپنی طرف کے گیٹ کے پار گیا اور پھر ہم نومینز لینڈ کے درمیان بنے رُکاوٹی جنگلے کے پاس پہنچے، نومینز لینڈ

کے دوسری جانب پاکستان کی سرزمین تھی۔ پول کے ساتھ ہی کنکریٹ سے بنی سرحدی بتی لگی ہوئی تھی جس کو پیپل کے درخت نے اپنی جڑوں میں جکڑا ہوا تھا۔ آج پیپل کا یہ درخت آدھا ہندوستان اور آدھا پاکستان بن چکا تھا۔ اسے ہم سیاست کی ستم ظریفی نہیں کہیں گے تو اور کیا کہیں گے۔

رُکاوٹی پول کے دوسری طرف پاکستانی پنجاب سے بھی بڑی تعداد میں لوگ سچیت گڈھ، سیالکوٹ سرحد دیکھنے آئے تھے۔ پاکستانی بچے اور جوان ہندوستانی لوگوں سے ہاتھ ملا کر خوش ہور ہے تھے۔ ایسا ہی ماحول ہماری طرف بھی تھا پھر میں نے دیکھا کہ ایک دِلرُبا اپنی مستی میں بدن کی گیلی مٹی کی مہک لُٹاتی ہوئی نمرتا کے پاس آئی۔ اُس نے پہلے آداب کہا اور پھر نمرتا کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام کر حال احوال پوچھنے لگی۔ اُس دوشیزہ کے ساتھ نمرتا نے بھی کھل کر باتیں کیں۔ دونوں خلوص ومحبت سے پیش آرہی تھیں۔ اچانک نمرتا کی نظر اُس دوشیزہ کے پاؤں میں پڑی اصلی تِلے دار جوتی کی طرف گئی۔ نمرتا نے جوتی کی تعریف کرتے ہوئے پوچھا کہ یہ خوبصورت جوتی کہاں کی بنی ہے۔

''باجی! یہ قصور کی جوتی ہے۔ آپ نے ہماری گائیکہ سریندر کور کا یہ گیت نہیں سنا ہو یا ....''جُتّی قصوری، پیریں نہ پوری، ہائے ربّا وے ساہنوں ٹُرنا پیا''.......... قصور کی جوتیاں، کھُسے اور میتھی پوری دنیا میں مشہور ہیں۔

اس حسین لڑکی نے اپنے پاؤں سے جوتی نکالی اور نمرتا کی طرف بڑھائی اور کہنے لگی...... ''آپ اسے پاؤں میں پہن کر دیکھیں، میں دیکھنا چاہتی ہوں کہ بھلا آپ کے پاؤں میں کیسے لگے گی۔''

نمرتا نے جوتی اپنے پاؤں میں ڈالی جو اسے پوری آگئی تھی۔ اُس پُرکشش لڑکی نے دوسرے پاؤں سے بھی جوتی اُتاری اور نمرتا کو دی۔ نمرتا نے دونوں پیروں میں قصوری جوتی ڈال کر تھوڑا سا چل کر دیکھا۔

''باجی! یہ جوتی آپ کے پیروں میں خوب سج رہی ہے۔'' اُس نے پیار سے کہا۔

''تمہارا نام کیا ہے اور تم کہاں سے آئی ہو؟'' نمرتا نے پوچھا

''باجی! میرا نام عالیہ کھوکھر ہے اور میں ڈسکے سے بارڈر دیکھنے آئی ہوں۔ ڈسکے سیالکوٹ کے قریب ہی ایک بڑا قصبہ ہے اور آپ کہاں سے آئی ہیں۔؟''

''میں ممبئی سے آئی ہوں۔ ہم بھی سُچیت گڑھ بارڈر دیکھنے آئے ہیں۔'' نمرتا نے جواب دیا۔

آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ میرا دِل باغ باغ ہوگیا ہے۔ اب میری ایک گزارش ہے۔ میری چھوٹی سی آرزو، میری تمنا پور کردو، دیکھو...... انکار نہیں کرنا۔''

''ہاں ہاں!...... بتاؤ تمہاری کیا خواہش ہے؟''

''باجی! میری التجا ہے کہ اب یہ جوتی آپ نے پیروں سے اُتارنی نہیں ہے۔ اِسے چھوٹی بہن کا تحفہ سمجھ کر قبول کرلو۔''

''تمہارا دِل موتیوں کی مالا ہے لیکن میں تمہارا تحفہ قبول نہیں کرسکتی کیونکہ یہاں سے تم ننگے پاؤں کیسے جاؤ گی۔''

''باجی!...... آپ فکر نہ کریں۔ گیٹ کے باہر میری کار کھڑی ہے۔ اُس میں قصوری جوتیوں کا دوسرا جوڑا پڑا ہے۔ میں گیٹ تک آرام سے چلی جاؤں گی۔ آپ انکار نہ کریں اور مجھے عزّت بخشیں اور شفقت دکھائیں۔''

میں خاموشی سے یہ دِل لُبھانے والا نظارا دیکھ رہا تھا۔ نمرتا نے میری طرف دیکھا۔ میں نے اشارہ سے مان جانے کے لئے کہا۔ نمرتا نے عالیہ کو گلے لگایا اور دعائیں دیتے ہوئے کہا۔

''ایشور کرے کہ اس دھرتی کے پانچ دریا پیار کے سُر میں ہمیشہ بہتے رہیں۔ ان میں کبھی طغیانی نہ آئے۔''

''اللہ سائیں تمہاری دعا قبول فرمائے اور اپنی رحمتِ باراں سے ہمیں ہریالی اور

خوش حالی بخشے۔''

............نمرتا بڑی خوش تھی وہ بہت جذباتی ہوگئی تھی۔ کار میں بیٹھے وہ دونوں ملکوں کے درمیان امن اور شانتی کے لئے دعائیں مانگ رہی تھی۔ پھر وہ کہنے لگی۔

''اقبال! ممبئی پہنچ کر میں دِل کو چھونے والی یہ کہانی اپنے فلمی پرڈیوسر دوست کو سناؤں گی اور اُسے اس موضوع پر فلم بنانے کے لئے کہوں گی تاکہ نفرت کی دیواریں گرانے میں ہم بھی اپنا حصہ ڈال سکیں۔''

نمرتا کی پترکار سہیلی بھی بولی۔

''میں بھی اس خوبصورت واقع کے بارے میں اخبار میں ایک کہانی لکھوں گی، پر میری کہانی ایک نئے موڑ پر ختم ہوگی۔''

''نیا موڑ......؟ وہ کون سا......؟ نمرتا نے پوچھا۔

''میری کہانی میں پٹیالے کی زنانہ جوتی کا تحفہ نمرتا عالیہ کو دے گی۔''

''دُر پھٹے منہ تیرا...... یہاں بھی تم ڈنڈی مارو گی۔''

نمرتا نے اپنی سہیلی کی چٹکی لیتے ہوئے کہا اور پھر دونوں ہنسنے لگیں۔

پر میرا دل کہہ رہا تھا۔ ''ان صحافیوں کو کون سمجھائے کہ بات قصور اور پٹیالے کی نہیں ہے بلکہ بات تو قصور اور پٹیالے کے رشتے کی ہے۔''

............OO............

بلّی

یہ سلسلہ کئی دنوں سے چل رہا تھا، اس وقت پھر خاندان کے لوگ اکٹھا ہو گئے تھے، کوئی سورۃ یٰسین پڑھ رہا تھا تو کوئی اسے کلمہ پڑھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کا بڑا بیٹا چمچہ سے بار بار اس کے منہ میں شہد ملا ہوا پانی ڈال رہا تھا۔ سب کی آنکھیں نم ہو چکی تھیں۔ بس شاید چند ساعتوں کی بات اور تھی۔

وہ اچانک زور سے کانپا اور خوف زدہ سی آواز میں بلّی ...... بلّی چلاّنے لگا۔

''لاحول بھیجئے۔...... لاحول بھیجئے۔'' کئی آوازیں ایک ساتھ ابھریں۔

''ابّا آپ کو کمبخت شیطان بہکا رہا ہے۔ توبہ کیجئے اور لاحول پڑھئے۔'' بیٹا باپ کے مردنی چھائے ہوئے چہرے پر ہاتھ پھیرتا ہوا بولا۔ پھر بھیگے ہوئے تولیے سے باپ کی آنکھیں پونچھنے لگا، جن کے کنارے پر آنسو جم سے گئے تھے۔

بھیگے تولئے سے آنکھیں صاف ہوئیں تو اسے ایک بار پھر سب کچھ صاف دکھائی دینے لگا۔ وہ اپنے اردگرد کھڑے ہوئے تمام لوگوں کو پہچان سکتا تھا۔ یہ سب اس کے اپنے تھے بیٹے، بیٹیاں، نواسے، پوتے، بھائی اور بہن۔

اچانک اس نے محسوس کیا جیسے ان لوگوں کے درمیان وہ بلّی بھی آ کر کھڑی ہوگئی ہے جو پچھلے کئی دنوں سے اسے خوف زدہ کر رہی تھی۔ ڈراونی آنکھیں، نکیلے دانت، وحشت زدہ کر دینے والا چہرہ اور خوف ناک پنجے۔

اس نے سوچا کہ اس بلّی کو آزاد کس نے کر دیا؟ اس نے تو اسے بہت پہلے کاٹھ کباڑ رکھنے والی اندھیری کوٹھری میں قید کر دیا تھا۔ یہ آزاد کیسے ہوگئی کہ اب ان ساعتوں میں اسے خوف زدہ کر رہی ہے اور ساتھ ہی مکمل سکوت سے پہلے کا سکون درہم برہم کر رہی ہے۔

یک بیک اسے محسوس ہوا کہ جیسے سامنے کھڑی بلّی دھیرے دھیرے چھوٹی ہوتی جارہی ہے۔ چھوٹی......اور چھوٹی...... بالکل اسی طرح کہ جیسے اس نے پہلی بار اپنے اردگرد اس کی موجودگی محسوس کی تھی۔ ان دنوں وہ بھی خاصہ کم عمر تھا۔

ایک دن اس نے بلّی کو اُٹھا کر اپنی گود میں رکھ لیا تھا اور دیر تک اسے پیار سے یوں سہلاتا رہا تھا کہ جیسے وہ بلّی کو نہیں بلکہ اپنے وجود کے کسی حصہ کو سہلا رہا ہو۔ کتنی جلدی وہ اور بلّی ایک دوسرے کا حصّہ بن گئے تھے یہ سب کچھ اُسے اس طرح یاد تھا کہ جیسے کل کی ہی بات ہو۔

اس نے محسوس کیا کہ جیسے جیسے اس کی عمر بڑھ رہی ہے ویسے ہی ویسے بلّی بھی بڑی اور طاقتور ہوتی جارہی ہے۔

پھر وہ اپنے پیروں پر کھڑا ہو گیا تھا۔

اس دن اس کے بوڑھے ماں باپ کتنا خوش تھے، جب وہ پہلی بار آفس اسسٹنٹ بن کر دفتر جارہا تھا۔ گھر سے نکلتے وقت ماں نے اسے کتنا پیار سے لپٹایا تھا اور اسے ساری عمر ایمانداری سے کام کرنے کی تلقین کی تھی۔

''دیکھو بیٹے نیک راہ کانٹوں بھری ہوتی ہے اس راستے پر چلنا آسان نہیں ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ تم اس راہ پر ثابت قدم رہو گے۔ کیوں ہے نا؟''

اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''تو پھر وعدہ رہا؟'' باپ پھر بولا تھا۔

''ہاں وعدہ رہا۔''

کچھ دنوں بعد اس نے محسوس کیا کہ دفتر کی دنیا اس دنیا سے بالکل الگ ہے جس کا تصور اس کے دل و دماغ میں موجود ہے۔ دھیرے دھیرے وہ تنہائی کا شکار ہونے لگا۔ تنہائی ہر طرف بکھری ہوئی تنہائی اور کچھ نہیں۔ آفس کے ساتھی جب اس کی طرف مسکرا کر عجیب ڈھنگ سے دیکھتے تو وہ اپنے آپ کو بیوقوف محسوس کرتا اور دل خون ہو جاتا۔

آخر ایک دن وہ بھی ڈِھ گیا۔

اس رات وہ ایک لمحے کے لئے بھی نہ سو سکا تھا اور بلّی جو اسے جان سے بھی زیادہ عزیز تھی، اس رات اسے بدترین دشمن محسوس ہوئی تھی۔ وہ بار بار اس پر جھپٹ پڑتی اور اسے اپنے نوکیلے پنجوں سے زخمی کر دیتی۔ صبح تک اس کا پورا وجود زخمی ہو چکا تھا۔ زخم جو اسے اندرونِ جاں میں لگے تھے۔

اگلی صبح ناشتہ کرتے وقت اس نے محسوس کیا تھا کہ اس کے بیوی اور بچے کتنے خوش نظر آ رہے ہیں۔ بچوں کے چند سوٹ جس کے لئے وہ عرصہ سے ترس رہے تھے، بیوی کے لئے ایک اچھی سی ساڑی اور میک اپ کا کچھ سامان۔ اس نے سوچا کہ کتنی معمولی معمولی چیزیں گھر کی فضا کو بدل دیتی ہیں۔

کیا سچ مچ وہ بھی خوش ہے؟ اس نے اپنے آپ سے ایک سوال کیا۔ پھر خود کو جواب دئے بغیر، نہا دھو کر دفتر جانے کی تیاری کرنے لگا۔

آفس جاتے وقت اچانک وہ بلّی اس پر جھپٹ پڑی۔ اس نے اپنے بچاؤ کے لئے بلّی کی گردن پکڑ لی۔ پھر اس کی گردن پکڑے پکڑے وہ اسے اس اندھیری کوٹھری کی طرف لایا جس میں کاٹھ کباڑ رکھا جاتا تھا۔ اس نے کوٹھری کا دروازہ کھولا پھر ایک جھٹکے کے ساتھ بلّی کو اندر پھینک کر دروازہ بند کر دیا۔ وہ چند لمحے گم صم کوٹھری کے سامنے کھڑا رہا پھر رومال سے

آنکھوں کے کونوں کو صاف کرتا ہوا دفتر کے لئے نکل پڑا۔

اس دن وہ دن بھر ایک عجیب سی بے چینی اور بے کیفی کا شکار رہا۔ پھر یہ بے چینی اور بے کیفی اس وقت اور بڑھ گئی جب لنچ کے وقت اس نے اپنے بارے میں ایک ساتھی سے دوسرے ساتھی کو کہتے سنا۔ ''چلو یہ سالا بھی راستے پر آیا۔ ہم لوگوں کے لئے کتنا Inconvenient تھا۔''

اس رات بھی اسے نیند نہ آئی تھی، ایک ٹیس پورے وجود کو چھلنی کئے دے رہی تھی۔ وہ دیر تک ان لوگوں کے بارے میں سوچتا رہا جنھیں کبھی کوئی ٹیس محسوس نہیں ہوتی۔ کیسے ہیں وہ لوگ؟ ان کا احساس کہاں چلا گیا؟ بلّی انھیں خوف زدہ کیوں نہیں کرتی؟ ایک وہ ہے جو کئی راتوں سے نہیں سو سکا۔ یہ کیسی چبھن ہے جو اسے چین لینے نہیں دیتی۔ اس کے کتنے دوست ہیں جو کل سے پہلے تک اسے ایک بزدل اور بے وقوف آدمی سمجھتے تھے۔ اُف! وہ انھیں اپنی روح کیسے دکھائے جو اب زخموں سے لہولہان ہو چکی ہے، کاش وہ یوگیش ہی بن سکتا۔

ہاں ڈاکٹر یوگیش ورما۔ اس کے بچپن کا دوست۔ یونیورسٹی میں شعبۂ ہندی کا استاد۔ کیسی ذہانت ٹپکتی تھی یوگیش کی آنکھوں سے اور تیزی طراری تو اس کی شخصیت کا حصّہ تھی۔ اس کے نرم اور میٹھے لہجے میں کتنا جادو تھا کہ اس کے آگے اچھے اچھے چت ہو جاتے اور یہی وہ خطرناک حربے تھے جو اس کے کام آتے تھے۔ یوگیش انھیں حربوں کا استعمال کر کے اپنی ریسرچ اسکالر لڑکیوں کو بڑی آسانی سے شیشے میں اتار لیتا۔

''سنا ہے تم نے کسی انٹر کالج میں لکچرر شپ کے لئے درخواست دی ہے؟''

''ہاں سر...... دی تو ہے۔''

''مجھے افسوس ہوا۔''

''کیوں؟''

''تم اور انٹر کالج؟ تم تو صرف یونیورسٹی میں پڑھانے کے لئے بنی ہو'' وہ شرما جاتی۔

"نہیں میں سچ کہہ رہا ہوں۔ یونیورسٹی تمھیں اپنے اندر سمو لینے کے لئے باہیں پھیلائے کھڑی ہے۔ مجھ پر بھروسہ رکھو۔" وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بڑے اعتماد سے کہتا۔

پھر اس سے پہلے کہ یونیورسٹی کی باہیں اس لڑکی کے اپنے اندر سمو لیتیں وہ یوگیش کی باہوں میں سما جاتی۔

اسے کلپنا اور گنجن موہن یاد آئیں۔

کلپنا ضرورت سے کہیں زیادہ معمولی چہرے والی لڑکی، لیکن کتنی سادہ دل تھی وہ۔ اس بے چاری نے بھی یونیورسٹی میں پڑھانے کے خواب دیکھے تھے۔ لیکن وہ کہاں کے لئے چلی تھی اور کہاں پہنچ گئی۔ اپنے اندر سانس لیتی ہوئی ایک اور زندگی سے چھٹکارہ حاصل کرنے کے بعد وہ کتنا بجھ سی گئی تھی۔ نہ کہیں آنا، نہ کہیں جانا۔ خود اپنی نظروں میں کتنا نیچے اُتر گئی تھی۔ یوگیش ٹھیک ہی کہتا ہے کہ لڑکیاں صرف ایک رات میں سب کچھ حاصل کر لینا چاہتی ہیں۔ وقت آنے کا انتظار نہیں کر سکتیں۔

کلپنا کی طرح گنجن موہن نے بھی وقت آنے کا انتظار نہیں کیا تھا۔

گنجن موہن...... گوری چٹی، سلم، نازک، تیکھا ناک نقشہ اور بے قرار آنکھیں۔ کتنی خوبصورت تھی وہ۔ لیکن یوگیش کے لئے کتنا ٹف ثابت ہوئی تھی۔

کئی بار یوگیش کی بے احتیاطی کے نتیجے بھگتنے کے بعد بھی وہ بس اپنی ضد پر اڑی رہی۔ یونیورسٹی میں نوکری دلاؤ یا پھر شادی کرو۔ اس نے سوچا کہ یوگیش اپنے آپ سے شرمندہ کیوں نہیں ہوتا؟ کتنی ڈھٹائی سے وہ زندہ ہے۔ کیا یوگیش کی روح کبھی لہولہان نہیں ہوتی۔ کیا اسے اپنے وجود میں کانٹے چبھتے ہوئے محسوس نہیں ہوتے۔ شاید اس کے لئے وہ سب کچھ بے معنی ہے جو سچ مچ با معنی ہے۔

کتنا فرق ہے اس میں اور یوگیش میں۔

یوگیش ٹھیک ہی کہتا ہے کہ جو لوگ وقت کے ساتھ نہیں چلتے ، وقت انھیں پیچھے چھوڑ دیتا ہے۔ جس طرح وہ کہیں چھوٹ گیا ہے۔ ہاں یہ سچ ہے کہ وہ کہیں بہت پیچھے چھوٹ گیا ہے۔ ورنہ وہ بھی یوگیش کی طرح پروفیسروں کے جوتے چاٹ کر یونیورسٹی میں لکچرر تو ہو ہی سکتا تھا کہ وہ یوگیش سے علم اور ذہانت میں کسی طرح کم نہ تھا۔

''ہاں میں کسی طرح کم نہ تھا۔'' وہ پوری قوت سے سانس کھینچتے ہوئے پھسپھسایا۔ اسی کے ساتھ اسے ایک زوردار ہچکی آئی اور اس کے پاس موجود لوگوں نے ایک بار پھر اسے کلمہ پڑھانا شروع کر دیا۔ وہ لوگ اب سمجھ چکے تھے کہ آخری لمحہ آیا ہی چاہتا ہے۔ اس کے بیٹے نے پھر اس کے منہ میں تھوڑا سا شہد ملا پانی ڈال دیا۔ پانی حلق کے نیچے اُترتے ہی اس نے اپنی آنکھیں پھر کھول دیں۔ لیکن اسے اب سب کچھ دھندلا دھندلا سا دکھائی دینے لگا تھا۔

ماضی کے واقعات کی ریل (Reel) ایک بار پھر ذہن میں چلنے لگی۔

اس کی یادوں میں وہ رات پھر جلنے بجھنے لگی ، جس رات وہ اپنے بیٹے کا انجینئرنگ کالج میں داخلہ کرانے کے بعد دیر سے گھر لوٹا تھا۔ کھانا کھانے کے بعد بھی لیٹنے کے بجائے وہ بیٹھا نہ جانے کیا خلا میں ڈھونڈ رہا تھا۔ جیسے اسے کسی کھوئی ہوئی چیز کی تلاش ہو۔

یک بیک اسے اپنے آپ پر شدید جھنجھلاہٹ محسوس ہوئی تھی۔

اس نے سوچا کہ آفس پہنچنے کے بعد اس کی آنکھوں کا پانی مر کیوں جاتا ہے۔ وہ کتنی بے حیائی سے پیسے لے کر لوگوں کے کام کرتا ہے۔ نہ کوئی ہچکچاہٹ نہ گھبراہٹ۔ جیسے یہ سب اس کے خون میں شامل ہو۔ اسے وہ آدمی یاد آیا جس نے چند دنوں پہلے اس سے اپنی غریبی اور بیوی کی بیماری کی دہائی دی تھی اور وہ ٹس سے مس نہ ہوا تھا کہ اسے اپنے بیٹے کے داخلہ کے لئے ڈونیشن کی رقم میں پڑنے والی کمی کو پورا کرنا تھا۔ آخر پیسے لیتے وقت اس کے ہاتھ کیوں نہیں کانپے؟

کتنا بدل جاتا ہے وہ گھر آ کر۔ اسے اپنی کمینگی کا احساس کتنا بڑھ جاتا ہے۔ اے

خدایا وہ کیا کرے؟

پھر بیوی اسے اس طرح گم صم بیٹھا دیکھ کر بولی تھی۔ ''میں آپ کی ذہنی الجھن کو پوری طرح سمجھتی ہوں۔ پر کیا بھی کیا جا سکتا ہے۔ مجبوری کے آگے سر جھکانا ہی پڑتا ہے۔''

بیوی کی بات نے اسے پوری طرح سے چکنا چور کر دیا تھا۔

اس نے سوچا کہ اسے اتنی چبھن اور اتنی بے چینی اپنی رگوں میں دوڑتی ہوئی کیوں محسوس ہوتی ہے؟ کیوں؟ آخر کیوں؟ اس نے تو بلی کو بھی کاٹھ کباڑ والی اندھیری کوٹھڑی میں بند کر دیا تھا جو بار بار اپنی ڈراونی آنکھوں سے اسے گھورتے ہوئے اس کا راستہ کاٹ دیتی تھی۔

کاش اس نے اپنے ماں باپ سے کیا ہوا وعدہ نہ توڑا ہوتا تو یہ لمحے اتنے اذیت ناک نہ ہوتے۔ اف! اب وہ کیا کرے۔ اے خدا نجات کا راستہ کدھر ہے؟

اس نے دیکھا کہ وہ بلّی جو تھوڑی دیر پہلے آہستہ آہستہ چھوٹی ہوگئی تھی اب پھر بڑھنا شروع ہوگئی ہے۔ بڑی......اور بڑی......اور۔ زبان لپ لپ کرتی ہوئی اور سرخ سرخ آنکھوں سے گھورتی ہوئی۔ بلّی کے پنجے اس کے نرخرے کی طرف دھیرے دھیرے بڑھ رہے تھے۔

''اس بلّی کو کس نے آزاد کر دیا؟ یہ مجھے مار ڈالے گی۔ مار ڈالے گی۔'' اس نے چیخنے کی کوشش کی۔ لیکن آواز اس کا ساتھ نہ دے سکی۔ اسے شدید گھبراہٹ محسوس ہوئی، اس نے ایک بار پھر چیخنے کی کوشش کی۔

اس کا منہ کھلا۔ پھر کھلا کا کھلا ہی رِہ گیا۔

اب کمرے میں صرف رونے اور بلکنے کی صدائیں گونج رہی تھیں۔

..........OO..........

لکھے......نور شاہ

ٹوٹے آئینے کی لکیر

آوازیں:......

- کہانی کار — عمر ۵۵ برس
- آنند — عمر ۴۵ برس
- شرمیلا — عمر ۳۰ برس
- ڈاکٹر — عمر ۶۰ برس

..........❀❀❀..........

..........ہلکی ہلکی موسیقی اُبھرتی ہے اور فیڈ اوٹ ہو جاتی ہے..........

اور پھر ایک آواز سنائی دیتی ہے!

کہانی کار: یوں تو میرا نام احمد سید احمد کلیم ہے لیکن ادبی حلقوں میں احمد کلیم کے نام سے جانا جاتا ہوں۔ میں ایک کہانی کار ہوں، کہانیاں لکھتا ہوں، زندگی کی کہانیاں، سماج اور معاشرے کی کہانیاں..........اپنی اور غیروں کی کہانیاں..........لیکن آج لکھتے لکھتے قلم رُک سا گیا ہے، کب سے اِس نئی کہانی کے خدوخال سنوار رہا ہوں، کرداروں کو ترتیب دے رہا ہوں، کرداروں کے ذہنوں میں اپنی سوچیں قید

کرنے کی کوشش کررہا ہوں، میری سوچیں اور یہ خاموشی ...... مسلسل خاموشی ......
کبھی کبھار اپنی سوچوں کو اپنے قلم کا سہارا دینا کس قدر دشوار ہوتا ہے اس کا
احساس مجھے اس وقت ہورہا ہے۔..........

............موسیقی کی ایک تیز لہر............

کہانی کار: ......لگتا ہے کہ اب میرا قلم میرا ساتھ دینے لگا ہے، میری سوچیں نکھر کر سامنے
آرہی ہیں ....اور اب..........اب میں نئی کہانی کا آغاز کررہا ہوں۔.......

..........موسیقی کی ایک اور تیز لہر..........

کہانی کار: شرمیلا کی صورت دیکھ کر آنند کی آنکھیں پتھرا گئیں، شرمیلا کی آنکھوں میں ایک
پوری جھیل پوشیدہ تھی ......ایک رُکی رُکی سی خاموش جھیل ......سنہرے بال ......
نازک نازک ہونٹ ......اور آواز ......شرمیلا کی آواز میں بے پناہ شرینی تھی ......
چلیئے اب آپ کو اپنی کہانی کے کرداروں سے ملاتا ہوں ......اور اُن کی کہانی اُن ہی
کی زبانی سناتا ہوں......۔

............ہلکی ہلکی موسیقی اُبھرتی ہے اور فیڈ اوٹ ہوجاتی، پھر
دور سے کسی لوگ گیت کی آواز سنائی دیتی ہے، یہ آواز بھی فیڈ
اوٹ ہوجاتی ہے، پھر قدموں کی آہٹ سنائی دیتی ہے اور پھر
دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز دیتی ہے............

آنند: کون..........دروازے پر کون ہے.....دروازہ کھلا ہی ہے، اندر آجایئے۔

............دروازہ کھولنے کی آواز............

آنند: آپ.....کون ہیں آپ۔ کس سے ملنا چاہتی ہیں (گھبرا کر) کہیے نا کون ہیں آپ......
شرمیلا: میں شرمیلا ہوں۔ آپ سے ہی ملنے آئی ہوں۔
آنند: مجھ سے......کیوں......کس لئے

شرمیلا: میں نے اخبار میں آپ کا اشتہار دیکھا۔

آنند: اشتہار...... اچھا سمجھ گیا۔ ہاں میں نے ہی دیا تھا۔

شرمیلا: مجھے آپ کی بچی کی دیکھ بھال کرنے میں بڑی خوشی ہوگی اور مجھے یقین ہے کہ آپ کو مجھ سے کوئی شکایت نہیں ہوگی۔

آنند: (حیران ہوکر) آپ اور بچی کی دیکھ بھال...... دیکھیئے یہ میری بن ماں کی بچی ہے اُسے بہت محبت کی ضرورت ہے، ایک ماں کی محبت، میرا مطلب ہے محبت اور پیار جو ماں اپنی بچی کو دیتی ہے، دے سکتی ہے۔

شرمیلا: جی ہاں ایسا ہی ہوگا، میں جان چکی ہوں کہ آپ کو ایک محبت کرنے والی ماں، میرا مطلب ہے ایک میڈ Maid کی تلاش ہے میں اپنے آپ کو اس قابل سمجھتی ہوں۔

آنند: ہمارے گھر میں ایک نہیں چار چار نوکر ہیں لیکن وہ میرے باغوں میں کام کرتے ہیں اور بہت کم یہاں آتے ہیں، کبھی کسی ضرورت سے ہی یہاں آتے ہیں اور پھر مجھے اُن پر زیادہ بھروسہ بھی نہیں۔ آپ کھڑی کیوں ہیں بیٹھ جائیے نا۔

شرمیلا: شکریہ..........

آنند: دیکھیئے ہمارے اس گھر میں اس ماحول میں شہروں جیسی رونق نہیں ملے گی۔ ہم لوگ شہر سے دور رہتے ہیں۔ گھر میں اکیلا رہتا ہوں اپنی بچی کے ساتھ.......... میرے باغات یہاں سے زیادہ دور نہیں، میں خود ہی اپنے باغات کی دیکھ بھال کرتا ہوں۔

شرمیلا: مجھے خاموشی پسند ہے، مجھے ہنگاموں سے کوئی دلچسپی نہیں، شاید یہی دلچسپی مجھے یہاں لے آئی..... پر میری ایک شرط بھی ہے۔

آنند: میں آپ کو ایک اچھی خاصی Salary دے سکتا ہوں، اُس کی فکر نہ کیجیئے۔

شرمیلا: میں اپنی Salary کی بات نہیں کر رہی ہوں۔

آنند: تو پھر کیا؟

شرمیلا: بچی خوبصورت ہو......سُندر ہو۔

آنند: (ہنستے ہوئے) مجھے اپنی بچی بہت خوبصورت اور سُندر لگتی ہے لیکن آپ دیکھنا چاہتی ہوں تو دیکھ لیجئے۔

شرمیلا: ہاں ہاں ضرور......کہاں ہے آپ کی بچی۔

آنند: دوسرے کمرے میں ہے، سو رہی ہے، آیئے آپ کو لئے چلتا ہوں......

کہانی کار: اور وہ دونوں آنند اور شرمیلا دوسرے کمرے میں گئے جہاں نازی سو رہی تھی۔نازی کو دیکھ کر شرمیلا کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک آ گئی، ایک وحشت ناک چمک۔

............قدموں کی آہٹ......دروازے کھولنے کی صدا............

............ہلکی موسیقی............

شرمیلا: یہ...... یہ ہے آپ کی بچی، اتنی سندر......اس قدر خوبصورت......میں نے ایسا نہیں سوچا تھا...... پر...... دیکھئے...... میں آپ کی بچی...... نازی کی تمام ذمہ داریاں نبھانے کے لئے تیار ہوں، آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں۔

آنند: بھلا مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے...... چلئے پہلے Details طے کر لیتے ہیں، تب تک شاید نازی بھی نیند سے جاگ جائے گی۔

شرمیلا: Details......میں Details میں پڑنا نہیں چاہتی۔ میں نے بچی کو دیکھ لیا...... بچی مجھے پسند آئی۔ پیاری لگی، میرے لئے یہی بہت کچھ ہے۔

آنند: چائے تو پی سکتے ہیں۔

شرمیلا: ہاں ضرور......کچن کہاں ہے میں چائے بنا لیتی ہوں۔

............وقفہ......ہلکی موسیقی اُبھرتی ہے............

کہانی کار: اب میری کہانی میں ایک نیا موڑ سامنے آ گیا ہے۔نازی بہت جلد شرمیلا سے مانوس ہو گئی مگر شرمیلا نازی کے بغیر کسی اور سے مانوس نہ ہوئی۔وہ جانے کیا سوچتی رہتی،

آنند اکثر سوچتا شرمیلا اِس قدر خاموش اور افسردہ کیوں رہتی ہے، کیا دُکھ ہے اُسے، اِس عمر میں اُس نے کون سا روگ اپنا لیا ہے پھر اچانک ایک رات ایک میٹھی سریلی آواز سنائی دی......کوئی وائلن بجا رہا تھا، وائلن کی مدھر مدھر آواز سُن کر آنند ایک لمحے کے لئے چونک پڑا، اس نے نازی کے کمرے کی طرف دیکھا، کمرے کا دروازہ کھلا تھا وہ اُس کمرے کی جانب جانے لگا۔ شرمیلا وائلن بجا رہی تھی، اُس کی آنکھیں بند تھیں، اچانک اُس نے وائلن بجانا بند کر دیا اور فرش پر پھینک دیا۔

............فرش پر زور سے کسی چیز کے گرنے کی آواز............

آنند: شرمیلا۔

شرمیلا: (آہستہ سے) کون.........کون ہے۔

آنند: میں ہوں.........میں آنند.........نازی کا ڈیڈی.........تم ٹھیک ہو نا شرمیلا

شرمیلا: میں......نہیں تو......نہیں میں تو ٹھیک ہوں۔ نازی بھی ٹھیک ہے، وہ سو رہی ہے۔ ......اب میں بھی سونا چاہتی ہوں...... مجھے بھی نیند آ رہی ہے......(پُر اسرار لہجے میں) آپ چلیں جائے۔ چلیں جائے اس وقت یہاں سے......پلیز......میرے لئے......نازی کے لئے پلیز۔

آنند: جاتا ہوں......جاتا ہوں۔

............قدموں کی آواز اور فیڈ اوٹ............

............صبح کا وقت۔ چائے پینے کے تاثرات!............

شرمیلا: اور چائے۔

آنند: No thanks

شرمیلا: دیکھئے مجھے کل کے رویہ پر افسوس ہے۔ I am really very sory

آنند: No پلیز No ایسا مت کہیے، ہاں ایک بات ضرور جاننا چاہوں گا۔

شرمیلا: جی۔

آنند: میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ تمہیں کون سا روگ اندر ہی اندر کھائے جا رہا ہے..... تم جوان ہو..... خوبصورت ہو...... مجھے بتاؤ تمہیں آخر کیا دُکھ ہے، خاموش کیوں رہتی ہو۔ خاموشیوں میں رہنا کیوں پسند کرتی ہو۔

شرمیلا: نہ پوچھئیے تو اچھا ہے میرے لئے..........آپ کے لئے۔

آنند: تم کچھ چھپانا چاہتی ہو۔ تمہاری مرضی، میں مجبور نہیں کر سکتا......شاید تمہاری کوئی مجبوری ہو......اچھا یہ تو بتاؤ۔

شرمیلا: کیا۔

آنند: کیا تم شادی شدہ ہو۔

شرمیلا: شادی......(تلخ لہجے میں) مجھے مردذات سے نفرت ہے۔

آنند: میں بھی مرد ہوں۔ مردذات سے تعلق رکھتا ہوں۔

شرمیلا: یہاں رہنا میری مجبوری ہوسکتی ہے یا میری چاہت۔

آنند: نفرت جیسا لفظ میرے لئے نیا ہے اور پھر میں نے محبت یا نفرت کے بارے میں تم سے کچھ پوچھا نہیں، میں تو صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ کیا تم شادی شدہ ہو۔

شرمیلا: نہیں۔

آنند: اور تمہارے گھر کے دوسرے افراد، ماں باپ، بہن بھائی، کام کاج، وہاں کا ماحول۔

شرمیلا: میرا کوئی گھر نہیں، میرا گھر ہوتا تو شاید میں یہاں نہ آتی...... دیکھئے مجھے نازی اچھی لگتی ہے میں اس کی دیکھ بھال کرتی رہوں گی۔

آنند: شرمیلا میں نازی کی بات نہیں کر رہا ہوں، وہ تم سے کافی مانوس ہو چکی ہے اُس کو تمہاری اتنی ہی ضرورت ہے جتنی کہ تم کو اُس کی، بن ماں کی بچی ہے، اُسے ایک ماں کے پیار کی ضرورت ہے اور مجھے اس بات کا احساس ہے کہ تم وہ پیار دینے کی

بھر پور کوشش کر رہی ہو۔

............دور سے بچی کے رونے کی آواز اُبھرتی ہے

آنند: نازی جاگ چکی ہے، وہ رو رہی ہے تم جا کر دیکھ لو۔

شرمیلا: جی ہاں۔ جا رہی ہوں۔

بچی کے رونے میں شدت آجاتی ہے اور فیڈ اوٹ! ہلکی ہلکی موسیقی اُبھرتی ہے۔

کہانی کار: میری کہانی آگے بڑھتی جا رہی ہے، یہ کہانی نئے زاویئے اپنائے جا رہی ہے۔ یہ بھی بتادوں کہ شرمیلا جتنی دیر بھی آنند کے گھر میں رہی اُس نے نازی کے علاوہ کسی اور چیز میں دلچسپی نہیں لی۔ اب تو شرمیلا کو اس گھر میں رہتے ہوئے ایک ماہ کا عرصہ گزر چکا تھا اور اب اُس کی خاموشی اس خاموش ماحول کا ایک حصہ بن چکی تھی......کئی دن بعد......ایک رات............

رات کا سماں............دور سے کسی کُتے کے بھونکنے کی آواز

اور فیڈ اوٹ............!

کہانی کار: نازی کے رونے کی آواز سنائی دی۔

(نازی کے رونے کی آواز اُبھرتی ہے)

کہانی کار: آنند گھبرا گیا......گھبرا کر شرمیلا کے کمرے کی جانب بھاگا......نازی بستر پر اکیلی پڑی ہوئی تھی۔ رو رہی تھی حیران حیران آنکھوں سے اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی اور شرمیلا فرش پر پڑی ہوئی تھی۔ اُس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

موسیقی کی ایک لہر اور فیڈ اوٹ!

آنند: کیا ہوا شرمیلا......تم کچھ بتانا چاہتی ہو......بولو نا......بولنے کی کوشش کرو......توڑو اس خاموشی کو......Oh my GOD اس کے ہاتھ تو بے حس ہو چکے ہیں۔......شرمیلا ......شرمیلا......ہوش میں آؤ......کچھ بولنے کی کوشش کرو......ڈاکٹر......ڈاکٹر کو لانا

پڑے گا............ مگر رات کا یہ سمے ......نہیں نہیں مجھے جانا ہوگا۔.....شرمیلا اب میری ذمہ داری ہے۔

کتے کے بھونکنے میں شدت ......قدموں کی آہٹ ......اور

پھر گاڑی اسٹارٹ ہونے اور چلنے کے تاثرات...........!

فیڈ اوٹ..........

ہاسپٹل کا ماحول..........

شرمیلا: ہیں......میں کہاں ہوں ......یہ کون سی جگہ ہے۔

آنند: شرمیلا، تم نرسنگ ہوم میں ہو، ......ڈاکٹر تمہاری دیکھ بھال کر رہے ہیں۔

شرمیلا: اور نازی......وہ کہاں ہے۔

آنند: نازی بالکل ٹھیک ہے تم اپنے آپ کو سنبھال لو.........

شرمیلا: میرے ہاتھ......میرے ہاتھ

آنند: کیا ہوا تمہارے ہاتھوں کو........... ذرا دیکھوں تو ......Oh my God۔تمہارے ہاتھ تو......ڈاکٹر...........

شرمیلا: رُک جائیں آنند صاحب......اچھا ہی ہوا کہ میرے ہاتھ بے کار ہو گئے ......یہ اسی قابل تھے۔میرے یہ دونوں ہاتھ خون سے رنگے ہوئے ہیں، ان ہی ہاتھوں نے ایک معصوم......ایک سندر......ایک خوبصورت بچی کا خون کیا ہے......

(موسیقی کی ایک تیز لہر)

آنند: (گھبرا کر) تم نے۔تم نے خون کیا ہے، ایک بچی کا...... یہ ہاتھ خون سے رنگے ہوئے ہیں۔کون تھی وہ بچی، کس کی بچی تھی......تم......تم سنگ دل ہو......نہیں ایسا نہیں ہوسکتا تم خون نہیں کر سکتی......اور میری نازی......میری بیٹی......میرا اعتماد......میرا بھروسہ۔

(قدموں کی آہٹ اُبھرتی ہے)

آنند: آیئے آیئے ڈاکٹر صاحب

ڈاکٹر: How is the patient now

آنند: Patient کے سامنے ہے.......... دیکھ لیجئے اور سُن بھی لیجئے۔

ڈاکٹر: (ہنستے ہوئے) دیکھنے ہی تو آیا ہوں.......... سننا بھی چاہوں گا...... لیکن لگتا ہے کہ آپ بھی کچھ سنانا چاہتے ہیں۔

آنند: جی ہاں...... ذرا میرے ساتھ آیئے just for a second..........

ڈاکٹر: As you please چلئے۔

(قدموں کی آہٹ)

ڈاکٹر: اب کہیئے۔

آنند: آپ جانتے ہیں ڈاکٹر شرمیلا کے دونوں ہاتھ بے حس ہو چکے، حرکت نہیں کر سکتے اُن میں کوئی قوت نہیں۔

ڈاکٹر: ہاں جانتا ہوں.......... میں نے کل ہی محسوس کیا تھا۔

آنند: اس کی کوئی وجہ تو ہو گی۔

ڈاکٹر: Shock..........ان ہاتھوں کی بے حسی سے اُس کی زندگی کے کسی پُر اسرار معاملے کا گہرا تعلق ہو سکتا ہے۔ یہ معاملہ کیا ہے، یہ صدمہ کیا ہے، میں ابھی کچھ نہیں کہہ سکتا، یہ سب جاننے کے لئے اس کے ماضی میں جھانکنا ہو گا۔ آپ کیا جانتے ہیں اس کے ماضی کے بارے میں۔

آنند: absolutely nothing میں تو شرمیلا کو صرف چند مہینوں سے جانتا ہوں۔

ڈاکٹر: ان چند مہینوں میں آپ نے کیا دیکھا۔

آنند: اس کی خاموشی کے سوا کچھ نہیں اور نازی سے اس کی بے پناہ محبت...... ہاں ایک اہم بات...... ابھی ابھی آپ کے آنے سے چند لمحے پہلے شرمیلا مجھے بتا رہی تھی اُس

نے اِن ہاتھوں سے ایک بچے کا قتل کیا ہے۔

ڈاکٹر: (حیران ہوکر) قتل، کس بچے کا قتل ....اور..........اور......

آنند: اور کچھ نہیں......وہ کہہ رہی تھی کہ اُس کے ہاتھ خون سے رنگے ہوئے ہیں اسی لئے دونوں ہاتھ بے کار ہو گئے۔

ڈاکٹر: (آہ بھر کر) اب تو مجھے اس کیس کو ایک نئے زاوئے سے دیکھنا ہوگا۔......چلئے...... میں بھی بات کرتا ہوں۔

(موسیقی......فیڈ اوٹ)

ڈاکٹر: مجھے یقین نہیں آرہا ہے۔

شرمیلا: کس بات کا ڈاکٹر؟

ڈاکٹر: آپ کے ہاتھ خون بھی کر سکتے ہیں۔

شرمیلا: لیکن یہ ایک حقیقت ہے۔

ڈاکٹر: (ذرا اُونچے لہجے میں) کیوں کیا تھا آپ نے یہ خون، کس لئے......کس کی جان لی تھی آپ نے؟

شرمیلا: (روتے روتے) میں خود نہیں جانتی، کچھ بھی نہیں جانتی۔

ڈاکٹر: یا آپ بتانا نہیں چاہتیں۔

شرمیلا: ڈاکٹر..........

ڈاکٹر: مسٹر آنند، آپ مجھے ملئے گا میرے چیمبر میں Afternoon......آپ آسکتے ہیں ......تین بجے کے قریب......

آنند: Alright Doctor..........میں آؤں گا۔

ڈاکٹر: اور آپ مس شرمیلا..........اپنے ہاتھوں کو ہلانے کی کوشش کیجئے۔ان میں طاقت پیدا کرنے کی کوشش کی..........All the best

............ہلکی موسیقی اور فیڈ اوٹ............

وال کلاک پر تین بجے کی صدا

آنند: اندر آ سکتا ہوں ڈاکٹر۔

ڈاکٹر: آیئے آیئے............میں آپ ہی کا انتظار کر رہا تھا۔ یہاں بیٹھے میرے قریب۔

آنند: Thank you............اب کہیے۔

ڈاکٹر: شرمیلا کی حالت پہلے سے بہتر ہے اور آپ اُسے گھر لے جا سکتے ہیں لیکن اب میرے لئے یہ جاننا ضروری ہو گیا ہے کہ کیا واقعی شرمیلا کسی بچی کے قتل میں ملوث ہے اگر ہے تو پولیس کو اطلاع دینا میرا فرض بنتا ہے لیکن............

آنند: لیکن کیا؟

ڈاکٹر: مجھے یہ ایک نفسیاتی کیس لگتا ہے میں اس بیماری کی تہہ میں جانا چاہتا ہوں، لندن سے آج کل ایک ماہرِ نفسیات آئے ہیں۔ میں اُس سے بات کر چکا ہوں، وہ اس کیس میں دلچسپی لینے لگے ہیں وہ شرمیلا سے ملنا چاہتے ہیں اور اپنے انداز سے بات کرنا چاہتے ہیں، وہ یہاں آ رہے ہیں کل صبح دس بجے۔

آنند: کیا اُس وقت میرا یہاں رہنا ضروری ہے۔؟

ڈاکٹر: نہیں بالکل نہیں............البتہ آپ کو اپنی بچی کو یہاں لانا پڑے گا............ڈاکٹر کے آنے سے پہلے ہی آپ اپنی بچی کو شرمیلا کے پاس چھوڑ جائے۔

آنند: لیکن............

ڈاکٹر: گھبرائے نہیں، ہم لوگ آس پاس ہی ہوں گے اور پھر شرمیلا کے ہاتھ تو بے حس ہو چکے ہیں۔

آنند: چلتا ہوں............

............(ہلکی موسیقی اور فیڈ اوٹ)............

کہانی کار:...... اب میری کہانی ایک نئے رُخ کو اپنائے جاری ہے، میں اکثر دوسروں کی کہانیاں لکھتے لکھتے اپنی کہانی تلاش کرنے لگتا ہوں، مجھے تو اپنی پوری کہانی ایک بکھری ہوئی داستان کی صورت میں نظر آتی ہے، کبھی کبھی لگتا ہے جیسے شبنم کے قطرے کنول کے پھولوں پر بکھر گئے ہوں اور ایک اَن دیکھی سی تمنا دِل کے گوشے میں دھڑکنے لگی ہو............ دیکھئے میں شرمیلا کی کہانی سجاتے سنوارتے اپنا ذکر چھیڑنے لگا، حقیقت تو یہ ہے کہ جو چیز ہماری نہیں ہماری کیسے ہوسکتی ہے لیکن جب تک وہ ہمارے پاس ہے وہ ہماری ہی ہے۔

............ہلکی موسیقی

شرمیلا: آپ دوسری شادی کیوں نہیں کرتے۔؟

آنند: اس کے بارے میں سوچا نہیں۔

شرمیلا: سوچنا چاہئے۔

آنند: کیوں؟

شرمیلا: نازی کے لئے اپنی بچی کے لئے، اُس کی زندگی کے لئے، آپ کی اپنی زندگی کے لئے۔

آنند: جو میری تھی اس نے ساتھ چھوڑ دیا۔

شرمیلا: کیا وہ آپ سے محبت کرتی تھی۔؟

آنند: بے تحاشا۔

شرمیلا: اور آپ؟

آنند: بے تحاشا...... بے حد۔

شرمیلا: کیا آپ محبت میں یقین رکھتے ہیں؟

آنند: ہاں بالکل...... میں سمجھتا ہوں محبت زندگی ہے، محبت انتظار ہے، محبت اُمید ہے۔

شرمیلا: نہیں یہ سب جھوٹ ہے۔

آنند: تم نے کبھی کسی سے محبت کی؟

شرمیلا: محبت......نہیں (اونچی آواز میں) نہیں مجھے نفرت ہے اس لفظ سے۔

آنند: شرمیلا......آہستہ......آہستہ بولو۔ یہاں دوسرے مریض Disturb ہوں گے۔ ہاں میری ایک بات کا جواب دو کیا میری بیٹی نازی تمہیں اچھی لگتی ہے۔

شرمیلا: (آہستہ سے) ہاں......بہت اچھی، بہت پیاری......

آنند: تمہیں وہ اس لئے اچھی اور پیاری لگتی ہے کیونکہ تم اُسے محبت کرتی ہو، اُسے چاہتی ہو۔

شرمیلا: ہاں......شاید......لیکن میں تو اُسے بھی محبت کرتی تھی...... مجھے وہ بھی اچھی لگتی تھی۔

آنند: وہ کون؟

شرمیلا: جس کا میں نے قتل کیا......اپنے ہاتھوں سے زندگی ختم کردی، اُس کی سانسوں کو چھین لیا۔

شرمیلا رونے لگتی ہے......!

ہلکی موسیقی اور فیڈ اوٹ......!

کہانی کار: لندن سے آیا ہوا ماہر نفسیات کئی بار شرمیلا سے ملا، دونوں کے درمیان خوب باتیں ہوتی رہیں اور اس طرح کہانی کا ایک پوشیدہ گوشہ نظروں کے سامنے آیا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ میری یہ کہانی ایک ایسا رُخ اپنائے گی، ایک پُر اسرار اور دل دہلا دینے والا رُخ......جی ہاں اب اس کہانی کا یہ پُر اسرار حصّہ ڈاکٹر کی زبانی سنتے ہیں۔

(ہلکی ہلکی موسیقی اُبھرتی ہے اور اس پسِ منظر میں ڈاکٹر کی آواز سنائی دیتی ہے)

ڈاکٹر: شرمیلا ایک متوسط گھرانے میں پیدا ہوئی یہ ماں باپ کی سب سے خوبصورت بیٹی ہے، شرمیلا کی تین اور بھی بہنیں ہیں، ماں اکثر بیمار رہتی ہے باپ کو پینے کی لت ہے وہ کوئی کام نہیں کرتا، ماں بیمار ہونے کی وجہ سے کام کرنے کے قابل نہیں، چونکہ شرمیلا سب سے بڑی بیٹی ہے اس لئے سب کی بھوک مٹانے کے لئے اس کو کام کرنا پڑتا ہے اور وہ کام کرتی رہی لیکن ایک دن اسے زندگی کا سب سے بڑا صدمہ

برداشت کرنا پڑا، اس کی ماں نے ایک بیٹی کو جنم دیا، اس کی صورت شرمیلا سے بہت ملتی جلتی تھی ۔ ماں کی محبت اور شفقت جواب تک شرمیلا کے لئے محفوظ تھی اب وہ نوزائید بچی کے حصّے میں آ گئی ۔ اب گھر میں اُسے کوئی پیار نہیں مل رہا تھا وہ صرف پیسہ کمانے والی مشین بن کر رہ گئی تھی ......

............ہلکی ہلکی موسیقی

آنند: پھر کیا ہوا ڈاکٹر

ڈاکٹر: اُسے نفرت ہو گئی ، اپنے آپ سے ، اپنے گھر سے ...... اپنی بہنوں سے ...... وہ گھر سے بھاگ گئی ۔

آنند: اور یہاں آ گئی ۔

ڈاکٹر: نہیں ...... کسی اور جگہ گئی اور اُس نئی جگہ ، نئے گھر میں وہ ایک سندر سی لڑکی کی میڈ بن گئی ۔

آنند: جیسے ہمارے ہاں ۔

ڈاکٹر: ہاں ...... کچھ دن وہاں کام کیا ، بچی کی پرورش کرتی رہی ...... ایک رات وہ خوبصورت ، سندر سی بچی ......

آنند: (گھبرا کر) کیا ہوا اُسے ۔

ڈاکٹر: مر گئی ...... گھٹن کی وجہ سے ۔

آنند: (زور سے) No

ڈاکٹر: ہاں وہ بچی مر گئی ، گھٹن کی وجہ سے ...... اُس کا گلا دبا کر ...... اس کی سانسیں روک کر ۔

آنند: ڈاکٹر ...... پلیز ...... No ...... No

ڈاکٹر: مسٹر آنند ایسا ہی ہوا ......

آنند: لیکن شرمیلا ....

............موسیقی کی ایک تیز لہر............

شرمیلا: وہ بچی گھٹن سے مرگئی، شرمیلا نے اپنے ہاتھوں سے اُس کی سانسیں روک لیں۔

آنند: اور پھر وہ یہاں آگئی۔

ڈاکٹر: اور ایک دن نازی کو بھی ختم کر دیتی ......لیکن ایسا نہیں ہوا......اُس کی بھی وجہ ہے؟

آنند: کیسی وجہ............

ڈاکٹر: اُسے اپنی کمزوری کا علم تھا وہ جانتی تھی کہ کسی جنونی لمحے میں وہ کچھ بھی کر سکتی ہے لیکن وہ نازی کو چاہنے لگی تھی، ایک طرف محبت اور دوسری جانب خوف اور جنوں......اور پھر اُس رات شرمیلا کے ذہین پر جنون سوار ہو گیا، اُس نے وائلن بجانا چاہا لیکن وائلن کے تار ٹوٹ چکے تھے، نازی اُس کے سامنے تھی، خاموشی سے سو رہی تھی ......ہر سمت خاموشی طاری تھی............نہ کوئی شور اور نہ کوئی آواز............

آنند: پھر؟

ڈاکٹر: اُس کی آنکھوں میں خونی چمک اُبھری اور اُس کے ہاتھ نازی کے گلے کی جانب بڑھے وہ وہی کرنے جا رہی تھی جس کا اُسے ڈر تھا لیکن اچانک ....

............موسیقی کی ایک تیز لہر............

آنند: پھر؟

ڈاکٹر: اچانک اُس کے ہاتھ ساکن ہو گئے............بے حرکت ہو گئے............

آنند: کیسے............کیا ایسا ممکن ہے From medical point of view ؟

ڈاکٹر: یہ ایک نفسیاتی کیس ہے مسٹر آنند......ایسا ممکن ہے اور ایسا ہی ہوا ہے۔ آپ خوش نصیب ہیں کہ آپ کی بچی کو ایک نئی زندگی مل گئی۔

آنند: اور شرمیلا............

ڈاکٹر: وہ عارضی طور پر ٹھیک ہو سکتی ہے، صحت مند ہو سکتی ہے لیکن کسی ان دیکھے لمحے میں

اُس کا توازن بگڑ سکتا ہے اور اگر اس لمحے میں نفرت نے اُس کے پیار پر غلبہ پالیا تو وہ کچھ بھی کر سکتی ہے۔

..........بہت دور سے کسی بچی کے رونے کے تاثرات..........!

آنند: میری بچی ....میں آرہا ہوں ....ڈاکٹر ......ڈاکٹر میری بچی رو رہی ہے ......وہ مجھے تلاش کر رہی ہے......میں جا رہا ہوں ڈاکٹر۔

..........موسیقی اور فیڈ اوٹ..........

..........شام کا وقت..........

آنند: سو جاؤ میری بچی ....سو جاؤ ....کل میں تمہارے لئے ڈھیر سارے کھلونے لاؤں گا......اچھے اچھے Toys......پھر تم اُن سے کھیلو گی......Enjoy کرو گی ......میری بچی کو نیند آرہی ہے، میری بیٹی سو رہی ہے۔ ہاں سو رہی ہے۔

..........موسیقی اور فیڈ اوٹ..........

صبح کا وقت..........

فون کی گھنٹی بجتی ہے..........

آنند: (ریسور اٹھاتے ہوئے) آنند بول رہا ہوں۔ ڈاکٹر صاحب آپ......سب ٹھیک ہے نا

ڈاکٹر: آپ نے شرمیلا کے بارے میں کچھ سوچا ہے۔

آنند: میں نے اس کے گھر والوں کو ڈھونڈ نکالا ہے اور وہ لوگ کل شام تک یہاں آجائیں گے

ڈاکٹر: Thatisgood وہ شرمیلا کو لے جائیں گے نا۔

آنند: انہیں شرمیلا کو لینا ہی ہوگا۔

ڈاکٹر: ہاں مسٹر آنند..........میں دراصل یہی کہنا چاہتا تھا۔ شرمیلا کا آپ کے گھر میں رہنا مناسب نہیں ہوگا۔ یوں تو وہ پوری طرح سے ہوش میں رہنے کی کوشش کرتی ہے لیکن اس کا ذہنی توازن کبھی بھی بگڑ سکتا ہے اور..........

آنند: اور کیا ڈاکٹر

ڈاکٹر: وہ کچھ بھی کر سکتی ہے......اور ہاں جب بھی وہ لوگ شرمیلا کو لینے آئیں گے تو مجھے Inform کر لیجئے۔

آنند: ضرور ڈاکٹر

............ہلکی ہلکی موسیقی

کہانی کار: اور اب کہانی کار کو اجازت دیجئے...........میری کہانی اختتام پذیر ہو چکی ہے۔......

عجیب بات ہے، اپنا تجربہ بتا رہا ہوں...........کبھی کبھی کہانی کار لکھنا کچھ چاہتا ہے لیکن کچھ اور لکھ جاتا ہے...........اور یوں زندگی کی ان گنت بے ترتیب کہانیاں ترتیب پاتی ہیں...........!!

............ہلکی ہلکی موسیقی اور فیڈ اوٹ...........

The End

...........OO...........

کتاب : اردو زبان وادب پر عربی کے اثرات

مصنف : ڈاکٹر سید علیم اشرف جائسی

مترجم : محمد طارق

مبصر : امیر حمزہ

زیرِ تبصرہ کتاب کے مصنف عربی زبان و ادب کے مشہور و مستند عالم پروفیسر علیم اشرف جائسی ہیں۔ کتاب کا اردو ترجمہ محمد طارق نے کیا ہے۔ جہاں تک ترجمہ کی بات ہے تو ترجمہ فنی طور پر بہت ہی عمدہ اور سلیس ہے اس میں معنوی ترسیل کی مکمل کوشش ملتی ہے، بلکہ زبان سے یہ احساس ہوتا ہی نہیں کہ یہ ترجمہ ہے۔ یہ کتاب چار ابواب پر مشتمل ہے اور تمام ابواب میں کل فصول کی تعداد چودہ ہے۔ پہلے باب میں اردو زبان کی نشو ونما اور ارتقا پر ایک تاریخی جائزہ ہے۔ اردو زبان کی نشو نما پر جتنے بھی نظریے ہیں ان میں سے انہوں نے ہندوستانی، پنجابی اور ہریانوی نظریات پر بحث کی ہے۔ اس پر گفتگو کرتے ہوئے مصنف کو ''ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہر کسی نے اپنے نظریے کے اثبات پر توجہ دینے کے بجائے دوسروں کے خیالات و آراء کی تردید وابطال پر زیادہ توجہ دی ہے۔'' ارتقاء کی فصل میں دس مقامات وادوار کے ساتھ صوفیا کا بھی خصوصی تذکرہ ہے جن میں سے اکثر کا تعلق تشکیلی دور سے ہے۔ دوسرے باب میں اردو لغات پر عربی زبان کے اثرات پر تفصیلی گفتگو کی گئی ہے۔ اس باب کی تمہید پر وہ دلچسپ باتیں بھی لکھتے ہیں کہ عربی زبان میں تمدن، حکومت اور فرنیچر سے متعلق الفاظ کی بڑی تعداد فارسی سے، علم وفلسفہ سے متعلق یونانی سے، زراعت کے الفاظ نبطی سے، دینی رسومات عبرانی یا سریانی سے، مسالہ، دوا اور خوشبو وغیرہ کے الفاظ ہندی الاصل سے آئے ہیں۔ دو زبانوں کے درمیان

آپسی رشتہ کیسے قائم ہو جاتا ہے اس پر بھی معروضی گفتگو ہے۔ جیسے آج کے دور میں ہم سمجھ سکتے ہیں کہ اردو سمیت کئی زبانوں میں سائنس اور جدید ایجادات کے متعلق الفاظ انگریزی سے بلا کسی تغیر و تبدل کے آرہے ہیں۔ اس باب میں دو فصلیں ہیں۔ پہلی فصل میں ان عربی الفاظ کا ذکر ہے جو بغیر کسی لفظی و معنوی تصرف کے اردو میں استعمال ہوتے ہیں۔ اس فصل کے حاشیے میں انہوں نے سمیر عبدالحمید ابراہیم کی لغت کا ذکر کیا ہے جس میں ہزاروں ایسے عربی الفاظ شامل کردیے گئے ہیں جو نہ کسی اور دوسری اردو لغت میں موجود ہیں اور نہ ہی اردو والے اس کو بولتے ہیں۔ حاشیہ میں ہی انہوں نے سینکڑوں الفاظ کے متعلق تلفظ کی تفریق کا ذکر کیا ہے۔ دوسری فصل میں ان الفاظ کا ذکر ہے جو لغت میں لفظی، معنوی یا دونوں قسم کے تغیر کے ساتھ درج ہیں۔ اس فصل میں انہوں نے لفظی تغیر کے چار اور معنوی تغیر کے چھ اسباب بیان کئے ہیں ساتھ ہی صوتی و دلالتی تغیر کی چھبیس اقسام کا ذکر کیا ہے۔ ایسے الفاظ کی تعداد تقریباً دو ہزار ہے، اس میں انہوں نے ہر لفظ کا اردو معنی اور عربی معنی کا ذکر الگ الگ کیا ہے۔ اس کے بعد دو سو سے زائد ان الفاظ کا ذکر کیا ہے جو اردو میں استعمال ہوتے ہیں لیکن عام بول چال میں حرکاتی تغیر واقع ہو چکا ہے۔ اس باب کی تیسری فصل میں ان عربی الفاظ کا ذکر کیا گیا جن کے ساتھ غیر عربی لاحقے اور سابقے آ گئے ہیں۔ چوتھی فصل میں ان عربی مرکبات کا ذکر ہے جن کا ذکر اردو میں بکثرت ہوتا ہے بلکہ وہ روزمرہ کی زبان میں بھی مستعمل ہیں جیسے فی الحقیقت، فارغ البال وغیرہ۔ تیسرا باب اردو زبان کے علوم پر عربی زبان کے اثرات پر ہے۔ اردو زبان جب انیسویں اور بیسویں صدی میں بہت ہی زیادہ متعارف ہوگئی، ہر طرف لکھی اور پڑھی جانے لگی یہاں تک کہ ذریعہ تعلیم بھی اردو ہی ہوگئی اور اردو زبان میں علوم کی تعداد میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ جو علوم پہلے عربی زبان میں پڑھائے جاتے تھے وہ اب اردو زبان میں پڑھائے جانے لگے۔ اگر صرف علوم کی بات کی جائے تو کئی علوم ہیں جو پہلے عربی زبان میں پائے جاتے تھے وہ اب اردو زبان میں بھی ہیں جن سے اصطلاحات واسماوصفات براہ راست عربی زبان سے ہی آئے ہیں جیسے علوم حکمت وکلام وفلسفہ ودیگر لیکن یہاں مصنف نے صرف ان علوم کو شامل کیا ہے جن کا تعلق داخل زبان سے ہے جیسے

پہلی فصل میں بلاغت سے علم بیان، معانی اور بدیع۔ دوسری فصل میں عروض وقافیہ۔ تیسری فصل میں صرف ونحو۔ چوتھی فصل میں رسم الخط واملا اور پانچویں فصل میں تنقید کے اردو زبان پر اثرات کیا ہیں۔ واضح ہو کہ ان علوم میں عربی کا اثر اردو زبان میں اتنا زیادہ ہے کہ گویا یوں سمجھ لیا جائے کہ تمام اصطلاحات کو ہو بہو نقل کر دیا گیا ہے۔ چوتھے باب میں اردو ادب پر عربی زبان کے کیا اثرات مرتب ہوئے ہیں اس پر گفتگو ہے۔ اس میں تین فصلیں ہیں۔ پہلی فصل میں مجموعی اثرات کا ذکر ہے جس میں مفردات، تلمیحات، تشبیہات واستعارات، اصطلاحات وتراکیب وغیرہ پر گفتگو ہے ۔ دوسری فصل میں اردو نثر پر عربی کے اثرات کو پیش کیا گیا ہے، نثر کی جو اقسام عربی میں پائی جاتی ہیں وہ اردو میں بھی پائی جاتی ہیں نام بھی وہی ہیں اس کے علاوہ چند نثری اصناف وہ ہیں جن کا تعلق عربی زبان وادب سے رہا ہے جیسے تحریری قصے، خطبات، خطوط ومکاتیب، سیرت وسوانح، ادبی مقالات۔ اردو کی دینی تحریروں پر عربی کے اثرات کا مختصر ذکر کیا گیا ہے اگر اس کی تفصیل میں جاتے تو شاید اتنی ہی ضخیم ایک اور کتاب تیار ہو جاتی۔ تیسری فصل میں پہلے تو مجموعی طور پر اردو شاعری پر عربی زبان کے اثرات پر گفتگو ہوئی ہے اس کے بعد عربی شاعری اور فارسی شاعری کے اردو زبان پر کیا اثرات مرتب ہوئے ہیں اس پر بات کی گئی ہے۔ اردو اور عربی اصناف شعر جیسے قصیدہ، غزل، مرثیہ، مثنوی اور رباعی جن کا سرا عربی زبان سے ملتا ہے اور اردو میں براہ فارسی منتقل ہوئی ہیں۔ رباعی میں اشکال بھی ہو سکتا ہے لیکن اتنا تو واضح ہے کہ اس کے اوزان وارکان عربی سے ہیں ہے۔ الغرض یہ کتاب مکمل دستاویز ہے ان تمام عناصر کے لیے جن کا ورود اردو میں عربی سے ہوا ہے۔ اس کتاب کی تصنیف میں جس قدر محنت کی گئی ہے وہ جدید محققین کے لیے مثال ہے اور مترجم کی محنت صاف جھلکتی ہے کہ انہوں نے کس جانفشانی سے تمام چیزوں کو اردو کے ماحول میں ڈھال کر پیش کر دیا۔ قومی کونسل کا شکریہ کہ اس نے اس قیمتی علمی وتحقیقی سرمایے کو شائع کر کے بین لسانی روابط کو منظر عام پر لایا۔

..........OO..........
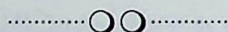
کتاب : ''قرون وسطیٰ میں مسلمانوں کے سائنسی کارنامے''

مصنف : ڈاکٹر غلام قادر لون

مبصر : ناظم نذیر

ممتاز اسکالر و محقق ڈاکٹر غلام قادر لون کی مختلف موضوعات کے تحت درجنوں کتابیں اب تک منظر عام پر آچکی ہیں۔ موصوف نے عصر حاضر میں ماضی کے مسلمانوں کی علمی وفنی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کے لئے زیرِ تبصرہ کتاب ''قرون وسطیٰ میں مسلمانوں کے سائنسی کارنامے'' کو منظر عام پر لا کر ایک انقلابی اور تاریخ ساز کام انجام دیا۔ 447 صفحات پر مشتمل زیر تبصرہ کتاب میں علم اور سائنس پر پندرہ مضامین فصیح و بلیغ انداز اور تحقیقاتی بنیادوں پر تحریر کئے گئے ہیں۔ علم و سائنس پر مبنی موضوعات علم کا مقام، تاریخ نگاری، جغرافیہ، معدنیات، نباتیات حیوانیات، علم الکیمیاء، طبیعات، فلکیات، ریاضیات، طب، فلسفہ شامل ہیں اور یہ موضوعات تقریباً پورے سائنسی علوم کا احاطہ کرتے ہیں۔ کتاب ''قرون وسطیٰ میں مسلمانوں کے سائنسی کارنامے'' کا جو طالب علم دلچسپی اور فکرمندی کے ساتھ مطالعہ کرے گا ان کے خدشات و تحفظات اس حوالے سے دور ہوں گے کہ مسلمانوں کا سائنسی علوم وفنون اور ٹیکنالوجی میں کوئی رول نہیں ہے بلکہ یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ مسلمانوں نے اپنے اسلاف کے کارناموں اور ان کی علمی وفنی صلاحیتوں کو نظر انداز کر کے مادہ پرستی کی طرف اپنی توجہ مرکوز کی ہے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی جس سے دنیا نے ایک نیا رخ اختیار کیا ہے مسلمانوں کا بھی کوئی رول رہا ہے؟ اس گمان کو حسن ظن میں تبدیل کرنے کیلئے ڈاکٹر غلام قادر لون صاحب کی زیر تبصرہ کتاب بین ثبوت ہے۔ کتاب کے ''پیش لفظ'' میں ڈاکٹر رفعت نے لکھا ہے:

''اردو زبان میں ایسی کتابیں نہ ہونے کے برابر ہیں جن
میں مسلمانوں کے سائنسی کارناموں کا تذکرہ کیا گیا ہو۔''

زیرِ تبصرہ کتاب کے ''مقدمہ'' کے ابتدائی اقتباس میں ڈاکٹر لون صاحب نے فرمایا:

''ہمارا عہد سائنس کا عہد ہے۔زندگی کے ہر شعبہ پر سائنس کی حکمرانی ہے''

زیر تبصرہ کتاب اسی متاع گمشدہ کی بازیافت کے لئے مسلمان طلبہ کو آشنا کرنے کی ایک کامیاب کوشش ہے۔ کتاب کا پہلا موضوع ''علم کا مقام'' ہے۔یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ انسان معرض وجود میں لانے کے ساتھ ہی اس کو علم کی دولت سے سرفراز کیا گیا۔ کتاب کا دوسرا موضوع ''تاریخ نگاری'' Historiography ہے۔ مسلمانوں کی تاریخ بابائے آدم سے شروع ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ کا نسخہ کیمیا قرآن پاک کا بیشتر حصہ تاریخی واقعات پر مبنی ہے اور اللہ تعالیٰ نے بنی نوع انسان کیلئے جہاں ضابطہ حیات مرحمت فرمایا ہے وہیں قوموں کے تاریخی واقعات سے متعلق جانکاریاں فراہم کر کے عبرت اور نصیحت حاصل کرنے کی تاکید بھی فرمائی۔ ''تاریخ نگاری'' کے موضوع میں ڈاکٹر صاحب نے تفصیل کے ساتھ کہا ہے:

''قرآن مجید میں پچھلی امتوں کا تذکرہ بار بار آیا ہے۔اس لئے مسلمانوں کیلئے ان قوموں کے حالات سے واقف ہونا ضروری تھا۔ چنانچہ قرآنی واقعات کی تحقیقات کا جذبہ ہی مسلم تاریخ نگاری کیلئے اولین محرک ثابت ہوا''

زیر تبصرہ کتاب کا تیسرا موضوع علم جغرافیہ ہے اس حوالے سے موصوف رقم طراز ہیں:

''اسلام میں علم جغرافیہ کے فروغ میں عبادات اور معاملات دونوں نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ فریضہ حج کی ادائیگی کے لئے راستوں سے واقفیت، نماز کے قیام اور مسجد کی تعمیر کے وقت قبلے کا تعین، امور سلطنت کی انجام دہی اور تجارتی مقاصد کیلئے مختلف بلاد وامصار کے جغرافیائی محل وقوع سے آگاہی وہ محرکات تھے جنھوں نے مسلمانوں کو جغرافیہ کا علم حاصل کرنے پر آمادہ کیا چنانچہ عباسی دور میں جب ایرانی، ہندی اور یونانی کتابوں کے ترجمے ہونے لگے تو ثابت بن قرہ نے یونانی جغرافیہ دان بطلیموس کی کتاب Geographical

Treatise کو عربی کا جامہ پہنایا۔ یونانیوں کے علاوہ مسلمانوں نے ہندی
اور ایرانی جغرافیائی تصورات کا علم بھی حاصل کرلیا جس سے وہ اس قابل
ہوگئے کہ اس موضوع پر تحقیق وتصنیف کا آغاز کرسکیں''۔

اس طرح سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ علم جغرافیہ میں مسلمانوں نے مختلف تحقیقات اور تجربات کے ایسے تصورات کو سامنے لانے کیلئے کتابوں کی تصنیف بھی عمل میں لائی تاکہ آنے والی نسلیں اس بات سے بیگانہ نہ رہے کہ مسلمان علم جغرافیہ میں کسی سے کم نہیں ہیں۔

کتاب کا پانچواں موضوع ''نباتیات'' Botany '' سے متعلق ہے جس نباتیات Botany کی وضاحت کی گئی ہے یعنی پودوں کی سائنسی تعلیم، حیاتیات کی شاخ، پودوں سے متعلق مختلف اقسام کی تمثیلات، ڈاکٹر صاحب کی زیر نظر کتاب کے مطالعہ کے بعد قاری کو موضوع کے متعلق بہت حد تک اہم معلومات اور جانکاری حاصل ہوتی ہے۔ ڈاکٹر غلام قادر لون صاحب رقم طراز ہیں:

''عہد وسطیٰ کی ہزار سالہ مدت کے دوران مسلمانوں نے حیاتیات
Biology کے سائنس میں وقیع خدمات انجام دی ہیں۔ حالانکہ اس زمانے
میں یہ علم جدید خطوط پر مدون نہیں ہوا تھا۔ آج اس کی ایک شاخ نباتیات
Botany کہلاتی ہے۔ مسلم ماہرین کے یہاں دواسازی سے اس کا گہرا تعلق رہا
ہے۔ ہر پودا یا جڑی بوٹی کسی نہ کسی مرض کی دوا ہے۔ اس لئے مسلمانوں نے
نباتیات کی طبی افادیت کے پیش نظر اسے ''الادویۃ المفردہ'' کا نام دیا ہے''

اگرچہ پودے Living thing یعنی جاندار ہیں۔ لیکن ان کی خصوصیات سے متعلق جانکاری حاصل نہیں تھیں۔ محققین نے اپنی انتھک کوششیں جاری رکھتے ہوئے جنگلات اور بیابانوں میں اُگنے والی جڑی بوٹیوں اور پودوں کی خصوصیات سے متعلق تحقیقات کے بعد اس کا انکشاف کیا کہ کس پودے اور جڑی بوٹی میں کیا خاصیت ہے اور کس مرض کیلئے بطور دوا

استعمال میں لائے جاسکتے ہیں۔ مصنف نے حروف تہجی کی ترتیب کے اعتبار سے نباتات کے نام اوران کے عربی، یونانی، شامی اور فارسی مترادف بھی دیئے ہیں۔

آخر پر میں یہ وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ یہ کتاب قارئین کے لیے نہ صرف ادبی وعلمی اور غور وفکر کا ذریعہ بنے گی بلکہ اسلامی اور سائنسی علوم خاص کر مسلم سائنس دانوں کے سائنسی کارناموں حوالے کے سے ایک بیش قیمت اینسائیکلو پیڈیا کی حیثیت رکھتی ہے۔

..........OO..........
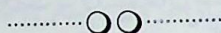
شعری مجموعہ: پردہ سخن کا
شاعر : نذیر آزاد
مبصر : سہیل سالم

زیر تبصرہ شعری مجموعہ ''پردہ سخن کا'' ڈاکٹر نذیر آزاد کا تیسرا مجموعہ ہے جس میں ٦٦ غزلیں اور ١٠ نظمیں شامل ہیں۔ اس مجموعے کو ان کی غزلوں کا انتخاب بھی کہا جاسکتا ہے۔ ان غزلوں کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ ان میں بھرتی کے اشعار نہیں، منتخب اور چنیدہ اشعار ہوتے ہیں۔ غالبا موصوف سطحی اشعار کو غزلوں سے نکال دیتے ہیں، جس میں ان کی شاعری کا عکس صاف نظر آتا ہے۔ صرف شاعری کا ہی نہیں بلکہ ان کی شخصیت، ان کے فن، ان کے خیالات، ان کے افکار اوران کے تجربات، مشاہدات کا بھی پرتو ملتا ہے۔ چند اشعار دیکھیں:

جو ہر دم میری عزت کر رہے ہو
کہو کس سے محبت کر رہے ہو

....

اسے بھی میری بات کا گلہ ہوا ہوگا
وہ ایک شخص جو خود سے نہیں جڑا ہوا ہوگا

....

دل میں کچھ کھلبلی سی رہتی ہے
جسم میں زندگی سی رہتی ہے

ڈاکٹر آزاد اشاروں اور کنایوں سے کام لینے کا ہنر جانتے ہیں۔ وہ زندگی کی حقیقتوں اور فلسفوں کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ اشعار کی لڑی میں پرو دیتے ہیں۔ سادگی کے ساتھ اپنی بات کو کہنے اور اپنا مدعا بیان کرنا آسان نہیں ہوتا مگر یہ فن بھی نذیر آزاد صاحب کو خوب آتا ہے۔ آزاد صاحب کی غزلوں کی خصوصیت یہ بھی ہے کہ ان کے افکار و تصورات کی دنیا محدود نہیں ہے۔ وسعت اور معنویت سے بھرپور ان کی غزلیں روح کی گہرائیوں میں اتر کر پیدا ہونے والی کیفیت کو جلا بخشتی ہیں۔ غزلوں کے ساتھ ساتھ اس مجموعے میں موجود کئی ایسی نظمیں ہیں مثلاً تاریخ کی نئی شاخ، محسوسات کی گداگری، وقت کی پالکی پر سوار شہزادی، تن خمیدہ سوچ کی امیدیں، سلوٹیں، یہ باتیں جھوٹی باتیں ہیں، جھنجھلاہٹ کا شرطیہ علاج، اعتراف شکست، زمیں کی صدائیں اور سفید کبوتروں کی آمد گہرے تاثرات کے ساتھ ساتھ دل و دماغ میں خاص کیفیت پیدا کرنے میں کامیاب ہیں اور قاری کے ذہن کو جھنجوڑ دیتی ہے نظم ''تاریخ کی نئی شاخ'' سے ایک بند پیش خدمت:

ہر روز تاریخ سے نئی شاخیں پھوٹتی ہیں
جو مستقبل کی زرخیزی کے بجائے
ماضی کے کھنڈروں میں
پیوست ہو جاتی ہیں
ان کھنڈووں میں
حکمرانوں کی عیاشیوں
اور رسہ کشیوں کے پتھر ابھی موجود ہیں
لیکن لوگوں کا گارا

تاریخ کی آنکھوں سے

کب کا بہہ چکا ہے

"پردہ سخن کا" کے مطالعے ومشاہدے کی بنیاد پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ نذیر آزاد صاحب دبستانِ جموں وکشمیر کے نمائندہ شاعر ہیں اوران کا تخلیقی تجربہ قابلِ قدر ہے انھوں نے بڑی اصلی وفطری شاعری کی ہے اور فکروفن دونوں کی حریت کا پاس ولحاظ رکھا ہے۔شعری مجموعہ کی طباعت بہت دیدہ زیب ہے۔ چھپائی اور کاغذ بہت عمدہ استعمال کیے گئے ہیں۔امید قوی ہے کہ نذیر آزاد صاحب کا یہ شعری مجموعہ "پردہ سخن کا" ادبی حلقوں میں بے حد مقبول ہوگا۔

............OO............
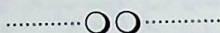
کتاب : جامع کشمیر کی اردو ادبی خدمات

مؤلف : محمد یٰسین گنائی

مبصر : ڈاکٹر گلزار احمد وانی

زیرِ تبصرہ کتاب "جامعہ کشمیر کی اردو ادبی خدمات" ستر سال پر محیط ایک دستاویز ہے۔ مذکورہ کتاب وادیٔ کشمیر کے ایک جواں سال سکالر ڈاکٹر محمد یٰسین گنائی نے تالیف کی ہے۔مذکورہ کتاب ایک ہزار صفحات پر مشتمل ایک ضخیم کتاب ہے۔

زیرِ تبصرہ کتاب کشمیر یونیورسٹی کی اردو ادبی خدمات پر مشتمل ہے جس میں شعبۂ اردو، اقبال انسٹی ٹیوٹ اور شعبۂ فاصلاتی نظامتِ تعلیم تینوں بڑے شعبہ جات سے متعلق معلومات ملتی ہے۔ مذکورہ کتاب میں مؤلف نے محنت شاقہ سے کام لے کر نہ صرف تینوں شعبوں کے تحقیقی کام کا اشاریہ ترتیب دیا ہے بلکہ ان کی تاریخی وادبی حیثیت بھی اجاگر کی ہے۔

مجموعی طور پر کتاب سات بڑے ابواب پر مشتمل ہے جس کے تقریباً ہر ایک باب

میں کئی ذیلی ابواب بھی فہرست میں دئے گئے ہیں۔ اُن ابواب کی فہرست کچھ اس طرح ہے۔

باب اوّل: جامع کشمیر ایک تعارف

باب دوم: جامع کشمیر کا قیام و مقصد

باب سوم: جامع کشمیر کے گرد و نواح میں تاریخی، مذہبی اور سیاحتی مقامات

باب چہارم: جامع کشمیر کا حصہ علمی و ادبی، مذہبی و تاریخی شخصیات کے فروغ میں

باب پنجم: شعبۂ اردو جامع کشمیر کی ادبی خدمات اور اس کے ذیلی ابواب کچھ یوں ہیں:

(ا) شعبۂ اردو......ایک تعارف (ب) تحقیقی مقالات (ایم فل اور پی ایچ ڈی)

(ج) سالانہ تحقیقی مجلّات، بازیافت (د) سمینار اور توسیعی خطبات

(ہ) تدریسی عملہ و ریسرچ گائیڈ (و) دیگر علمی و ادبی مشاغل

باب ششم: فاصلاتی نظامت تعلیم کی ادبی خدمات اور اس کے مندرجہ ذیل ذیلی ابواب بھی ہیں:

(ا) فاصلاتی نظامتِ تعلیم......ایک تعارف (ب) سالانہ رسالہ ''ترسیل''

(ج) علمی و ادبی مجالس (د) دیگر اردو ادبی خدمات (ہ) تدریسی عملہ

باب ہفتم: اقبال انسٹی ٹیوٹ کی ادبی خدمات اور اس کے ذیلی ابواب کچھ یوں ہیں:

(ا) اقبال انسٹی ٹیوٹ......ایک تعارف (ب) تحقیقی مقالات (ایم فل اور پی ایچ ڈی)

(ج) سمینار اور توسیعی خطبات (د) تحقیقی و تنقیدی مجلّہ اقبالیات

(ہ) مطبوعات (و) ریسرچ گائیڈ (نگران)

باب ہشتم: جامع کشمیر کے دیگر مراکز اور شخصیات کی ادبی خدمات اور آخر پر کتابیات بھی شامل کتاب ہے۔

زیرِ تبصرہ کتاب میں اردو زبان و ادب کی صورتِ حال کا تنقیدی جائزہ بڑی عرق ریزی سے لیا گیا ہے۔ اس میں مؤلف نے جامع کشمیر کی تاریخی حیثیت کے ساتھ ساتھ اس

کے گردونواح کے ماحول کی بھی منظر کشی کی ہے۔اس میں نہ صرف جامع کشمیر کا تعارف مکمل طور پر پیش کیا ہے بلکہ اس کے قیام کی اہمیت بھی اُجاگر کی ہے۔کتاب میں تحقیقی مقالات کی فہرست بڑے ہی قرینے سے دی گئی ہے۔ جو کہ (ایم ،فل اور پی ،ایچ ،ڈی) کے ہیں۔ شخصیات کے زمرے میں آنے والے مقالاجات کی فہرست پہلے دی گئی ہے۔اس کے بعد اردو شعر وادب کے مختلف اصناف پر مقالوں کی فہرست دی گئی ہے۔جن میں غزل، نظم، رباعی، قصیدہ، مثنوی، مرثیہ نگاری، افسانہ، ناول اور ڈراما سے متعلق مقالوں پر نہ صرف سیر حاصل بحث ومباحثہ موجود ہے بلکہ ایک بسیط اشاریہ بھی دیا گیا ہے۔

مذکورہ کتاب اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے جو کشمیر یونیورسٹی کی اردو ادبی خدمات پر قلم بند کی گئی ہے۔ جو کہ تاریخی اعتبار سے بھی اہمیت کا حامل ہے۔مؤلف کی یہ کامیاب سعی قابلِ دید بھی ہے اور قابلِ داد بھی۔

............○○............

اس شمارے کے شرکاء

1	ظفر محمد اقبال	Tajran-e-Kutub,Mahraj Ganj, Srinagar Kashmir 190002
2	اسد اللہ اسد	Booru,Chadoora,Budgam,Kashmir Mob:No 9906774117
3	جان محمد آزاد	Upper Soura, Buchpora,Srinagar J & K 190011 Mob:No 9622681428
4	محمد یوسف ٹینگ	Old Airport Road, Hakeem Bagh, Rawal Pora, Srinagar Kashmir Mob:No 9419761644
5	غلام نبی آتش	Nanil Anantnag Kashmir. Mob:No 9906787121
6	ظریف احمد ظریف	Badshahi Darwaza, Makhdoom Sahab Srinagar.
7	شوکت حسین کینگ	Natipora Srinagar Kashmir Mob:No 9419025524
8	جوہر قدوسی	Gulshan Nagar-B Nowgam Bye pass Srinagar, Kashmir Mob:No 9419403126
9	مرزا بشیر احمد شاکر	Shehjar Colony, Mandibal Nowshahra, Srinagar Kmr 190011 Mob:No 9419674210
10	رشید کانسپوری	Kanispora, Baramulla Kashmir 193101 Mob: 9596278211
11	رفیق راز	I.G Road Bagat-e-Barzala, Srinagar Kashmir Mob:No 9622661666
12	ہمدم کاشمیری	Near Gurudwara, Barzalla, Srinagar. Kmr Mob:No 8899487710
13	احمد محفوظ	B-14, Mujeeb Bagh, Jamia Nagar, New Delhi 110025
14	شفق سوپوری	101,Sabzan.Gogo Humhama, New Airport Road, Srinagar Kmr 190014 Mob:No 7006828727 Email:drshafaqsopori333@gmail.com
15	کمال جنیتوی	Village & Post Office Janeta via Chandusi Distt: Sambhal U.P, Pin 244412
16	نثار جیراجپوری	67,Jalandhari, Azamgarh U.P 276001
17	راشد طراز	H.O.D Urdu, D.J College Monger Bihar

18	مجیب شہزر	159/9 Tandon para ,Kankar Street , Aligarh U.P 202001
19	ساغر صحرائی	Mohallah Ulfat Nagar Haweli Bhaderwah Jammu Mob:No 9858235234
20	صاحبہ شہریار	P,18 Andrews Gunj Extension ,New Delhi 110049 Mob:No 09868883743
21	اطہر بشیر	Kirmani Colony, Baramulla, Kashmir Mob:No 9103730123
22	راشف عزمی	Nowgam, Bye pass, Srinagar, Kashmir
23	کرشن کمار طور	134/E, Khanayara Road Dharmshalla -15 H.P
24	ایاز رسول نازکی	7/10 Hari parbat Lane Sidra , Jammu 180001 Mob 9419061043 Email: majroohrashid@gmail.com
25	توصیف تابش	Iqbal Colony Bhaderwah Near College Road Tehsil:- Bhaderwah Disst. Doda Pin J&K 182222 Mob:No 9797317919
26	بلراج بخشی	13/3 Aadarsh Colony, Udhampur Jammu182101 Mob:9419339303
27	ناوک حمزہ پوری	Hamzapor P/o Sherghati Distt: Gaya Bihar 824211
28	طہور منصوری نگاہ	Ekta Enterprises Badi Dargah ,Amhaiya Rewa 486005
29	عائشہ مستور	Near Java Complex Kursoo Rajbagh Srinagar 190001
30	پروین راجہ	Baraan Pather, Batamaloo Srinagar Kashmir Mob 9469447965
31	عفت زرین	543 Gali Hakeem ji Chordi Dallaan Jamia Masjid Delhi 110006 Mob:9810691712
32	تنویر طاہر	H,No.53 Gasiyar Chowk, Near Gasiyar Masjid, Hawal Srinagar Kmr 190011 Mob: 7006804841
32	شبیر احمد شبیر	Dangiwach, Rafiabad Baramulla Kashmir Mob: 9682571449
34	شہناز رشید	Noor Bagh Nowpora Sopore Disst: Baramulla 193201 (J&K) 9419400872 Email: shahnazrasheed88@gmail.com

35	نذیر آزاد	Zaffran Colony, Sempora Pampore, Pulwama Kashmir Mob: 9419030720
36	مکھن لال پنڈتا	House no. 180 Sector -1 Druga Nagar Jammu 180013 Mob: 9797415858
37	سید مبشر رفاعی	Radio Colony, Wana Bal Rawalpora Srinagar Kashmir 190005 Mob: 9419015306 Email:syedmmubashir@gmail.com
38	شاداب ارشد	P.G Deptt Of Persian, University Of Kashmir Hazratbal Sgr Mob: 7006956189
39	عبدالصمد	212 -A Rajni Ghandha, Sadaqat Ashram Patna, Bihar 800010
40	ذکیہ مشہدی	F-1,Grand Pallavi Court Judges, Court Road Patna Bihar 800004 Mob: 09939263613
41	خالد حسین	Bathinde, Jammu, Near Govt. School 181152 Mob: 94191833485 hussain-khalid47@gmail.com
42	نور شاہ	14-LD Colony, Goripora, Link Road Rawalpora Srinagar 190015 Mob: 8899637012
43	امیر حمزہ	L-11 Second Floor, Haji Colony, Haffar Manzil, Jamia Nagar New Dehli 110025 Mob: 9990018577
44	ناظم نذیر	Editor "Tameel Irshad" Press Enclave Pratab Park Srinagar 190006 Mob:7780883104
45	سہیل سالم	Rainawari Srinagar Kashmir 190003 8899037492
46	گلزار احمد وانی	Tengpuna, Pulwama Kashmir 193201 Mob: 7006057853

مرحوم نور محمد
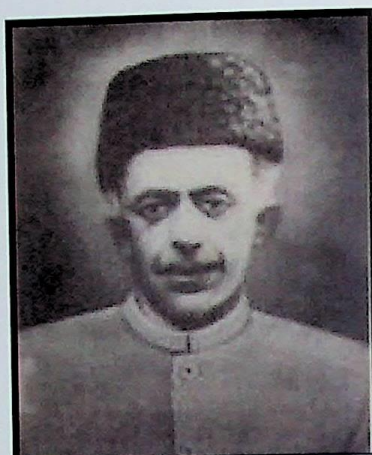
غلام محمد نور محمد تاجرانِ کُتب
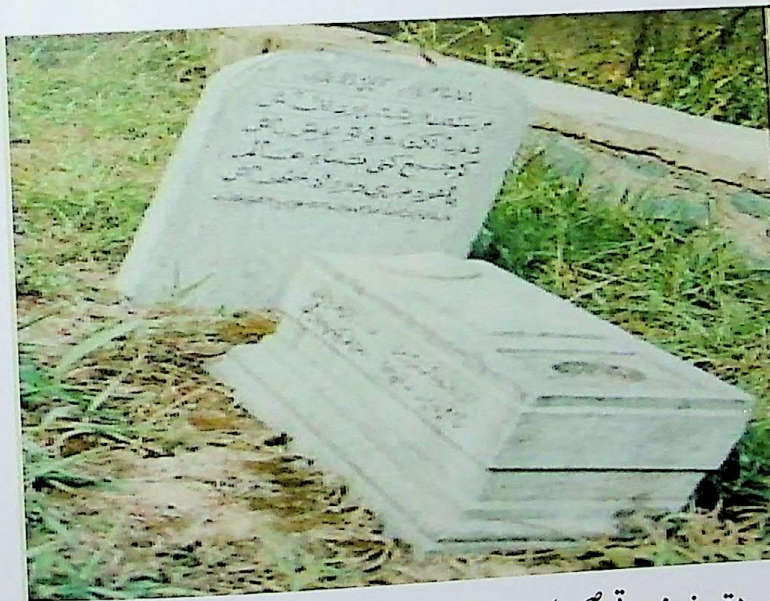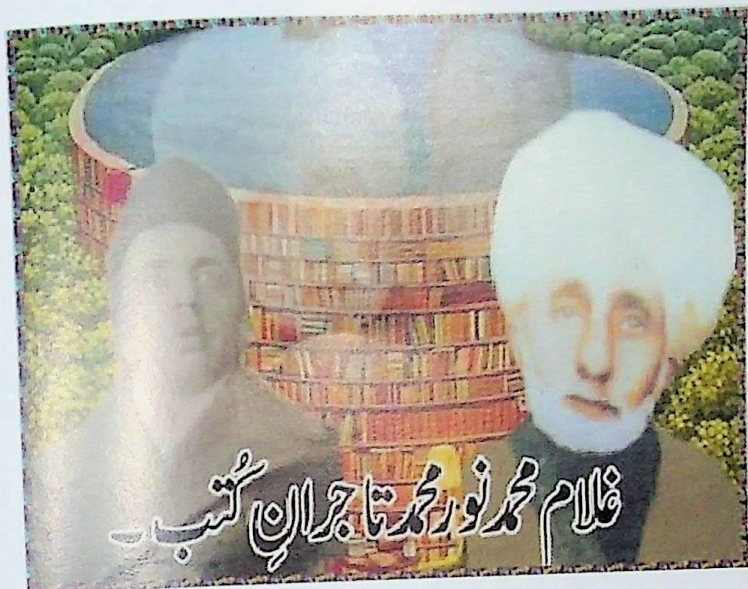
مقبرہ نور محمد واقع صحن پاک زیارتِ پیر حاجی محمد صاحب صراف کدل سری نگر
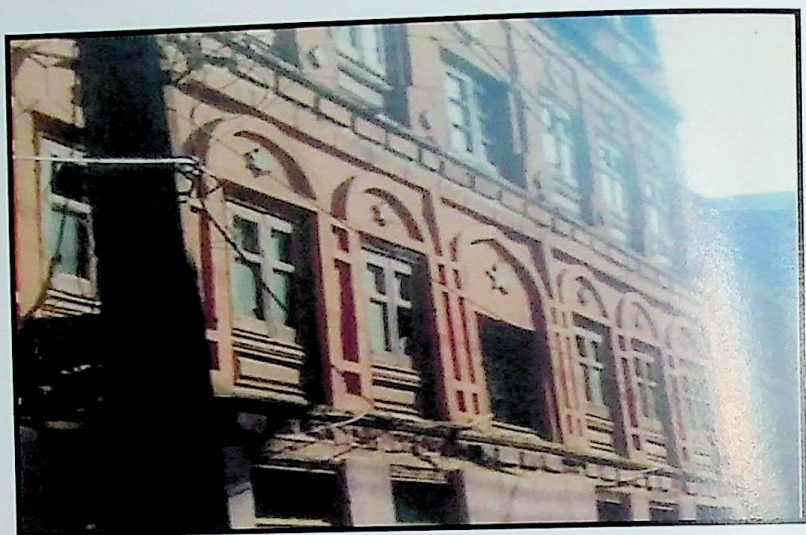
نور محمد کا آبائی مکان واقع پاندان نوہٹہ سری نگر
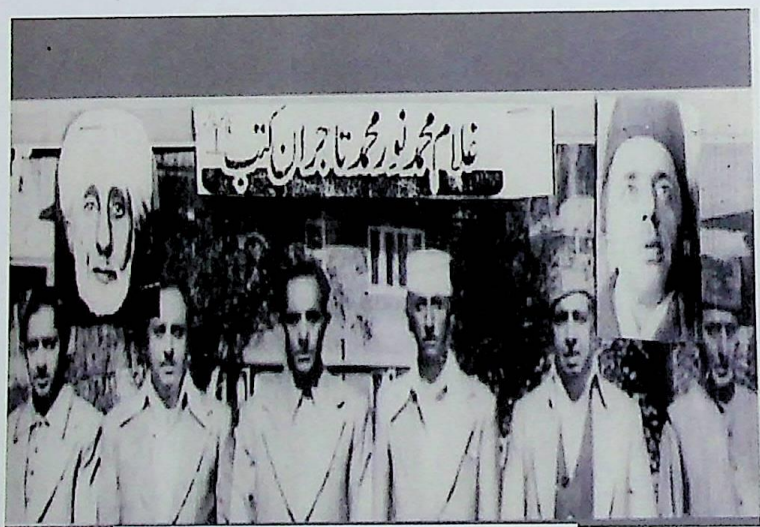
فرزندانِ غلام محمد تاجرانِ کتب

نور محمد، اپنے برادران، دوستوں اور ملازمین کے ہمراہ اپنے آبائی مکان پاندان نوہٹہ سری نگر میں

ولا یاتونك بمثل الا جئنك بالحق واحسن تفسیرا

کاشُر ترجمہ

قرآنِ مجید

جزء سوم

پارۂ تلک الرُسُل

مترجمہ

مولوی احمد شاہ صاحب جامعی - ایم - اے عربک، بی ٹی
ریٹائیرڈ پروفیسر ایس - پی کالج وغیرہ سرینگر

بحُسن سعی

غلام محمد نور محمد تاجران کتب مہاراج بزیر گنج بازار سرینگر کشمیر

بماہ ذی الحجہ سنہ ۱۳۸۱ طبع گردید

اس کتاب میں باقی مضامین کے علاوہ غزلیات ملا حبیب اللہ نوشہری و خواجہ اکبر الدین صاحب امیر درج ہیں۔

راقم :- پیر حسام الدین مخدومی - خانیاری

این ست کہ دل بردہ و خونکردہ بسی را
بسم اللہ اگر تابِ نظر ہست کسی را

الحمد للہ والمنہ کہ اندرین زمان میمنت اقتران قصہ عجیبہ و غریبہ

موسوم بہ

خنجرِ عشق کشمیری

جس کو

شاعر بیمثال شیرین مقال حاجی محمد الیاس صاحب منتظمِ زیارت بقعہ چرار شریف نے
ایک اردو ناول سے بکمالِ عرق ریزی و جانفشانی کشمیری زبان میں منظوم فرمایا

بعد از اخذ جملہ حقوق دائمی

غلام محمد نور محمد تاجرانِ کتب و مالکانِ مسلم بک ایجنسی

مہاراج زنبیر گنجبازار سرینگر کشمیر نے

سنہ [illegible] ہجری میں

در مطبع رفاہ عام پریس لاہور چھپوا کر شایع کیا

راقم :- پیر حسام الدین مخدومی ریتہ یاری

چھاپ غلام محمد نور محمد

۷۸۶

اِنَّ اللّٰہَ وَمَلٰٓئِکَتَہٗ یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ
یٰٓاَیُّہَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَیْہِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا

گلشن نعت کلاں

بزبان کشمیری

چوالیس چیدہ چیدہ موثر نعتوں کا مجموعہ

حصہ اول

جانان من بادہ اندایت
کرابو ڈیشے شکس مو نودون
خون دل کو تا بو ملے
بو آسے بیٹھوا برو
نکی قمر تہ مدنی شمسہ
لول چانوی آو دانہ
سوز دلکی لوز
نیس بکن ہے
باداو ہو انگت
صدا بوزم گدا آسے
دوان چھوس نالہ

ما بریم نفس امارہ
اے باد صبا گژھ صتہ
روز وداے باد صبا
خوشبوی وا و ژ
عمو داد و کرس ابتر
عربی باشا ما مدنی ساہ
گو جہان تازہ بر خسار
بو درد دل کرے
دہ مہلت اے اجل
پتہ لاے وتہ گالے
سائلانہ آس بردر

ژہ کر غم دفا یا میاہ النبی
ژہ کیاہ ا کیہ رخ ہو دن چھ
یا حبیب خدا د پان
از مدینہ سو شہریار
یا حبیب الالٰہ
وقت خلاصی
وقت آن شدکہ
احمد مرسل ظل رحمانی
چھو بلنگ از دوان
مہربان گژھ صہ کرم کر
بحمد اللہ چھوم

رخ چانو رحمت
خدا عاشق چھو
چھو بس گنہگار
اشہد اللہ تجلی انوار
مہربان گژھتہ بن
گوشن بر تو
مرتبہ بڈ چھوک شاہ
عربکہ سردار چھکہ
بہار غلہ چھوے
دل وجانم ہدایت
عربکہ سردار چھوی

کیاہ میانو جانان
لکس ٹاٹھس مدنی
نورک گاہ چھی سنگرمالن
صلوات سوز دی
جھو ہیم دلدار و دلبر
چھو شکل و صورت
حضرت نیس لگوے
ژہ چھوک دل تہ
دل دار میانوی
دین و دنیا کو ہی نش
کرد و رسمانی در دغم

حسب فرمائش

غلام محمد نور محمد تاجران کتب مہاراج گنج بازار سرینگر کشمیر

(شاخ) مائسمہ بازار امیرا کدل سرینگر کشمیر

سنہ ۱۹۲۲ء میں نور محمد نے اسی کتاب سے اپنی اشاعت کتب کا آغاز کیا تھا۔ جس کتاب کی اشاعت آج تک برابر جاری ہے۔

بیا ای عشق پر افسون و نیرنگ
کہ باشد کار تو گہ صلح و گہ جنگ

الحمد للہ والمنۃ کہ اندرین زمان مسرت اقتران سعادت نشان کتاب
سعادت افزای شکریان یعنی

شیرین و خسرو کلان

بزبان کشمیری

از تصنیف لطیف سخندان فصیح البیان عذب اللسان عندلیب
خوش بیان شاعر لاثانی واقف رموز نکتہ دانی یعنی محمد اسمٰعیل نامی

حسب فرمایش

غلام محمد نور محمد تاجران کتب مہاراج گنج بازار
سرینگر کشمیر

در مطبع دین محمدی باہتمام ملک [illegible] طبع گردید

ولا تقولوا لمن یقتل فی سبیل اللہ اموات بل احیاء

کتاب ہذا موسوم بہ

روضۃ الشہداء کلان

یعنی

جنگ نامۂ کربلا کلان بزبانِ کشمیری

از ابتدای حضرتِ آدم علیہ لغایت سید الشہداء شہیدِ کربلا و عقوبت قاتلانِ امام حسین رض

من تصنیفِ

شاعرِ نامی گرامی پیر عزیز اللہ صاحب حقانی غفر اللہ لہ

مصنفہ { ممتاز بے نظیر۔ تاریخ عالم۔ چندر بدن۔ جوہر عشق۔ قصہ دشتان۔ گلدستۂ بے نظیر۔ قصۂ شہر شب۔ نعت و مناقب وغیرہ وغیرہ۔

حسبِ فرمائش

غلام محمد نور محمد تاجرانِ کتب

مہاراج گنج بازار سرینگر کشمیر

شاخ، امانیہ بازار امیرا کدل سرینگر و زینہ کدل و امیرا کدل سرینگر

لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ

مِمَّا قَلَّ مِنْهُ أَوْ كَثُرَ ۚ نَصِيبًا مَّفْرُوضًا

خواہ وہ مال متروکہ کم ہے یا زیادہ۔ حصص تو مقرر ہیں

(القرآن۔ سورۂ نساء)

کاشِر مارہ باگے

یعنی مشہور و معروف اور معتبر و مستند کتاب سراجیہ فی المیراث کے ضروری مضامین
اور اسکے مفید حواشی کا منظوم ترجمۂ کشمیری۔ جس کے ذریعہ ہر ایک کشمیری بولنے اور
سمجھنے والا فہیم آدمی تمام مسائل ترکۂ اسلامیہ کو خود بخود حل کر سکتا ہے

﴿مع رسالۂ "قواعد تقسیم وراثت" بزبان اردو﴾

مُصَنّفہٗ

مولوی نور الدین قاری

اول مدرس عربی سٹیٹ ہائی سکول سرینگر

مُصنّفِ۔ کاشر مسلکتاب۔ کاشر بانت سُعاد۔ قاعدۂ نورانی المنطق
ضروریات دین۔ منظوم رسالۂ نماز۔ قواعد الصرف والنحو۔ رسالۂ رسم الحرف
نور المبین۔ مرقاۃ الادب۔ جامعُ الدعوات۔ آئینۂ صداقت۔ وغیرہ

بار دوم تصحیح تام

در سنہ ١٣٤٤ھ / ١٩٢٦ء

باہتمام در مطبع کریمی پریس لاہور طبع شد

(قیمت فی جلد ۶ ۔ علاوہ محصولڈاک)

راقم: پیر حسام الدین نعیمی بخاری

نہ برباد رفتی سحرگاہ و شام | سر بر سلیمان علیہ السلام

الحمد للہ والمنۃ کہ درین آوان سعادت اقتران نسخہ

قصۂ شاہ مشدود

بزبان کشمیری

تصنیف مولوی علی بابا صاحب ساکن موضع

در سنہ ۱۳۴۸

حسب فرمائش تاجرانِ نامی غلام محمد و نور محمد مہاراج گنج بازار سرینگر

در مطبع رفاہ عام ... لاہور ...

چھاپ غلام محمد نور محمد

الحمد للہ والمنۃ

کہ اندرین زمان میمنت اقتران

قصۂ عجیبہ

گربہ و موش

من تصنیف

پیر محمد بہاء الدین صاحب نقشبندی لاروی سلمہ اللہ

حسبِ فرمایش

غلام محمد و نور محمد حنفی کشمیری تاجران کتب و مالکانِ مسلم بک ایجنسی

مہاراج زمیر گنجبازار سرینگر کشمیر

در سال سنہ ۱۳۴۷ھ

در مطبع رفیق عام پریس لاہور میں بحسنِ اہتمام منشی عزیز الدین ... چھپی

راقم :- پیر حسام الدین مخدومی خانیاری

حمد بابل جو بعجز شعر حقانی فہم خاندان و بہر اہل پٹان

شکر و سپاس ایزد کارساز کہ

نسخۂ بینظیر و کتاب لاجواب شعر شاعر نامدار جادو تقریر مقبول ہر برنا و پیر

قصۂ ممتاز بینظیر

حصۂ ششم {معروف بہ در جشن خاتمہ}

جشن شادی ملکۂ بینظیر

من تصنیف لطیف

شاعر نامی و گرامی واقف رموز سخندانی جناب پیر عزیز اللہ صاحب حقانی

مصنف تاریخ عالم و کتب متعددہ کشمیری

جس کو

اس خاندان کے قدیمی خدام

مالکان دار الکتب الاسلامیہ

عمدۂ محمد نور محمد تاجران کتب و مالکان مسلم العباسی کتاب اسلامیہ و آگہت کتاب مہاراج گنج بازار سرینگر کشمیر نے

مصنف سے ترمیم در ترمیم کرا کر بال

سنہ ۱۳۴۷ھ

در مطبع رفاہ عام پریس لاہور بحلیۂ طبع آراستہ کیا

رقم :- پیر حسام الدین مخدومی خانیاری

سید الشہدا امیر حمزہ عم مصطفیٰ

جنگ نامہ حضرت امیر حمزہ

چھٹا حصہ ساتواں حصہ آٹھواں حصہ

من تصنیف

پیر غلام محمد صاحب مرحوم متخلص بہ حنفی ۔ سوپور کشمیر

مصنف

باغ و بہار ۔ الف لیلا ۔ آرائش محفل ۔ خلافت نامہ

حسب فرمائش

غلام محمد نور محمد تاجرانِ کتب مہاراج گنج بازار

سرینگر کشمیر در سنہ ۱۲۷۳ طبع گردید

ISSN 2277-

Urdu SHEERAZA

Volume:57 No:7-9

Chief Editor:
M.Ashraf Tak

Printed at Government Press, Srinagar.